# فہرست


پیش لفظ

پہلا باب :

عالمی تناظر میں عورت کا مقام

دوسرا باب :

ہندوستانی سماج میں عورت کا مقام

تیسرا باب :

ہندوستان کے مختلف مذاہب میں عورت کا مقام

چوتھا باب :

اردو ناولوں میں خواتین کے عمومی مسائل کا تنقیدی مطالعہ

پانچواں باب :

اردو ناولوں میں ملازمت پیشہ خواتین کے مسائل کا تنقیدی مطالعہ

مجموعی جائزہ

کتابیات

# پیش لفظ

میں بارگاہ رب العزت میں انتہائی عجز و انکساری کے ساتھ ہدیہ تشکر پیش کرتی ہوں ،جس کی عنایتوں ونوازشوں سے میرا مقالہ تکمیل کو پہنچا۔

دور حاضر معاشی کشاکش کا دور ہے جہاں اعلیٰ معیار زندگی کی تکمیل کے لئے مرد اور عورت دونوں کا ملازمت اختیار کرنا ضروری ہو گیا ہے۔عورت کے ملازمت اختیار کرنے سے اس کی ذمہ داریاں دہری ہوجاتی ہیں۔جس کی وجہ سے اسے بے شمار مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ان مسائل کی یکسوئی کے لئے ہمارے ادیبوں نے نثری ادب کو خاص طور پر فکشن کو ذریعہ اظہار بنایا اور خواتین کے کئی مسائل کو پیش کر کے ان کے حل کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔اردو ناول نگاروں نے خواتین کے جن مسائل کو اپنی تخلیقات میں پیش کیا ان میں بچپن کی شادی' بیوہ کی شادی' بے جوڑ شادی' غریبی و مفلسی' مجبوری ولا چاری' جنسی استحصال اور طوائفوں کے مسائل خصوصیت سے اہمیت رکھتے ہیں ۔یہ تو خواتین کے عام مسائل تھے جن پر تقریباً ہر ادیب نے روشنی ڈالی لیکن عورت کو ملازمت اختیار کرنے کے بعد بعض ایسے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے جن سے چھٹکارا پانا ہندوستانی معاشرہ میں تقریباً نہ ممکن ہے۔اردوناول نگاروں نے ملازمت پیشہ خواتین کے ضمن میں ایسے ہی بے شمار مسائل کی عکاسی بڑی عمدگی سے کی ہے۔

میں نے اپنی پی ایچ ڈی کا موضوع ابتدا میں ''تلنگانہ میں اردو ذریعہ تعلیم کے مسائل'' کے عنوان سے منتخب کیا تھا۔لیکن اردو اداروں اور مدرسوں میں مواد کی تلاش کے دوران مجھے لوگوں کی تنگ نظری اور تعصب کا سامنا کرنا پڑا۔کیوں کہ اس وقت ریاست تلنگانہ کی علیحدگی کی تحریک زوروں پر تھی جس کی وجہ سے مواد کی فراہمی میں کافی دقت پیش رہی تھی ۔یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنی نگراں اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر مظفر علی شہ میری صاحب سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا تو انھوں نے مجھے ''اردو ناولوں میں ملازمت پیشہ خواتین کے مسائل'' کے موضوع پر کام کرنے کا مشورہ دیا۔ میں نے ایم فل میں ''اردو ناولوں میں حیدرآباد کے تہذیبی عناصر 1960ء کے بعد'' کے عنوان سے کام کیا تھا۔اس لئے اس موضوع پر کام کرنے مجھے خوشی محسوس ہوئی ۔اس طرح میری نگراں اور صدر شعبہ اردو اور دیگر اساتذہ کی منظوری کے بعد میرا موضوع ''اردو ناولوں میں ملازمت پیشہ خواتین کے مسائل'' منتخب ہوا۔میں نے اپنے مقالہ کو جملہ پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا باب ''عالمی تناظر میں عورت کا مقام'' کے عنوان کے تحت ہے اس باب میں عالمی تناظر میں عورت کا جو مقام و مرتبہ رہا ہے۔اس کی وضاحت کی گئی ہے۔اس باب میں مفکرین مثلاً افلاطون، ارسطو، روسو، جان لوئس، ارتھر، شوپنہار اور مولانا روم وغیرہ نے سماجی و مملکتی نظام میں عورت کی حیثیت و مقام کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔

دوسرا باب ''ہندوستانی سماج میں عورت کا مقام'' رکھا گیا ہے۔اس لیے اس باب میں ہندوستانی سماج میں ابتدا ہی سے عورت کی کیا حیثیت رہی ہے اس پر منوسمرتی کے نظریات کے علاوہ ہندوستان کے مختلف دانشوروں ورہنماؤں کے حوالے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسرا باب ''ہندوستان کے مختلف مذاہب میں عورت کا مقام'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں مختلف مذاہب کی مقدس کتابوں کے حوالے سے عورت کے مقام و مرتبہ پر روشنی ڈالی گئی ہے چوں کہ ہندوستان مختلف مذاہب کا گہوارہ ہے۔ اس لئے مختلف مذاہب کے مذہبی امور،عقائد،رسوم اور مقدس کتابوں کے حوالے سے عورت کے مقام و مرتبہ کی وضاحت کی گئی ہے۔ ہندو مذہب میں چار ویدوں کے علاوہ اپنشد' دھرم شاستر' رامائن' مہابھارت جیسی مذہبی تصانیف کے حوالے دیے گئے ہیں۔ ہندو مذہب کے علاوہ عیسائیوں کی مذہبی کتاب ''انجیل'' اوران کے پیشوایا پادریوں کے خیالات اور مذہب اسلام کی مقدس کتاب ''قرآن مجید'' وحدیث کی روشنی میں عورت اور مرد کے حقوق کی وضاحت پیش کی گئی ہے علاوہ ازیں بدھ مت' جین مت اور پارسی تعلیمات کی روشنی میں عورت کے مقام و مرتبہ کی عکاسی کی گئی ہے۔

چوتھا باب ''اردو ناولوں میں خواتین کے عمومی مسائل کا تنقیدی مطالعہ'' کے عنوان کے تحت ہے۔ اس باب میں اردو ناول نگاروں نے اپنی تخلیقات میں نسوانی کرداروں کے جن عمومی مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ان کا اختصار کے ساتھ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اردو ادب میں ڈپٹی نذیر احمد' مرزا ہادی رسوا' پریم چند' کرشن چندر' نذر سجاد حیدر' خدیجہ مستور' بانو قدسیہ اور' جیلانی بانو وغیرہ نے نسوانی کرداروں کے ذریعہ خواتین کے مختلف مسائل خصوصاً عورتوں کی مظلومیت اور اس کے استحصال کے خلاف قلم اٹھایا ہے اور ان مسائل کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔اس باب میں ان مسائل کا جائزہ لیا گیا ہے تا کہ خواتین کے عمومی مسائل ہمارے سامنے آجائے۔

پانچواں باب ''اردو ناولوں میں ملازمت پیشہ خواتین کے مسائل کا تنقیدی مطالعہ'' رکھا گیا ہے۔ یہ مقالے کا اہم باب ہے اس باب میں جن ادیبوں نے ملازمت پیشہ خواتین کے مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔

ان کے ناولوں کا انتخاب کر کے ان مسائل کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا گیا ہے اس باب میں ملازمت اختیار کرنے سے لے کر دوران ملازمت خواتین کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ جس صورت حال سے دوچار ہوتی ہیں ۔اس کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے ۔اس باب میں اردو کے ابتدائی ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کے نظریات سے عہد حاضر تک کے اہم ناول نگاروں کی تخلیقات سے مثالیں پیش کی گئی ہیں ۔خصوصاً ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، مرزا ہادی رسوا، اور پریم چند کے نسوانی کرداروں میں ملازمت کرنے کی وجوہات کے علاوہ عصر حاضر کے ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر، صالحہ عابد حسین، بانو قدسیہ، رفعیہ منظور الامین، غضنفر علی غضنفر اور صادقہ نواب کے ناولوں میں ملازمت پیشہ خواتین کے ساتھ استحصال اور ناانصافی و نابرابری کے سلوک کے علاوہ دیگر مسائل کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

آخر میں ''مجموعی جائزہ'' ہے جس میں جملہ ابواب کا اختصار سے جائزہ لیا گیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہمارے معاشرہ میں آج بھی عورت کی حیثیت وہی ہے جو زمانۂ قدیم میں تھی ۔فرق اتنا ہے کہ عورت ، زندگی کی دوڑ میں مرد سے پیچھے نہیں ہے لیکن اس کے حقوق کی جہاں بات ہوتی ہے وہاں پھر وہی مسئلہ درپیش آتا ہے عورت ہونے کا یعنی صنف نازک کا یا صنف کمزور کا۔ ہندوستان میں عورت چاہے وہ تعلیم کے میدان میں اعلیٰ مقام حاصل کر چکی ہو یا ترقی کی منزلوں سے ہمکنار ہو چکی ہو۔ وہ آج بھی ملازمت اختیار کرنے کے بعد استحصال کا شکار ہوتی ہے۔ اسے مردوں کے شانہ بہ شانہ چلنے کی اجازت تو ملتی ہے لیکن پھر بھی وہ ظلم و استبداد کا شکار رہتی ہے ۔اردو ناول نگاروں نے عورتوں کے انہیں مسائل کے ذریعہ ان کی یکسوئی کی طرف ہمیں توجہ دلائی ہے۔ ان کو یہاں اختصار سے پیش کرتے ہوئے اس مقالے کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔

شکر یہ کے فرائض میں سب سے پہلے میں اپنی استاذی محترمہ ڈاکٹر عرشیہ جبین صاحبہ کا شکر یہ ادا کرتی ہوں۔جنھوں نے دوران تحقیق ہر ممکن مدد فرمائی اور ناقدانہ رہنمائی کی۔دوران تحقیق کچھ حالات ایسے پیش آئے جہاں میری ہمت اور حوصلہ ٹوٹ چکا تھا لیکن میری نگراں نے مجھے نہ صرف حوصلہ دیا بلکہ مقالہ تکمیل کو پہنچانے کی طرف راغب کیا۔ میں ان کی عنایتوں اور شفقتوں کے لیے ہمیشہ ممنون ومشکور رہوں گی۔

میں صدر شعبہ اردو پروفیسر مظفر علی شہ میری صاحب کی بے حد ممنون ومشکور ہوں جنھوں نے اپنی دانشورانہ فکر سے مجھے اس عنوان پر تحقیق کرنے کا مشورہ دیا اور وقتاً فوقتاً میری رہنمائی کی۔میں ان کے خلوص وشفقت کے لیے ان کی شکر گزار ہوں۔

میں پروفیسر بیگ احساس صاحب کی بھی مشکور ہوں جن کے مفید مشورے میرے ساتھ رہے۔ میں پروفیسر رضوانہ معین صاحبہ کی تہہ دل سے مشکور ہوں،جن کی محبت وخلوص اور شفقت مجھ میں تحقیق کے تئیں دلچسپی پیدا کی۔میں شعبہ کے دیگر اساتذہ ڈاکٹر حبیب نثار صاحب، ڈاکٹر اے۔آر منظر صاحب ،ڈاکٹر محمد کاشف صاحب اور ڈاکٹر نشاط احمد صاحب کی دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں،جن کا خلوص میرے ساتھ رہا۔

اساتذہ کے بعد میں اس ہستی کا شکر یہ ادا کرتی ہوں جن کے تعاون کے بغیر میں گھریلو ذمہ داریوں اور تعلیمی مصروفیات دونوں کو نبھانے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو پاتی ،یعنی میرے رفیق حیات جناب سید لائق علی پٹیل صاحب کی حوصلہ افزائی اور تعاون کے لیے میں ان کی تاحیات شکر گزار رہوں گی۔

میں اس موقع پر اپنی مرحوم دادی ماں کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔جنھوں نے کبھی میری ماں کی کمی محسوس ہونے نہیں دی۔آج میں اس مقام پر ہوں تو صرف ان ہی کی بدولت ہوں۔میں اپنے والد مرحوم

جناب جمیل احمد صاحب، اپنی پھوپھیاں: نجم رحمٰن، قمر رحمٰن اور خورشید انور ادیب کو یاد کئے بنا نہیں رہ سکتی۔ جن کی شفقت و محبت اور دعائیں ہمیشہ میرے ساتھ رہیں۔ میرے بھائی زبیر اسمعیل، بہنوں میں امام جویریہ، سعدیہ بیگم کی ممنون ہوں۔ جن کا ساتھ میرے لیے آب حیات ہے۔

میں اپنے بچوں سید مدثر علی، سیدہ جاثیہ امام (حافظ و مفسر قرآن مجید) اور سید لقمان علی کے لئے دعا گو ہوں جن کی فرماں برداری تعلیم کے تئیں انہاک و سنجیدگی اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس نے مجھے یہ موقع دیا کہ ان کی پرورش کے ساتھ ساتھ یہ مقالہ پائے تکمیل کو پہونچا سکوں۔

میں اپنی ساتھیوں خصوصاً فریدہ تبسم، واجدہ بیگم، وسیم حسن راجا اور ناہدہ سلطانہ کے دوستانہ تعاون و خلوص کے لئے ان کی شکر گزار ہوں۔ آخر میں میں اس مقالہ کے کمپوزر جناب کلیم الدین اور ان کے والد جناب محی الدین صاحب کے علاوہ میرے ساتھی عبد المغنی کی بھی ممنون ہوں جنہوں نے مقالہ کی کمپوزنگ میں مدد فرمائی۔

شکریہ

فاریہ امام

2015

# پہلا باب

## عالمی تناظر میں عورت کا مرتبہ

# عالمی تناظر میں عورت کا مقام

جب سے انسانی سماجی زندگی کا آغاز ہوا' انسان مملکت کی ماتحتی میں رہنے کا عادی ہو گیا اور سماج کی تشکیل بھی انسانوں کے اجتماعی عمل سے ہوئی۔ جس میں عورت اور مرد دونوں برابر کے شریک رہے۔ صرف سماج ہی نہیں بلکہ نسل انسانی کے فروغ اور تہذیب وتمدن کی ترقی کا انحصار بھی مرد اور عورت کے باہمی تعاون اور مشترکہ عمل سے فروغ پذیر ہوا۔ افلاطون جو کہ یونان کا بڑا سیاسی مفکر کہلاتا ہے اپنی شاہکار تصنیف ''ریاست'' میں سماج کے متعلق لکھتا ہے:

''ریاست سے مراد عام سیاسی دستور ہے۔ دستور سے
مراد وہ نظام ہے جس سے افراد مل جل کر سماج کی تشکیل
کرتے ہیں۔1؎''

عورت اور مرد کی باہمی کوششوں اور فرائض کی انجام دہی سے ہی سماجی دستور قائم ودائم ہے لیکن اس نظام کو ترقی کے مختلف ادوار میں ان کے باہمی عمل کے تناسب اور فرائض کی نوعیت میں تبدیلی بھی ہوتی رہی ہے۔ پھر بھی یہ امر مسلم ہے کہ نوع انسانی کی بقا کا دارومدار عورت ومرد کے وجود اور ان کے صحیح اور صحتمند اشتراک پر ہے۔ بابائے سیاست ارسطو کا عقیدہ ہے کہ :

''مملکت کے قیام کا خاص مقصد اچھی زندگی ہے۔
مملکت ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو بغیر ایک دوسرے
کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ مثلاً مرد اور عورت۔''2؎

انسانی زندگی کی ابتداء یعنی وہ دور جب انسان جنگلوں اور غاروں میں وحشیانہ زندگی بسر کر رہا تھا تب سے لے کر موجودہ ترقی یافتہ دور تک تہذیب وتمدن کی ترقی، کسی ایک جنس کی مرہون منت نہیں رہی بلکہ دونوں کی سعی ومحنت اور دونوں کے مساویانہ اشتراک وعمل کا نتیجہ رہی ہے۔اس حقیقت کے باوجود یہ ماننے سے انکار کیا جارہا ہے کہ تہذیب وتمدن کی تشکیل وارتقاء میں عورت بھی مرد کے برابر کی شریک رہی ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ماضی میں عورت کا جو فعال کردار رہا ہے۔اس کو بالکل فراموش کر دیا گیا ہے۔ ماضی میں کچھ ایسے عوامل وقوع پذیر ہوئے کہ عورت مکمل طور پر دوسرے درجہ کی مخلوق بن کر رکھ دیا گیا اور محکومیت اس کی زندگی بن گئی۔ مرد اپنی جسمانی قوت کی وجہ سے حاکمانہ رویہ اپنا کر عورتوں پر قابض ہوتا گیا۔اس سلسلے میں زبیر احمد صدیقی یوروپی مفکر ریکولس کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''مرد فطرتاً ایک خوفناک جانور تھا اور عورت اپنے فرض کی وجہ سے ماں تھی لیکن تمدن کی تاریخ کا یہ ایک حیرت انگیز اور افسوسناک راز ہے کہ جب تمدن نے ترقی کی تو متمدن قومیں اس کے ابتدائی حقیقی بانی کو حقیر اور ذلیل سمجھنے لگیں''۔3

تاریخ شاہد ہے کہ زمانۂ قدیم میں عورت کا وجود ایک شاندار وجود رہا ہے، وہ محکوم نہیں بلکہ حاکم کی حیثیت سے اپنی زندگی گذار رہی تھی، اسے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔اہم ترین نقوش اور کھنڈرات اس بات کے ثبوت پیش کر رہے ہیں کہ وہ دیوی بنا کر پوجی جاتی تھی۔تخلیق اس کے دم سے قرار دی گئی تھی اور تمام زندگی کا محور ومرکز عورت کی ہی ذات تھی۔ یہ نظام جو مادرسری' نظام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے 'اس نظام پر روشنی ڈالتے ہوئے ''زاہدہ حنا'' اپنی تصنیف ''زندگی کا زنداں'' میں لکھتی ہیں:

> ''اس نظام (مادرسری نظام) کے بارے میں لکھنے کا

> آغاز انیسویں صدی کے نصف آخر میں باخوفن نے اپنی
> کتاب ''مادری حق'' سے کیا، مارگن کی قدیم سماج اس کے
> بعد آئی۔ اس کے فوراً بعد یہ مارکس کا نفس ناطقہ اینگلز تھا۔
> جس نے خاندان ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز میں۔
> مادرسری سماج پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ یہ مادری سماج دس
> ہزار سے سات ہزار برس قبل مسیح تک اپنے عروج پر رہا''۔4

انیسویں صدی میں عورت اپنی صلاحیتوں اور ہنر مندیوں سے مختلف شعبۂ حیات جیسے بچوں کی پرورش، خوراک کا ذخیرہ اور لباس کی تیاری میں مرد کی مدد کرتی تھی، وہیں مرد بھی شکار کے علاوہ دوسرے شعبوں میں اس کا ساتھ دیتا تھا۔ خصوصاً زراعت کے نظام میں اس کی دلچسپی از حد بڑھ گئی اور وہ دھیرے دھیرے اس پر قابض ہوتا گیا اور مویشیوں اور زمینی پیداوار کو اس نے اپنی ملکیت بنالی۔

اس بارے میں ول دیوراں کا کہنا ہے کہ

> ''عورتوں کے سدھائے ہوئے جانور جب کھیتوں میں
> کام کرنے لگے اور وہ عورتوں کا نعم البدل ثابت ہوئے
> جواب تک خود کھیتوں میں کام کرتی تھیں تو مردوں نے
> انھیں بھی اپنے قبضہ میں لے لیا اور زراعت کے تمام امور پر
> قابض ہو گیا۔ کدال سے ہل کی طرف ترقی سے جسمانی
> قوت (کے استعمال) میں اضافہ ہوا اور مرد اس قابل ہو گیا
> کہ اپنی قوت کا دعویٰ کر سکے اس کے بعد مویشیوں اور زمینی
> پیداوار کو اس نے اپنی ملکیت ٹھہرایا۔5

مرد جب زمین کی پیداوار، زرعی آلات اور مویشیوں کا مالک بن گیا تو سماج میں عورت کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی، حصول روزگار کے اعتبار سے مرد کے مقابلے میں عورت کے خانہ داری کے کام، بچوں کی پیدائش، ان کی پرورش وغیرہ کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔

فریڈرک اینگلس کا کہنا ہے کہ: ''سماجی پیداوار'' کے دائرہ سے الگ کردیئے جانے کے بعد بیوی گھر کی پہلی خادمہ بنی''۔6ے

سماج میں جیسے جیسے زر' زمین' جائیداد کے لئے حق ملکیت کا تقاضہ شروع ہوا ویسے ہی عورتوں اور بچوں کی معاشی اقدار کا تعین کیا جانے لگا جسمیں عورت کی طبعی قوت کی کمی کی وجہہ سے اس کو گھر کے اندرونی امور پر مامور کر کے اسکو حق ملکیت سے محروم کر دیا گیا۔ عورت کی سماجی حیثیت اور اس کے مقام کو متعین کرنے کیلئے سماجی عالمی مفکرین نے اپنے بے حساب ارا سے نوازا۔ کہیں تو وہ محبت کا پیکر دنیا کی حسین شئے تھی تو کہیں نفرت کا بیج بونے والی بدروح تھی۔ عورت ماں کے روپ میں ہر دور میں قابل احترام رہی لیکن یہ صنف عورت بیوی' بیوہ' اور بیٹی کی شکل میں نا قابل احترام اور نا قابل قبول رہی۔

اس طرح دنیا میں باقاعدہ غلامی کے دور کے آغاز سے پہلے ہی عورت غلام بنادی گئی۔ بقول اگست بیبل۔

''Woman was a slane before the slave existed " 7ے

مادری سماج کے خاتمہ کے ساتھ ہی اکثر ممالک میں عورت گائے بیل کی طرح مرد کی ذاتی ملکیت بن کر رہی گئی۔ کبھی وہ لونڈیوں کے درجہ میں رکھی گئی تو کبھی بازاروں اور میلوں میں خریدی اور بیچی گئی۔ کبھی اسے مجسم گناہ اور بدی کا سرچشمہ سمجھا گیا تو کبھی زہریلی ناگن سے بھی بدتر سمجھا گیا۔ مشہور صحافی زاہدہ حنا اپنی تصنیف ''زندگی کا زنداں'' میں لکھتی ہیں:

''کنیزوں کو برسرعام بھیڑ بکریوں کی طرح بولی

لگاکرفروخت کر دیا جاتا تھا۔ سلاطین کو حرم سراؤں میں

سینکڑوں منتخب کنیزیں دی جاتی تھیں۔جن کی نگرانی پر بے

رحم خواجہ سرامامور تھے۔ بادشاہ اور امراء اپنے دوستوں کو

تحائف میں کنیزیں بھیجتے تھے''۔8ؔ

''اور بقول اینگلس کے ''مادری حق کا خاتمہ عورتوں کی ایک عالمگیر تاریخی شکست تھی''۔9ؔ

عورت ہر دور میں مظلوم اور حق وانصاف کی طلبگار رہی۔مردوں نے اس پر صدیوں تک جابرانہ تسلط قائم رکھا اور کسی بھی مرد کے سیاسی وسماجی حقوق سے محروم رکھنے کی ہر ممکن کوششیں کی گئیں۔اس کو صحیح معنوں میں انسانی درجہ بھی دینے کے لیے مرداساس سماج تیار نہ تھا۔بقول اگست بیل:

''بہت سارے ممالک میں اور مختلف ادوار میں اس

سوال پر سنجیدگی سے غور کیا گیا کہ آیا عورتیں بھی انسان

(Human being) ہیں یا نہیں اور کیا ان کے اندر

بھی روح ہے''۔10ؔ

مندرجہ بالا عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کو صرف ایک مادہ یا شئے کے علاوہ کوئی درجہ نہیں دیا جاتا تھا حتی کہ مردوں کو اسے انسان کے زمرے میں بھی رکھنا گوارا نہ تھا۔عورت کی مظلومیت اور بے بسی کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے اگست بسل کے حوالے سے ڈاکٹر محمد شہزاد شمس لکھتے ہیں:

''قدیم دور میں عورت کی حیثیت انتہائی درجہ کی استبداد

سے دوچار تھی۔اسے جسمانی طور پر مغلوب کر کے قبضے میں

رکھا جاتا تھا اور ذہنی طور پر اس سے بھی زیادہ ظلم روا

رکھا جاتا تھا۔ خانگی معاملات میں اس کی حیثیت نوکروں
سے صرف ایک درجہ بہتر تھی ۔اس کے اپنے بیٹے اس کے
آقا ہوتے تھے جن کی فرمانبرداری اس پر لازم تھی''۔ 11؂

اس طرح سماج میں عورت کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔اور خاندان کے اندر بھی اس کے تمام حقوق اس سے چھین لئے گئے اور اسے کمزور، جذباتی اور ناقص العقل سمجھا گیا۔

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جیسے جیسے تہذیب وتمدن ایک مکمل نظام العمل کی صورت اختیار کرتی گئی۔ ویسے ہی ویسے مختلف مما لک کے سماجی طور طریقے الگ الگ نوعیت اختیار کرتے گئے ۔ان میں عورتوں کے ساتھ اکثر و بیشتر محکومیت کا ہی سلوک کیا گیا۔عورت کی محکومیت کی داستانیں تقریباً ہر سماج میں یکساں ہی رہیں ہر چند کہ استحصال کا انداز الگ رہا۔خواہ وہ دنیا کا کوئی بھی ملک ہو مثلاً ہندوستان یونان ہو کہ شام، عرب، چین یا جاپان، غرض ہر ملک میں بہ حیثیت مجموعی عورت کو مرد کے مقابلے نچلا درجہ ہی دیا گیا۔ چنانچہ یہاں یہ ضروری معلوم ہوتا ہیکہ مختلف مما لک اور مختلف سماج میں عورت کی حیثیت کا سرسری جائزہ پیش کیا جائے تا کہ تاریخی تناظر میں عورت کی حیثیت کو بہتر طور سے سمجھا جاسکے۔اقوام عالم کی قدیم تہذیبوں میں یونانی قوم کی تہذیب کافی قدیم سمجھی جاتی ہے یونانی قوم تقریباً ہر علم وفن میں خوب نام کمایا۔دنیا کے مشہور ترین عالم اور نام ورترین فاضل اس سرزمین میں پیدا ہوئے۔تہذیب اور تمدن کے اعتبار سے یونانی دوسری قوموں سے بہت زیادہ بڑھے ہوئے تھے۔ یونان کی قدیم کتابوں میں افلاطون کی شاہکار تصنیف، ''ریاست'' کو بہت اونچا مقام حاصل ہے۔اس کتاب میں اس نے مثالی ریاست مملکت کا تصور پیش کیا۔ اسے محض سیاسی تصنیف نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے کہ اس میں جابجا بہت سے اخلاقی، فلسفیانہ، مذہبی، تعلیمی، نفسیاتی اور تاریخی نظریے بیان کے گئے ہیں اور ان سب کو ملا کر پوری زندگی کا نظام یا معیار عمل پیش کیا گیا ہے

چوں کہ زندگی کے نظام کو چلانے میں عورت کی حیثیت مساوی ہے' اسی لیے افلاطون نے اپنی تصنیف میں عورت کے حقوق متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ افلاطون کے زمانے میں عورتوں کو عزت حاصل نہیں تھی اور وہ چاہتا تھا کہ عورتوں کو سماج میں مساوی درجہ حاصل ہو' اسی لیے وہ اپنی تصنیف ''ریاست'' میں لکھتا ہے کہ

''عورتیں صرف جسمانی اعتبار سے مردوں سے کسی قدر
کمزور ہیں ورنہ ہر لحاظ سے مردوں کے ساوی ہیں اور ان
میں اور مردوں میں کوئی فرق نہیں اور وہ ان تمام خدمتوں کو
انجام دے سکتی ہیں''۔ 12؎

افلاطون دنیا کا پہلا شخص تھا' جس نے عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق کی بات کہی۔ اس نے تعلیم میں مردوں اور عورتوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی فرق نہیں رکھا اور دونوں کے لیے ایک ہی نصاب تعلیم تجویز کی تا کہ دونوں حصول تعلیم کے بعد سپاہی بن سکیں یا بہت زیادہ دانا ہونے کی صورت میں محافظ بن سکیں ۔ وہ کہتا ہے:

''............اگر عورتوں اور مردوں کے فرائض ایک ہیں
تو ان کی تعلیم اور پرورش بھی ایک سی ہونی چاہئے''۔ 13؎

افلاطونے عورت کو مردوں سے کچھ اور اونچا اٹھانے کی کوشش کی ہے وہ مردوں کو عورتوں کا محافظ گردانتا ہے۔ وہ کھلے الفاظ میں لکھتا ہے کہ:

''مردوں کی وہ حیثیت ہونی چاہیے جو گلہ میں محافظ و
نگراں کتوں کی ہوتی ہے''۔14؎

افلاطون نے اس مقصد سے کہ اولاد کی صحت بہترین ہو اور کسی قسم کے خاندانی تعلقات قائم نہ رہنے پائیں تا کہ انسان بیوی بچوں اور خاندانی جھگڑوں میں پھنس کر اپنے ملکی فرائض کو نہ بھول جائے اسی لیے اُس

نے اصول اشتمالیت رائج کیا۔نظریۂ اشتمالیت کی رو سے افلاطون کہتا ہے کہ:

''ہمارے محافظین کی بیویاں مشترک ہوں بچے مشترک ہوں والدین اپنے بچوں کو نہ پہچانیں نہ بچے اپنے والدین کو ........... ہمارے شہر میں عورتوں اور بچوں کا مشترک ہونا ریاست کے لیے سب سے بڑی خوبی کا باعث ہے''۔ 15؎

اسی نظریے کو ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی اپنی تصنیف ''یوروپ کے عظیم سیاسی مفکرین'' میں لکھتے ہیں:

''اس (افلاطون) نے اور سپاہی عورتوں کے بچوں کی تربیت مملکت کے حوالے کی اور شادی کا ایسا طریقہ تجویز کیا کہ اس سے ماں، باپ اور اولاد میں کسی قسم کا تعلق نہیں رہتا تھا''۔ 16؎

یونانی تہذیب کے ابتدائی دور میں عورت کی حیثیت مردوں کی مدمقابل کسی حد تک مساوی تھی۔لیکن جب سے اولاد کی نسبت باپ کی طرف ہونے لگی عورت کا مقام ومرتبہ کم تر ہوتا چلا گیا۔وہ ہمیشہ کسی نہ کسی مرد کی زیردست رکھی جاتی تھی۔بچپن میں باپ کی، شادی کے بعد شوہر کی اور بیوگی میں اپنی مرد اولاد کی یا کسی قریبی عزیز کی نگرانی میں ہوئی تھی۔علم حاصل کرنے کی اس کو اجازت نہیں تھی۔ڈاکٹر آمنہ تحسین لکھتی ہیں

''(یونان میں) علم کا حصول اس (عورت) کے لیے معیوب سمجھا جاتا تھا۔خاص طور پر فلسفہ اور طب کی تعلیم عورتوں پر حرام کردی گئی تھی''۔ 17؎

یونان ایک ایسا ملک رہا ہے جہاں مختلف علوم وفنون کی ابتداء ہوئی، تاریخی اعتبار سے اس ملک کی کافی

اہمیت ہے اس کے باوجود یونانی اقوام عورت کو بہتر مقام نہ دے سکے۔ یہاں پر مختلف رسم ورواج بھی عام تھے جو عورت کی آزادی کو سلب کرنے میں مددگار ثابت ہوتے تھے۔ یونان میں ایسی ہی ایک رسم تھی، جس کے بارے میں آمنہ تحسین نے لکھتی ہیں:

''شادی کے بعد لڑکی جس گاڑی سے شوہر کے گھر جاتی
اس گاڑی کو شوہر کے گھر کے دروازے پر جلادیا جاتا تھا
تاکہ لڑکی پچھلے تمام رشتوں کو ختم کردے اور وہ خود کو مکمل طور
پر شوہر کی ملکیت تصور کرے''۔18؎

یونان کے جس شہر میں عورتوں کو سب سے زیادہ آزادی حاصل تھی، وہ یونان کا صدر مقام اسپارٹا تھا اسپارٹا کے مشہور اسکالر لاکرگس نے اپنے قوانین متعین کئے تھے، جس میں عورتوں کو آزادی ومساوات دی گئی تھی لیکن دوسرے مشہور شہر ایتھنز میں عورتوں کی آزادی سلب کردی گئی تھی ۔ یونان میں عورتوں کو گانا بجانا اور دوسرے علم وادب سیکھنے کی اجازت تھی۔ بلکہ مرد ایسی عورتوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ پھر بھی مجموعی طور پر یونانی عورتوں کی حیثیت سماج میں مساویانہ نہیں تھی۔

یونان تہذیب کے بعد قدیم تہذیبوں میں روم کا ذکر ملتا ہے۔ رومی تہذیب نے اپنے علوم فلسفہ نجوم میں بہت ترقی کی تھی لیکن یہاں بھی عورتوں کی سماجی حالت بہت پست تھی۔ خاندان پر مرد کا غلبہ تھا عورت مرد کی ملکیت سمجھی جاتی تھی ، یہاں پر عورتوں کی خرید وفروخت عام تھی حتٰی کہ باپ اپنی بیٹی کو فروخت کردیتا تھا۔ تاریخی حوالے سے آمنہ تحسین لکھتی ہیں:

''باپ کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ بیٹی کو فروخت کرسکتا
تھا، اور شوہر کو بھی یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے خسر سے اس
عورت کو خرید کر کہیں اور فروخت کردے''۔19؎

روم میں عورت جائداد کی وارث نہیں تھی۔ بلکہ وہ خود ایک جائداد تصور کی جاتی تھی جسے ترکہ میں تقسیم کیا جاتا تھا۔گھر میں وہ غلاموں کی طرح زندگی گذارتی تھی۔خدمت گذاری اس کا فرض سمجھا جاتا تھا۔روم میں پردے کا رواج عام تھا۔روم میں عورت کا جو مقام تھا کم وبیش وہی ہندوستان میں بھی درجہ دیا گیا جیسا کہ کئی مؤرخوں کا خیال ہے کہ زمانے قدیم کی دراوڑ نسل روم سے تعلق رکھتی ہے مشہور مؤرخ رما شنکر تر پاٹھی اپنی کتاب قدیم ہندوستان کی تاریخ میں لکھتے ہیں:

''بہت سے مغربی عالم اس رائے سے متفق ہیں کہ دراوڑ
بحرروم کی نسل سے تعلق رکھتے تھے''۔20ؐ

تاریخی شہواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر دولت مند ملک رہا یہاں پرتہذیب تمدن کے علاوہ مختلف مذاہب نے جنم لیا۔سامعر کی شاہی مملکت کے نقوش آج بھی اہرام مصر کی شکل میں موجود ہیں۔

قدیم مصری تہذیب کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مصری عورت کو میں اپنے تمام حقوق حا صل تھے۔ وراثت کا سلسلہ عورت سے چلتا تھا۔اسے انتہائی عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔اس بات کو شمیم نکہت لکھتی ہیں:

''وہاں (مصر) وراثت کا سلسلہ لڑکے کی طرف منتقل
ہونے کے بجائے سب سے بڑی لڑکی کی طرف منتقل
ہوتا تھا''۔21ؐ

اس حوالے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مصر میں عورت کا مقام کافی اونچا تھا مصری خواتین خاندان اور سماج میں معاشی طور پر کافی مستحکم تھیں۔مصری خواتین کا درجہ اس حوالے سے حاکم کا ہو جاتا ہے:

''مصری قانون عورت کو اس وقت تخت وتاج کا وارث
بناتا تھا۔جب کہ شاہی خاندان میں وارث مرد موجود نہ ہو

۔۔۔تاہم ملکہ مصر عورت کے لباس میں ظاہر نہیں ہوسکتی تھی
بلکہ وہ مردانہ لباس استعمال کرتی تھی۔ اس لئے کہ ان کا
اعتقاد تھا کہ عورت حکومت کی کرسی سنبھالے تو اسے عورت
کی طرح نااہل نہیں بلکہ مرد کے لباس میں مرد کی طرح
بہادر و قابل ظاہر ہونا ہوگا''۔22

اس طرح مصر میں عورت کو مالکانا اور حاکمانا حقوق حاصل رہے لیکن رفتہ رفتہ یہ حقوق چھین لئے گئے۔ زرعی انقلاب کے بعد عورت اپنے مقام سے گرگئی۔اس صورت حال کے اثرات دنیا کی قدیم ترین تہذیب یعنی مصری تہذیب کے سماج پر بھی مرتب ہوئے۔ جہاں عورت کی حیثیت میں کمی ضرور آئی، لیکن دوسری قوموں کے مقابلے میں بہت عرصہ کے بعد، چونکہ یہاں پر عورت کو دیوی است کی صورت میں یاد کرتے تھے است یا دیوی مصریوں کے لیے کافی مقبول ترین اور محبوب ترین سمجھی جاتی تھی۔اس کے معنی ''تخت والی'' کے ہیں۔اس بارے میں ابن حنیف نے تفصیل سے لکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ:

''تخت شاہی، چونکہ مصریوں کے ہاں مونث تھا اس
لئے اس (تخت) کی تجسیم عورت بنتی تھی یعنی ایسی عورت جو
بادشاہ کی ماں ہوتی تھی 'است' کے اسی معنی یعنی 'تخت' یا
'تخت والی' کی مناسبت سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ شاید
وہ پہلے پہل تخت شاہی کی دیوی رہتی ہو''۔23

فرعون کے دور حکومت کے آخری دور میں عیش و عشرت کا چلن عام ہوگیا۔تعداد ازدواج کا سلسلہ بڑھ گیا اور عورت کی سماجی حیثیت بری طرح متاثر ہوئی لیکن مصر کی تعلیم یافتہ خواتین نے تحریک شروع کی اور شادی کے لئے مختلف شرطیں منوالیں۔اس سے قبل کسی بھی ملک میں شادی کے وقت شرطیں لکھ کر ان پر دستخط

کرنے کا رواج نہیں تھا۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے

''نکاح نامہ کی ایجاد سب سے پہلے قدیم مصر میں ہوئی''۔24؎

قدیم مصر میں عورتیں تمام کاموں میں مرد کے دوش بدوش زراعت، مویشی پالن میں برابر حصہ لیتی تھیں۔ عورتیں بچوں کی پرورش کے علاوہ مردوں کے لئے ہتھیار بھی تیار کرتیں تا کہ وہ شکار کر کے لاسکیں۔ چنانچہ ''سفرنامہ جنوبی آفریقہ'' میں ہیروڈئس نے لکھا ہے:

''عورت نے صرف یہ ہی نہیں کہ صحرائی پیداوار سے غذا
کا کام لیا ہو بلکہ اس نے زمین کھود کر تخم ریزی بھی کی اور
اس طرح اولین زراعت کی بنیاد ڈالی''۔25؎

مصر میں بھی کئی ایسے رسم و رواج تھے جو عورت کو نہایت پستی میں ڈھکیل دینے کے لئے کافی تھے۔ نکاح کے بعد عورت مرد کی ملکیت قرار پاتی تھی۔ بلکہ شادی کے بعد عورت کا سارا مال بھی مرد کے نام ہو جاتا تھا۔ دنیا میں خطہ عرب اپنی بے مثال تہذیب وتمدن کی وجہ سے اٹوٹ مانا جاتا ہے۔

قدیم عرب میں بھی ظہور اسلام سے قبل عورت کی سماجی حالت بہت خستہ تھی۔ وہاں لڑکیوں کی پیدائش بےعزتی کا باعث سمجھی جاتی تھی۔ ان کا یہ یقین تھا کہ ایک قبیلہ کی لڑکی جب دوسرے قبیلہ میں بیاہی جاتی ہے تو وہ اپنے قبیلے کے لیے بےعزتی کا سبب بنتی ہے۔ اسی لیے عرب پیدائش کے وقت ہی لڑکی کو مار ڈالتے یا پھر اس کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ لڑکیوں کو مار ڈالنا باعث فخر سمجھتے' لیکن السلام کے پھیلنے کے ساتھ ہی یہ ظلم ختم ہو گیا۔ عربوں کا عام خیال تھا کہ

''عورت فطری طور پر ضعیف الخبثہ اور ضعیف الدماغ
ہوتی ہے۔ مرد کی اعانت کے بغیر وہ نہ تو ضروریات زندگی
مہیا کر سکتی ہے اور نہ اپنی عزت وآبرو کی حفاظت''۔26؎

بعض تاریخی حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ خاندان میں عورت کی عزت کی جاتی تھی اور سماج میں اس کا درجہ محترم تھا۔عرب کے قدیم باشندے بدو کی عورتیں بھی خاندانی معاملات میں اہمیت رکھتی تھیں اور مختلف کاموں میں مردوں کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ نیاز فتحپوری گہوارہ تمدن میں لکھتے ہیں کہ:

''صحرائے عرب کے بدو جب ریگستان میں چراگاہ یا چشمے کی تلاش کی غرض سے اپنا جائے مقام بدلنا ضروری سمجھتے ہیں تو ان کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ یوں ہی خالی ہاتھ اپنے اونٹوں کو لے کر چل دیں پھر اب یہ عورت کا کام ہوتا ہے کہ وہ خیموں کو اکھاڑے سارا سامان اکٹھا کرے اور اونٹوں پر بار کر کے لے جائے۔عورتیں اس کام کو اس قدر سرعت کے ساتھ انجام دیتی ہیں کہ مردوں کا قافلہ دور نہیں پہنچتا کہ یہ بھی سارا اسباب لے کر ان سے مل جاتی ہیں''۔27ے

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ عرب میں عورت مردوں کے ساتھ مصیبتیں جھیلتی اور نہ صرف گھریلو مصروفیات میں بلکہ معاشی اسباب کی تلاش میں سرگرداں رہتیں تھیں وہ مردوں کے ساتھ ریگستانوں کی تکالیف کو برداشت کرتے ہوئے اپنے آپ کو مردوں کے شانہ بہ شانہ رکھتیں۔عرب قوم ایک جنگجو قوم تھی ، جنگ کے بعد مال واسباب کے ساتھ عورتوں کو بھی لایا جاتا یا پھر قبیلہ کے مرد اس سے شادی کر لیتے ، اس وجہ سے کثیر الازدواجی زندگی کا نظام رائج تھا۔مختلف قبائل سے رشتہ قائم کر کے جنگوں کے لئے زیادہ سے زیادہ بیویاں رکھی جاتیں۔اس بارے میں ڈاکٹر شہزاد شمس لکھتے ہیں:

''عرب کے مختلف قبائل نے عورت کی سماجی زندگی اور

اس کے حقوق کو نہ صرف پامال کیا بلکہ وحشیانہ سلوک کا رویہ
اپنایا۔ اس سماج میں عورت ایک جائداد کی حیثیت رکھتی
تھی۔شوہر کے انتقال کے بعد اسے فروخت کر دیا جاتا تھا۔
بیوی کو زمین اور جوئے میں داؤ پر لگا دینے کا رواج تھا''۔28؎

اس طرح دوسرے قدیم تہذیبی مراکز کی طرح عرب میں بھی عورت کی سماجی حیثیت بہتر نہیں تھی وہ سماج میں دوسرے درجہ کی مخلوق سمجھی جاتی تھی۔

بعثت رسولؐ کے وقت عرب دنیا میں عورت کی سماجی صورت حال کا جائزہ فاطمہ میرینسی نے اپنی کتاب ''حجاب سے آگے'' "Beyond the vail" میں تفصیل سے لکھا ہے ان کے مطابق:

''قبل اسلام کے تمدن میں نسوانی جنسی حقوق کا متنوع
منظر نامہ یہ بتاتا ہے کہ بچے ماں کے قبیلے میں شمار ہوتے
تھے، عورتوں کو آزادی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے ایک یا زیادہ
مردوں سے بہ یک وقت یا یکے بعد دیگرے جنسی تعلقات
قائم کریں اور ختم کر دیں''۔ 29؎

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عرب میں دور قدیم میں عورت خود مختار تھی لیکن یہ خود مختاری بھی شرفاء اور دوسری عورتوں کے لئے مختلف تھی۔یہی وجہ ہے کہ دور جہالت میں عرب عورتیں امور خانہ داری کے علاوہ زراعت اور اونٹوں کی دیکھ ریکھ کرتی تھیں اور اپنے قبیلہ کی عزت وغیرت کے تمام اصول پر کاربند رہتی تھی۔

''حجاب سے آگے'' میں فاطمہ مرینسی، ڈبلیو رابرٹسن اسمتھ "W.Robertson Smith" کی تحقیق کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''ظہور اسلام کے زمانے میں ایک رجحان مادر

> شجری(Martritineal) تھا جسے ''صادقہ شادی کا نام دیا جاتا تھا۔ دوسرا رجحان پدر شجری (Partrilneal) تھا، جسے بعل یا(Domination) شادی کہا جاتا تھا۔ رسول اکرمؐ کے زمانے تک یہ دونوں نظام پہلو بہ پہلو رائج اور باہم کلیتاً متضاد تھے شادی کی ان دونوں صورتوں پر نہ صرف قرابت داری کے الگ الگ اور قوانین کا اطلاق ہوتا تھا بلکہ عورت کے مقام و مرتبہ کے حوالے سے بھی ان میں بنیادی فرق تھا جو سماجی رشتوں کے ڈھانچے پر اثر انداز ہوتا تھا''۔ 30

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے دور میں عورتوں کے سماجی مقام کے تئیں چند اصلاحات کی جانے لگی تھیں حالانکہ یہ اصلاحات پائیدار اور تمام قبیلوں میں قابل قبول نہیں تھیں کیوں کہ عرب کے قبیلوں میں ہمیشہ رقابتیں پائی جاتی تھیں اور یہی وجہ ہے کہ عرب کسی ایک قانون پر کاربند نہیں ہوتے تھے۔ زاہدہ حنا عرب میں شادی کی ایک اور شکل اس طرح بیان کرتی ہیں:

> ''شادی کی صادقہ شکل (صدیق سے، جس کا مطلب دوست ہے، صدیقہ یعنی ''عورت دوست'') ایک اتصال ہے، جس سے جنم لینے والی اولاد عورت کی ملکیت ہے۔ اس شادی میں عورت اور مرد کے درمیان ایک معاہدہ عورت کے گھر پر ہوتا تھا۔ اس میں عورت کو حق حاصل ہوتا تھا کہ وہ اپنے شوہر کو اپنی زوجیت سے نکال سکتی ہے۔ جب کہ شادی

میں اولاد شوہر کی ملکیت ہوتی تھی، اسے اپنے بچوں کے
ساتھ بیوی کا بعل یعنی مالک ہونے کا درجہ بھی حاصل
ہوتا۔اس شادی میں ''بیوی اپنے خاوند کا اتباع کرتی اور اس
کے بچے پیدا کرتی، بچے حیاتیاتی اور معاشرتی ہر دو اعتبار
سے باپ کے ہوتے ،اس شادی میں بیوی اپنے حقوق کھو
بیٹھتی اور اپنی ذات کے باوجود اس سے دستبردار ہوجاتی۔
وہ اپنے خاوند کے زیر اقتدار ہوتی اور طلاق کا حق صرف
شوہر کے پاس ہوتا''۔31

عرب کی عورتیں بہادر اور جنگجو ہوتیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ باب اور شوہر کی سر پرستی میں ہی زندگی گزارتیں عرب مسلم سماج کی عورت کے بارے میں مشرق ومغرب اور شمال وجنوب کے علماء اور اکابرین کا جو موقف رہا ہے اور آج تک ہے اس کی بہترین عکاسی امام غزالیؒ کے اس جملے سے ہوتی ہے:

''عورت کے لئے شادی ایک غلامی ہے کیونکہ شادی
اسے ایک ایسا مقام دلاتی ہے جہاں اسے غیر مشروط طور پر
اپنے شوہر کی فرمانبرداری کرنا ہے۔سوائے ان معاملات
کے جن میں وہ اسے احکام الٰہی کی واضح اور کھلی خلاف
ورزی کا حکم دے''۔

مسلمان عالم امام غزالی کی اس بات کو اٹھارویں صدی میں عیسائی ادیب بالزاک نے یوں لکھا:

''شادی شدہ عورت ایک غلام ہے''۔ 32

ان اقتباسات میں شادی کو عورت کے لئے غلامی کی زنجیر کہا گیا ہے لیکن شادی ایک فطری عمل ہے،

اس کو غلامی کہنا سراسر غلط ہے، ہاں یہ اور بات ہے کہ اکثر شادی کے بعد لڑکیوں کو سسرالی ماحول کو سمجھنے میں مشکلات درپیش ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ناچاقی ہو جاتی ہے، عورتوں کے مزاج اور طبعی جسامت کے لحاظ سے گھر کے کام کرنا اور شوہر کی فرمانبرداری کرنا اور بچوں کی دیکھ بھال کرنا ہی بہتر ہے۔

ظہور اسلام کے بعد عرب اور سارے خلیجی ممالک میں عورت کی حیثیت میں بہتری دیکھی گئی عورتوں کو علم و ہنر حاصل کرنے کی اجازت دی گئی اور انھیں حق ملکیت بھی عطا کیا گیا۔ ملک چین دنیا میں کثیر آبادی والے ملک کے طور پر جانا جاتا ہے یہاں کی قوم اپنی قدیم روایات پر آج بھی قائم ہیں۔

ملک چین میں بھی عورت غلامانہ حیثیت رکھتی تھی۔ وہاں کے سماج میں بھی مرد ہی کا غلبہ اور حکومت تھی۔ لونڈیوں کو رکھنے کا رواج عام تھا۔ دوسرے ممالک کی طرح عورت کو محض مرد کے جذبات کی تسکین اور افزائش نسل کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ لڑکیوں کی خرید و فروخت عام تھی۔ اور دختر کشی کی بھی رسم رائج تھی۔ گھر میں لڑکوں کی بہ نسبت لڑکیوں سے امتیازی سلوک کیا جاتا تھا۔ لڑکیوں کو تعلیم سے دور رکھا جاتا۔ اور کم عمری میں ہی اس کی شادی کر دی جاتی تھی۔ بعض اوقات لڑکی سے دوگنی عمر کے مرد سے معاوضہ وصول کرنے کے لئے شادی کر دی جاتی۔ سسرال میں اس کی حیثیت خادمہ کی ہوتی تھی وہ گھر کے تمام کاموں کی ذمہ دار کہلاتی تھی ساتھ ہی اس کو اپنے اوپر ہونے والے مظالم پر آواز اُٹھانے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔

چین میں ماں باپ اور شوہر کی جائداد میں عورت کی حصہ داری نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی بیوہ کو دوسری شادی کرنے کی اجازت تھی۔ قدیم چین میں عجیب و غریب رسمیں رائج تھیں۔ ڈاکٹر آمنہ تحسین لکھتی ہیں:

''چین میں ایک سماجی رسم یہ تھی کہ چھوٹی سی عمر میں لڑکی
کے پاؤں میں پیتل یا سخت دھات کے بنے جوتے
پہنا دیئے جاتے تا کہ پیر زیادہ نہ بڑھ سکے کیونکہ بڑے پیر

والی عورت کو سماج میں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔
حالانکہ یہ ایک تکلیف دہ عمل تھا پھر بھی عرصے تک سماج میں
رائج تھا''۔33؎

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چین میں عورت کو بچپن ہی سے رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑا دیا جاتا تھا یہاں پر مرد کو عورت پر فوقیت تھی اور عورت کو مرد کے مقابلے کمتر درجہ دیا گیا تھا۔

چین میں عورت کو کمتر درجہ دینے میں یہاں کے مذہبی پیشواؤں کا بڑا حصہ تھا۔کنفیوشس جس کی حیثیت چین میں مذہبی پیشوا کی تھی اور جس کے فلسفہ کو گوتم بدھ کے فلسفہ کے متوازی تصور عیش وعشرت کہا جاتا ہے۔عورت کے متعلق اس کے نظریات نہایت ہی سخت تھے۔وہ عورت کو مرد کی راحت وآرام،عیش عشرت اور لذت کی دوسری چیزوں کے ساتھ شمار کیا ہے۔ہر عورت کو مرد کی تابعداری کرنا ضروری تھا۔اس ضمن میں وہ لکھتا ہے:

''مرد حاکم ہے اس کا کام حکمرانی ہے اور اس کا فرض
اطاعت ہے عورت شادی سے پہلے اپنے باپ یا بھائی کی
فرمانبردار ہے۔شادی کے بعد شوہر کی اور شوہر کے بعد اپنے
بڑے بیٹے کی اطاعت فرض ہے''۔34؎

کنفیوشس کے ان نظریات نے چین کی عورت کو پست درجہ پر پہنچا دیا تھا۔اس طرح وہ ہر حیثیت میں مرد کی دست نگر ہوگئی تھی۔اور اس کے رحم و کرم پر ہی زندگی گذارنے لگی تھی۔عورت کو انسان کی برابری کی مخلوق تسلیم نہیں کیا جاتا چین میں یہ تصور عام تھا کہ:

"Women is not a subject. She
is an object, which man uses and
abuses as a thing is used and

abused."35

سولشٹ نظام حکومت میں ایک معجزاتی تبدیلی رونما ہوئی اور یہ مشرقی جرمنی، پولینڈ اور چین میں سب سے پہلے وارد ہوئی یہ سب مارکسزم کا اثر تھا جو عورت اور مرد کو مساوی تسلیم کرتا ہے اور دونوں کو مکمل انسان سمجھتا ہے لیکن چین میں جو ابھی تک اپنے آپ کو سوشلسٹ کہتا ہے وہاں عورت کی حالت ابھی بھی بہتر نہیں ہے۔

عورتوں سے متعلق نجی تحقیقی مرکز کے ایک سابق مدیر اور بانی 123 سالہ وانگ ژنگ جوان نے کہا:

''اب عورتوں میں خطرے کا احساس جاگزیں ہے اور

وہ پستی کی طرف جارہی ہے''۔36

1950ء کی دہائی میں کمیونسٹ پارٹی نے یہ اعلان کیا تھا کہ اس نے عورتوں کو دوایسی خاندانی غلامی سے نجات دلائی ہے۔ ماؤ تنزے کا یہ اصول تھا کہ نصف ذمہ داری عورت پر ڈال دی جائے اس اصول تحت کام کر سکنے کی عمر والی 90 فیصد عورتیں گھروں سے باہر ملازمتیں کرتی تھیں لیکن مارکسٹ اکانومی کی طرف چین کی مراجعت نے ان ضمانتوں کو ہلا کر رکھ دیا جو عورتوں کو حاصل تھیں اور نتیجہ یہ نکلا کہ تفریق و امتیاز، ناخوشگوار جنسی زندگی اور شوہروں کے ہاتھوں جسمانی تشدد اور ستم کی شکایات کا اس قدر انبار لگ گیا کہ 1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں جتنا ظلم عورتوں پر چین میں ہوا۔اس کی کہیں پر کوئی نظیر نہیں ملتی۔

برطانیہ دنیا کا وہ ملک ہے جس کی حکومت کا سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا جو سرمایا دارانہ نظام کے تحت دنیا کے کئی ممالک کو اپنی غلامی میں لپیٹ لیا تھا لیکن اپنے ہی ملک کی آدھی آبادی یعنی عورت کا استحصال کرتا تھا۔ یہاں پر انہیں کسی بھی قسم کے حقوق حاصل نہیں تھے عورت اپنے نام سے کوئی معاہدہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔اس کی جائداد اور پیسہ شادی کے بعد شوہر کی ملکیت قرار دیا جاتا تھا۔ وہ عورت کو جب چاہے چھوڑ سکتا تھا، لیکن عورت کو کسی بھی صورت میں مرد سے علاحدگی اختیار کرنے کا حق حاصل نہیں تھا۔لڑکیاں والدین کی

ملکیت سمجھی جاتی تھیں وہ لڑکی کی مرضی کے بغیر کہیں بھی شادی کر سکتے تھے، شادی ایک تجارت تھی، جس کے ذریعہ والدین اپنی اولاد کو فروخت کرتے تھے۔ J.S.Mill اپنی کتاب ''محکومیت نسواں'' میں لکھتا ہے۔

''تاریخ یوروپ کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ابھی زیادہ
عرصہ نہیں گزرا ہے کہ باپ اپنی بیٹی کو جہاں چاہتا بیچ ڈالتا
تھا اور اس کی مرضی کی کچھ پرواہ نہ کرتا تھا''۔37؎

انگلستان کے پادریوں نے عورت کے متعلق غلط بیانی سے کام لیا تھا اور اس کو مکر و فریب والی اور بہکانے والی کی حیثیت سے سماج کو روشناس کروایا تھا۔ جس کی وجہ سے عورت مخالف ذہنیت بنتی چلی گئی تھی۔ جس کی تقلید سینکڑوں برس تک ہوتی رہی۔ جس کے نتیجہ میں وہاں کے سماج میں عورت ایک حقیر ہستی بن کر رہ گئی۔ ڈاکٹر آمنہ تحسین انگلستان کے رسوم کے بارے میں لکھتی ہیں:

''انگلستان میں ایک قدیم رسم عرصہ تک رائج تھی۔ اس
رسم میں باپ اپنی بیٹی کی شادی میں داماد کو ایک کوڑا تحفتہً دیتا
تھا۔ جو عورت کو مارنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ کوڑا
لگانے کی رسم کو 1917ء میں ممنوع قرار دیا گیا''۔38؎

1660ء سے 1666ء کے برطانوی انقلاب کے نتیجہ میں برطانیہ سے جاگیرداری کا خاتمہ ہوا اور صرف برطانیہ ہی میں نہیں سارے یوروپ میں سرمایہ دارانہ نظام تیزی سے اپنے قدم جمانے لگا۔ اس کے اثرات عورتوں کے حصے میں بھی آئے اور وہ تعلیم، تجارت اور حرفت کے شعبوں میں آگے آنے لگیں۔

مفکرین کے خیالات بھی عورتوں کے متعلق اچھے نہیں تھے کنفیوشس، ارسطو، روسو نے بھی اپنی تحریروں میں عورت کو حقیر گردانا ہے۔ یوریپڈس پانچویں صدی قبل مسیح کا مفکر تھا اس کا خیال ہے کہ:

''عورتیں اچھائیوں کو اپنانے میں حد درجہ کوتاہی برتتی ہیں اور

برائیوں کو اپنانے میں حد درجہ چالاکی سے کام لیتی ہیں'' 39۔

جان لوکسس سولھویں صدی عیسوی میں اسکاٹ لینڈ کا ایک معروف سماجی مصلح گزرا ہے اس کے مطابق:

''عورت ضعیف، احمق اور متلون مزاج ہوتی ہے۔ اسے ترقی

دینا خدائی قانون اور فطرت کے خلاف ہے'' ۔40۔

ارتھر شوپنیا جرمنی کا مشہور فسلفی تھا اس نے عورت پر ایک مضمون لکھا، جس میں عورت کے متعلق

نہایت ہی توہین آمیز کلمات اور شرمناک خیالات ظاہر کے ہیں:

''فطرت نے جس طرح شیر کو پنجے اور دانت، ہاتھی کو

سونڈ، بیل کو سینگ اور بد پپیہا کو سیاہی دی ہے۔۔۔ اسی

طرح عورت کو اپنی حفاظت کے لئے مکروفریب سے مسلح کیا

ہے۔۔۔ مکروفریب عورت کی پیدائشی خصلت ہے، اس سے

اس کی دوسری برائیاں اختراع پردازی بے وفائی، غداری

وغیرہ پیدا ہوتی ہیں ۔۔۔ عورت کا رسوخ اور اثر سماج کی

بربادی کا باعث ہوتا ہے۔ عورت کی کمزوری کو نظر انداز تو کیا

جا سکتا ہے لیکن اس کی عزت کرنا مضحکہ خیز ہے'' ۔41۔

یونان کا اول مشہور مفکر و سیاست داں سقراط نے عورت کے متعلق لکھا ہے:

''عورت ہر برائی کی جڑ ہے'' ۔42۔

ارسطو نے عورت کے مطابق لکھا ہے:

''مملکت ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو بغیر ایک

دوسرے کے زندہ نہیں رہ سکتے مثلاً مرد اور عورت۔ اس کے

علاوہ ایسے لوگوں کا اتحاد ہے جن میں ایک دوسرے کی
ضرورت ہے، مثلاً آقا اور غلام، حاکم اور محکوم، کیونکہ ان
میں سے ایک یعنی آقا یا حاکم غور وفکر کی اہلیت رکھتا ہے اور
دوسرا جسمانی محنت ومشقت کی''۔43

جدید فلسفی ہیگل کے مطابق:

''عورت مرد سے اتنی ہی مختلف ہے جتنا کہ
پودا جانور سے''۔44

مرداورعورت کی صنفی خصوصیات کے متعلق مولانا روم کا نظریہ ہے کہ:

''خدانے عورت کواس لئے پیدا کیا کہ مرداس کی محبت
سے دل ودماغ کا سکون حاصل کرے۔اسی لئے خدانے
مردوں کے دل میں عورت کے لئے خاص کشش رکھی ہے
اورعورت کی فطرت میں محبتالفت اور لطف و دلداری
ودیعت کی ہے۔محبت والفت ہی عورت کی صنفی خصوصیت
ہےاور جسمانی طاقت مرد کا خاصہ ہےعورت اپنی فطری نرمی
اورالفت کی وجہ سے مرد پر غالب آتی ہےاور مرد اپنی طاقت
اورسختی کے ذریعہ عورت پر حکومت کرتا ہے''۔ 45

عالمی سماج کے تاریخی اوراق کی ورق گردانی کی جائے تو یہ بات ظاہر ہوگی کہ دنیا کے تمام ممالک میں عورت قدیم زمانے سے ہی مظلوم رہی ہے۔ ہر قوم و ہر خطے میں مختلف طریقوں سے عورت کا استحصال ہوتا رہا۔اگر چہ حالات اور انقلابات کی وجہ سے عورت کی سماجی حیثیت میں کہیں کہیں سدھار آئے ہیں لیکن بحیثیت

مجموعی وہ ہمیشہ مظلوم ہی رہی ہے۔

☆☆☆

# حوالے


1۔ بحوالہ محمد ہاشم قدوائی، ڈاکٹر، یورپ کے عظیم سیاسی مفکرین، ترقی اردو بورڈ، دہلی، 1977ء ص38

2۔ بحوالہ محمد ہاشم قدوائی، ڈاکٹر، یورپ کے عظیم سیاسی مفکرین، 1977ء ص63،

The politics Book I, 1252 , Book-III 1280۔

3۔ حوالہ زبیر احمد صدیقی، عورت اور مرد کا مرتبہ اقوام عالم میں، نذر ذاکر مجلس نذر ذاکر نئی دہلی، 1968، ص382

4۔ زاہدہ حنا، عورت زندگی کا زنداں، تخلیق کار پبلشرز دہلی، 2006ء، ص16

5۔ زاہدہ حنا عورت زندگی کا زنداں، ص16

6۔ زاہدہ حنا عورت زندگی کا زنداں، ص17

7۔ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج تخلیق کار پبلشرز دہلی 2006ء 15

8۔ زاہدہ حنا عورت زندگی کا زنداں، ص24

9۔ آمنہ تحسین، مطالعات نسواں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 2008ء، ص26

10۔ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج تخلیق کار پبلشرز دہلی 2006ء، ص16-15

11۔ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج ص 16

(The republic III P: 417)

12۔ محمد ہاشم قدوائی، یوروپ کے عظیم سیاسی فکرین، ترقی اردو بورڈ دہلی 1977ء، ص49

13۔ بحوالہ شمیم نکہت، پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار، نصرت پبلشرز لکھنو، 1975ء ص15

14۔ بحوالہ شمیم نکہت، پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار ص15

15۔ بحوالہ شمیم نکہت، پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار ص16

16۔ محمد ہاشم قدوائی ڈاکٹر، یوروپ کے عظیم سیاسی فکرین، ترقی اردو بورڈ دہلی 1977ء، ص50

17۔ آمنہ تحسین ڈاکٹر، مطالعات نسواں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 2008ء، ص28

18۔ آمنہ تحسین ڈاکٹر، مطالعات نسواں، ص29

19۔ آمنہ تحسین ڈاکٹر، مطالعات نسواں، ص29

20۔ قدیم ہندوستان کی تاریخ ، رماشنکر ترپاٹھی۔ ترجمہ سید سخی حسن نقوی ترقی اردو بیورو، دہلی، 1971ء، ص 39

21۔ شمیم نکہت، پریم چند میں نسوانی کردار، ص17

22۔ آمنہ تحسین، مطالعات نسواں، ص31

23۔ زاہدہ حنا، عورت زندگی کا زنداں، ص20

24۔ شمیم نکہت، پریم چند میں نسوانی کردار، ص18

25۔ شمیم نکہت، پریم چند میں نسوانی کردا، ص18

26۔ زبیر احمد صدیقی، عورت اور مرد کا مرتبہ اقوام عالم میں، نذر ذاکر، مجلس نذر ذاکر، نئی دہلی، 1968ء ص388

27۔ شمیم نکہت ڈاکٹر، پریم چند میں نسوانی کردار، ص20-21

28۔ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص22

29۔ زاہدہ حنا عورت زندگی کا زنداں، ص39

30۔ زاہدہ حنا، عورت زندگی کا زنداں ص:39

31۔ زاہدہ حنا، عورت زندگی کا زنداں، ص:40

32۔ زاہدہ حنا، عورت زندگی کا زنداں ،ص40-41

33۔ آمنہ تحسین، مطالعات نسواں، ص33

34۔ شمیم نکہت، پریم چند میں نسوانی کردار، ص19

35۔ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص21

36۔ بحوالہ زاہدہ حنا، عورت زندگی کا زنداں، تخلیق کار پبلشرز دہلی، 2006ء، ص:59

37۔ بحوالہ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص2

38۔ آمنہ تحسین، مطالعات نسواں، ص35

39۔ بحوالہ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، تخلیق کار پبلشرز، دہلی، 2006ء، ص24

40۔ بحوالہ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص24

41۔ بحوالہ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص24

42۔ بحوالہ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص25

43۔ محمد ہاشم قدوائی، تاریخ افکار سیاسی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 1984ء، ص86

44۔ بحوالہ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص25

45۔ بحوالہ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص:26

☆☆☆

# باب دوم

## ہندوستانی سماج میں عورت کا مقام

# ہندوستانی سماج میں عورت کا مقام

دنیا کے دیگر مما لک کی طرح ہندوستان میں بھی عورت کی سماجی حیثیت ابتر اور پست رہی ہے تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہندوستانی تاریخ میں ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جس میں عورت بلند و اعلیٰ مقام پر نظر آتی ہے۔ اس سماج میں مرد کے برابر تمام حقوق حاصل تھے اور وہ اپنی زندگی کے تمام معاملوں میں بالکل آزاد تھی۔ ہندوستان کی تاریخ میں ماقبل تاریخی دور سے عصر جدید تک خواتین کے کردار اور ان کی حیثیت میں عروج وزوال کی نمایاں مرحلے نظر آتے ہیں۔

ہندوستان میں عورت کی حیثیت کے متعلق مختلف مکتب فکر کے مختلف نظریات ملتے ہیں۔ ایک مکتب فکر کے بموجب مرد کو خدا کا بہترین تحفہ عورت ہے اسی لئے اس کے ساتھ مناسب سلوک کیا اور اس کا احترام کیا جاتا تھا۔ اسے دیوی یا لکشمی کا درجہ دیا جاتا تھا جو دولت وخوشحالی کی دیوی کہلاتی تھی۔ دوسرے مکتب فکر کا نظریہ یہ ہے کہ خدا تک رسائی کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ عورت سے گریز کیا جائے۔ کیونکہ عورتیں بجلی کا تلون ہوتی ہیں اور ہتھیار کی تیز دھار اور چیل کی سی تیزی کا مجموعہ ہیں۔ انہیں دو نظریات کے بارے میں پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا ہے کہ:

> ''ہندوستانی عورت کے بارے میں عام طور پر دو نظریات پائے جاتے ہیں ایک خاص طرح کا روایتی نظریہ جس میں ہندوستانی عورت پاکیزگی، فرماں برداری، سپردگی اور شوہر کے احترام وعقیدت کا ایک مثالی نمونہ ہے جس کی

> عظیم مثالیں سیتا اور ساوتری سے دی جاتی ہیں، دوسرا
> نظریہ جو کہ عام طور پر مغربی مما لک کے لکھنے والوں کا ہے کہ
> ہندوستانی عورت مظلوم اور حقیر ہے جن کے ساتھ جانوروں
> کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے ۔ یہ دونوں نظریات حقیقت سے
> بہت دور ہیں اور صرف خیالی نظریات کو پیش کرتے ہیں جن
> کا تعلق زندگی سے بہت کم ہے''۔1

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستانی سماج نے عورت کو اعلٰی درجہ عطا کیا تھا۔ ہندوستان کی قدیم ترین تصانیف چار وید تسلیم کئے جاتے ہیں۔ان ویدوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تعلیمی اور سماجی مقام کے اعتبار سے عورتیں قریب قریب مردوں کے برابر تھیں۔مشہور مؤرخ السٹیر لکھتا ہے۔

> الٹیر کے مطابق جب کہ تمدن کا آغاز ہوا تھا ہندوستان
> میں عورت کو جو مقام حاصل تھا وہ اس مقام سے بہت زیادہ
> بہتر تھا جس کی ہمیں اس دور میں توقع ہوسکتی ہے اس کا
> خیال ہے کہ تقریباً 2000 قبل مسیح میں آریاؤں کی
> ہندوستان میں آمد سے بھی پہلے یہ سمجھنے کے لئے تھیں اور
> انہوں نے ایک قطعی تہذیب وتمدن اور روایات کے ارتقاء
> میں اہم کردار ادا کیا تھا ان کا موقف ان کی ہم عصر تہذیبوں
> جیسے قدیم یونان، روم بلکہ عیسائیت کے ابتدائی دور میں
> عورتوں کے موقف سے بہتر تھا۔ کلاسیکی ادب کے عظیم
> محققین میں اس بات پر تقریباً اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ
> ویدوں کے دور میں [2500 تا 1500 قبل مسیح کا موقف

مرد کے مساوی تھا''۔ 2

رگ ویدی آریوں کی خانگی زندگی کافی خوشگوار تھی وہ عورت کی عزت کرتے اور مقدس سمجھتے تھے۔ اُنہیں شوہر کے انتخاب کی اجازت تھی لہٰذا یہ کہنا درست ہوگا کہ عورتوں کی سماجی حیثیت ویدک عہد کے پہلے دور میں اچھی تھی۔۔اِن خیالات کو سید سخی حسن نقوی اپنی تصنیف ''قدیم ہندوستان کی تاریخ'' میں لکھتے ہیں:

''رگ ویدی آریوں کی خانگی زندگی کافی خوشگوار تھی وہ
ازدواجی زندگی کے لئے بندھنوں کو مضبوط رکھتے تھے اور
اُنہیں مقدس سمجھتے تھے عام طور پر ایک شادی کے اصول کی
پابندی کی جاتی تھی''۔ 3

ویدک زمانے میں مردوں اور عورتوں کی مساوات کا یہ عالم تھا کہ عورتیں مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کرتی تھیں وہ صرف شوہر کی مطیع و فرمانبردار ہوا کرتی تھیں۔ان کے علاوہ وہ باپ' بھائی سسر یا کسی اور مرد کی تابع نہیں ہوتی تھیں۔اس بارے میں سید سخی حسن لکھتے ہیں:

''(رگ ویدی آریوں کے دور میں) چند شوہری اور
بچپن کی شادیوں کے کوئی آثار نہیں ملتے۔عورتیں اپنے
شوہروں کے انتخاب میں کافی حد تک آزاد تھیں۔شادی
کے بعد وہ شوہر کے زیر امن و عافیت کی زندگی گذارتی
تھیں''۔4

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رگ وید کے عہد میں عورت کسی ایک شوہر کے ساتھ خوش وخرم زندگی بسر کرتی تھی خاص طور سے اِس عہد کی قابل غور بات یہ ہے کہ اس عہد میں بچپن کی شادیوں کا رواج عام نہیں تھا۔ اِن دونوں باتوں سے یہ صاف ہوجاتا ہے کہ رگ ویدی عہد میں اخلاقی کردار اور علم وفکر کا بول بالا تھا۔لوگ

اخلاق کے اونچے اقدار پر فائز تھے۔

عورتوں کی آزادی اُن کے زندگی گزارنے کے طریقے سے بھی معلوم کی جاتی ہے عورت فطری طہور پر نازک مزاج اور اپنے آپ کو سنوار کر رکھنا پسند کرتی ہے۔عورت کو لباس' زیور اور رسم ورواج سے بہت اُنسیت ہوتی ہے ۔یہ فطری تسکین ویدک عہد میں عورت کو پوری طرح میسر تھی ۔رگ ویدی عہد کی تاریخ کے اس اقتباس سے ظاہر ہے:

''وہ گھریلو معاملات میں پورا اختیار رکھتی تھیں اور شوخ
لباس اور زیورات پہن کر قربانیوں اور گھریلو رسموں میں
شرکت کرتی تھیں۔عورتوں کو علاحدہ رکھنے کا رواج اس زمانے
میں نہیں تھا''۔5

رگ ویدی عہد میں عورت کو فطری آزادی کے ساتھ ساتھ تعلیمی آزادی بھی دی گئی تھی ۔اِس عہد میں کئی شاعرہ تھیں جو بھجن اور منتر لکھا کرتی تھیں ۔اس لیے رگ وید میں بعض ایسے بھی بھجن ملتے ہیں جو عورتوں سے منسوب ہیں۔جنہیں''رشیکا''اور''برہم ویدی'' کہا جاتا ہے سید سخی حسن نقوی لکھتے ہیں:

''عورتیں تعلیم یافتہ ہوتیں تھیں اور بعض مثلاً آپالا، وشودرا،
اور گھوشا رشیوں کی طرح منتر تصنیف کرتی تھیں''۔ 6

عورت کی تعلیمی برابری کے متعلق ہمیں شمیم نکہت کے تحقیقی مقالے سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔شمیم نکہت نے رادھا کمل مکرجی کے حوالے سے لکھا ہے:

''برہم ویدنی برہم چریہ کے طالب علم ہوا کرتے تھے۔
عورتوں کو بھی اس علم کے حاصل کرنے کی اجازت تھی رگ
وید (7,9) میں اس کا حوالہ ملتا ہے کہ نوجوان لڑکیاں اپنی

تعلیم برہم چرنیہ کی حیثیت سے مکمل کرتی تھیں اور تعلیم کی
تکمیل کے بعد جس طرح ندی سمندر میں مل جاتی ہے وہ
اپنے شوہروں سے مل جاتی تھیں''۔ 7

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ ویدک عہد میں عورتوں کی تعلیم کا رواج عام تھا۔ ان میں بعض شاعرہ، بعض فلسفی اور بعض استانی کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اگر چہ تعلیمی میدان میں کچھ دشواریاں ضرور حائل ہوئیں لیکن اس کے باوجود عورتوں نے تعلیم حاصل کی اور وقتاً فوقتاً اپنے علم اور اپنی اہلیت ولیاقت کا مظاہرہ کیا۔ مذہبی تنظیموں اور اداروں میں عورتیں پیش پیش رہنے کے ساتھ ساتھ اجتماعات میں بھی حصہ لیا کرتی تھیں جیسا کہ ''قدیم تاریخ ہند'' کے حوالے سے پتہ چلتا ہے:

''۔۔قدیم ہندوستان میں فلسفیوں کی ایک کانفرنس کے
بارے میں بھی پتہ چلتا ہے۔ یہ کانفرنس اپنی نوعیت کی دنیا
کی پہلی کانفرنس تھی جو کہ دے دھا کے راج رشی جنک کے
یہاں ہوتی تھی، اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف فلسفیانہ
خیالات ونظریات رکھنے والے لوگوں کو اور مختلف مذہبی
خیالات وعقیدت کے لوگوں کو یکجا کر کے ان کے خیالات
کو باضابطہ تحریری شکل دی جائے اور ساتھ ہی اختلافات کو
دور کرنے کی کوشش کی جائے۔اس کانفرنس کی سب سے
بڑی اہمیت یہ تھی کہ اس میں ایک فلسفی خاتون برہم ویدنی
گارگی وشا کناری (Brahmn vadni Gargi
Vachaknari) صرف شریک ہی نہیں ہوتی تھیں بلکہ

انہوں نے اس کے مباحثوں میں حصہ لیا اور بڑی دلیری
سے تقریریں کی تھیں''۔8

ہندوستانی مقدس چار ویدوں میں پہلی رگ وید کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عورت کو مکمل آزادی، مساوات تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔اس عہد کے تعلیمی نظام کے متعلق ڈاکٹر محمد شہزاد شمس نے لکھا ہے:

''اس عہد (ویدک عہد) میں تعلیم یافتہ عورتوں کا دو
طرح کا طبقہ ملتا ہے۔۔۔اول سدیودواہاس یعنی وہ عورتیں
جو اپنی پڑھائی شادی کے بعد بھی جاری رکھتی ہیں، دوم
برہمو ویدنی یعنی وہ عورتیں جو شادی نہیں کرتیں اور اپنی پوری
زندگی تعلیم حاصل کرنے میں وقف کر دیتی ہیں ایسی عورتوں
میں گارگی، واچکنوی، واڈوا پراتیتھی سکھا میتری اہم ہیں۔
دیگر عورتوں میں گھوشا، گودھا، شوا کرا اوراپالا ہیں۔جن کا ذکر
رگ وید میں موجود ہے''۔9

ویدک دور میں عورتیں استاد کا پیشہ اپناتی تھیں اور معلّمی اس زمانے میں عام تھی اور آج بھی عام ہے، جس کے متعلق مفکرین نے لکھا ہے کہ عورتوں کو گھر کے کاموں کے علاوہ اخلاقی درس وتدریس کا کام کرنا چاہیے۔اس کے علاوہ وہ ادویات بنانے میں بھی طب کے ماہروں کی مدد کرتی تھیں۔

ڈاکٹر آمنہ تحسین اپنی تصنیف ''مطالعات نسواں'' میں لکھتی ہیں:

''عورت کو بحیثیت آچاریہ قبول کیا جاتا تھا، بعض
خاتون استاد، فلسفہ اور اخلاقیات کی ماہر تھیں جو انتہائی خشک

اور مشکل موضوعات سمجھے جاتے تھے''۔10؎

ویدک دور میں عورتوں کی تعلیم اور علم کے فروغ کے بارے میں ڈاکٹر محمد شہزاد شمس نے اپنے تحقیقی مقالہ ''عورت اور سماج'' میں لکھا ہے:

'' رگ وید کی عورتیں شاعرہ بھی ہیں، فلسفی، بحاث (Debalers) اور معلّمہ بھی ۔ رگ وید کا بہت سا رہیمر (Hymer) عورتوں کے ذریعہ مکمل کیا گیا ہے۔ جو اُن کے شاعرہ ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔ ان میں لوپامدرا، اپالا، وشودارا، میکا تا، نیواری اور گھوشا اہم ہیں ۔۔۔اس کے لیے اپادھیایا اپدھیائی اور اچاریہ کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ جب کہ اپادھیائی اور آچاریائی گرو کی بیویاں ہوتی تھیں''۔11؎

مذکورہ اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم ہند میں عورتیں تعلیمی اور سماجی حق رکھتی تھیں ۔ ویدک دور میں عورت کی تعلیمی مذہبی اور سماجی آزادی کے متعلق ڈاکٹر شمیم نکہت کیلاش ناتھ شرما کے حوالے سے لکھتی ہیں:

'' ویدک کال میں عورتوں کو مردوں کے سب سنسکاروں کا حق تھا۔ وہ شوہر کے ساتھ یا علاحدہ آزادی سے مذہبی اُمور انجام دے سکتی تھی۔ بعض بیانات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عورتیں مردوں ہی کی طرح وید پڑھتی تھیں گو کہ اس وقت بھی لڑکوں کی پیدائش کو زیادہ بہتر تصور کیا جاتا تھا۔لیکن اس سے یہ ملطب نہیں ہے کہ لڑکیوں کے ساتھ

برابرتاؤ ہوتا تھا''۔12؎

تاریخ میں سنہرا دور وہ ہوتا ہے جس میں عوام امن و امان کی زندگی گزاریں اور کسی بھی قسم کا بھید بھاؤ' فتنہ وفساد نہ رہے ویدک عہد میں عوام ایکدوسرے کی عزت کرتے عورتوں کو مرد کے مقابل برابری کا درجہ دیتے جس کی وجہ سے یہ عہد کافی اہم اور سنہرا دور مانا جاتا ہے۔

ویدک عہد میں جب آریا قوم ہندوستان کے مختلف مقامات پر آباد ہوگئی تو ہند آریائی تہذیب پروان چڑھنے لگی اور لوگ خانہ بدوشی کی زندگی سے سماجی گروہ واری زندگی گذارنے لگے جہاں عورت کی سماجی زندگی اور اس کی ساری حیثیت کو اہمیت دی جانے لگی۔اس کا ذکر مقدس رگ وید میں ملتا ہے:

''آریہ عورتوں کے ساتھ نرمی اور سلوک سے پیش آتے
تھے اور انہیں عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے
عورت اور مرد کے درمیان سماجی و مذہبی برابری کا ذکر رگ
وید (۸۔۶۱۔v) میں بھی ملتا ہے''۔ 13؎

عورت کو نسل انسانی کی بقاء کے لئے اہم مانا جاتا ہے انھیں عزت و احترام سے زندگی میں تمام آسائیش وآرام مہیا کئے جاتے ہیں جن پر ایک انسان کا حق ہے۔

ویدک دور میں بیٹی کی پیدائش کو مبارک سمجھا جاتا تھا۔بیٹی کی پیدائش کے لیے دعائیں مانگی جاتی تھیں۔رگ وید کے حوالے سے ڈاکٹر آمنہ تحسین لکھتی ہیں:

''رگ وید کے کسی اشلوک میں بیٹی کی پیدائش کو
نامبارک نہیں قرار دیا گیا۔۔۔چند والدین ایسے بھی تھے جو
چاند کی ۱۴/ تاریخ کو کنیا شردھا کیا کرتے تھے جس کا مقصد
قابل اور باصلاحیت بیٹیوں کے تحفے کا حصول ہوا کرتا تھا۔

رگ ویدکئی بیٹیوں کے باپ کی ستائش کرتا ہے۔ علاوہ
ازیں متریکا پوجا کی سفارش کی گئی ہے جوسب سے پہلے کی
جاتی ہے تمام ویدک رسومات کے اختتام پر''کماری پوجا''
کی جاتی تھی''۔14؎

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سماج میں عورتوں کی کتنی اہمیت تھی لیکن اس کے باوجود یہ رائے عام ہے کہ قدیم ہندوستان میں عورت کی حالت اچھی نہیں تھی ڈی۔ڈی کوسمبی نے لکھا ہے:

''آریائی قبائل کا ڈھانچہ مرد کی حاکمیت پر قائم تھا کیونکہ
مرد ہی قبیلہ میں سربرآوردہ شخصیت اور جائداد کا مالک ہوتا
تھا۔ آریوں کے دیوتا بھی بھاری اکثریت میں ذکور ہی
ہیں۔لیکن کچھ دیویاں قدیم تر زمانے یا قدیم تر لوگوں سے
لی گئی تھیں''۔15؎

ہندوستانی سماج میں مرد ہی حاکم تھا اور دیوتا بھی مرد ہی ہوا کرتے تھے لیکن عورتوں کو حقیر و ذلیل نہیں سمجھا گیا بلکہ چند جگہوں پر دیوی ماتا کی بھی پوجا کی جاتی تھی۔ ویدک دور میں عورتوں کا موقف واضح طور پر رگ وید میں مذکور خاتون سنتوں یا ناری رشی کی واضح شکل ہے۔عورتیں، بیٹیوں، بہنوں، بیویوں اور ماؤں کی حیثیت سے خاندان میں مساوی طور پر محترم مقام رکھتی تھیں۔اس دور میں زندگی چونکہ سادہ اور بالکل ابتدائی منزل میں تھی اس لیے لوگوں کی ضروریات بھی بہت مختصر تھیں اور بہ آسانی پوری ہو جاتی تھیں لوگ خصوصی مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ ویدی سماج میں خصوصی مقام لکڑی کے کام کرنے والے کو تھی کیونکہ جنگ میں لکڑی کے رتھوں کا استعمال ہوتا تھا۔عورتیں بھی مخصوص پیشوں سے وابستہ تھیں، جس کا ذکر تاریخی کتابوں میں اس طرح ملتا ہے:

''سینے پرونے اور گھاس پھوس اور بینڈ کی چٹائیاں اور
کپڑا بننے کا کام اکثر عورتیں انجام دیتی تھیں''۔16؎

ایک اور تاریخی پس منظر پر لکھی گئی کتاب میں ڈی۔ڈی کوسمبی نے بھی عورتوں کے پیشے کے بارے میں لکھا ہے:

''بُننا عورتوں کا مخصوص فن تھا''۔17؎

ویدک دور میں عورت مرد کے شانہ بہ شانہ ترقی کی راہ پر گامزن نظر آتی ہے۔تعلیم وحرفت کے علاوہ عورتیں مذہبی رسوم کی ادائیگی کی آزادی بھی رکھتی تھیں۔اس حق کو وہ کبھی انفرادی طور پر انجام دیتیں اور کبھی اجتماعی طور پر حصہ لیتیں ایسے کام کے لیے الگ پوجا گھر بھی ہوتا تھا۔بقول رام شرن شرما:

''عورتیں اجتماعات میں شریک ہوسکتی تھیں اور قربانیاں
پیش کرنے میں بھی اپنے شوہر کے ساتھ حصہ لے سکتی
تھیں۔ایسی پانچ عورتوں کی مثالیں ملتی ہیں جنھوں نے بھجن
کہے تھے''۔18؎

عورتوں نے اس زمانے کے فنون لطیفہ،فلسفہ اور شعروادب کے میدان میں کافی ترقی کی تھی رقص اور موسیقی میں انہیں عام طور سے کمال حاصل تھا۔موسیقی اُس زمانے میں تعلیم کا ایک اہم جز سمجھی جاتی تھی۔رگ وید میں مختلف جگہوں پر اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ عورتیں مذہبی جلسوں میں گایا کرتی تھیں اور گانے کے ساتھ مختلف قسم کے سازوں کا استعمال کرتی تھیں۔اس کے متعلق شمیم نکہت لکھتی ہیں:

''واک''VAC'' ویدک عہد کی مشہور شاعرہ تھیں،
جس کی تصانیف ویداور پران میں شامل ہیں اس کے علاوہ
گھوشا،اندرانی،دشواودا،وغیرہ نے بہت سے بھجن لکھے جو

ویدوں میں شامل ہیں اپنشدوں سے پتہ چلتا ہے کہ میتری
(Maitreyi) اور اس کی لڑکی گارگی مشہور فلسفی تھیں۔
مہابھارت میں اترا(Uttara) اوراس کی سہیلیوں کا ذکر
ہے جو رقص میں کامل تھیں''۔19؎

اس اقتباس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ویدک عہد میں عورتوں کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔انھیں مذہبی رسوم ادا کرنے کی آزادی تھی۔اس سلسلے میں آمنہ تحسین اپنی تصنیف''مطالعات نسواں''میں تفصیل سے اس طرح لکھی ہیں:

''لڑکیاں مقدس دھاگا (اپ ویتا دھرنا) پہنتی تھیں اور
برہم چریہ کے دور سے گذرتی تھیں اپ ویتا تقریب کے
بعد ویدک عورتیں ویدوں کا مطالعہ جاری رکھتی تھیں ویدک
منتر پڑھتی تھیں ویدک رسم ورواج ادا کرتی تھیں ویدک عہد
کرتی تھیں اور یگیہ دینا کی مناسب طریقہ سے ادائیگی کے
لئے جو کچھ بھی ضروری ہوتا تھا بیٹے کی طرح ادا کرتی تھیں''
سروانکرمنیکا''کے بموجب کم ازکم بیس(20) عورتیں ایسی
تھیں جنہیں رگ وید کے گیت لکھنے کا اعزاز حاصل ہوا۔
اونچے طبقے کی بعض عورتیں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں۔انہوں نے
دانشوروں اور فلسفیوں کے مباحث میں شرکت کی تھی۔
خاتون سنتوں جیسے گوشا،اپالا،لوپامدرا،اندرانی،میترئی اور
گارگی کے حوالے ملتے ہیں۔گارگی اپنے دور کے عظیم ترین
محققین میں ایک تھی اس نے''یگیہ واکیا''کو چیلنج کیا اور کئی

اہم اور پیچیدہ سوالات اس سے کئے تھے۔ادب کے علاوہ
خواتین تدریس ، ادویہ، تجارت ،فوج اور نظم ونسق کے
شعبوں میں بھی داخل ہوئیں تھیں''۔20؎

ہندوستانی عورت کوعہد قدیم میں اعلیٰ درجہ دیا گیا تھا عورت کا وجود بے فیض نہیں بلکہ سماج کے ہر طبقہ میں کارآمد قرار دیا گیا تھا جب تک ''مادرسری'' نظام رہا عورت کو دیوی کی طرح عزت واحترام دیا جاتا تھا اس سلسلے میں نیاز فتحپوری نے لکھا ہے

'' یہ امر کہ زمانۂ قدیم میں عورت کا وجود ایک مہتم
بالشان وجود تھا اور وہ کائنات میں مرد کے دوش بدوش کام
کرنے کی اہل تھی۔مختلف ذرائع سے ثابت ہوتا ہے ۔
سب سے پہلے جو چیز اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے
وہ اقوام عالم کاعلم الاصنام ہےکوئی قوم ایسی نہیں جس کے علم
الاصنام میں دو چار دیوؤں کا نام نہ پایا جاتا ہو۔اور یونان و
روما کے ءعلم الاصنام میں تو عنصر غالب دیویوں کا ہی ہے۔
دولت شہرت حسن شعر،موسیقی ،جسم ،روح' زراعت وغیرہ
سب دیویوں ہی سے منسوب ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے
کہ یہ ساری باتیں محض عورتوں کی وجہ سے قائم ہوئیں یہاں
تک کہ ان کو دیوی قرار دیدیا۔۔۔ہندوؤں کے علم الاصنام
میں لچھمی دیوی سے کون واقف نہیں ہے اور اگر اس کی یہ
تاًویل کی جائے کہ عورت کو زمانۂ قدیم میں ایک بے بہا
دولت یا دولت کوعورت کی محنت کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا تو خلاف

محل نہ ہوگا''۔ 21؎

ویدک دور میں عورتوں کا موقف واضح طور پر دیوی، دیوتاؤں ناری رشی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔عورتیں کسی کی تابع نہیں تھیں سماج اور مملکت میں مساوی احترام کا موقف حاصل تھا۔انہیں مردوں کے مساوی حقوق حاصل تھے۔مردان کے زندگی بھر کے شریک حیات،دوست و مددگار تھے۔

ویدک دورِ میں شادی درحقیقت مرد اور عورت دونوں کے لئے مذہبی ضرورت تھی۔لڑکیوں کی شادیاں سمجھداری کی عمر ہونے کے بعد ہوا کرتی تھیں یعنی 14 سے 17 سال کی عمر میں اور وہ بھی ان کی مرضی سے۔تعلیم یافتہ لڑکیاں اپنے شریک حیات کے انتخاب میں فطری طور پر مؤثر آواز رکھتی تھیں۔ بلوغت سے پہلے کی شادیاں نامعلوم تھیں۔سوئمبر کی شادیوں میں عورتوں کو اپنے شریک حیات کے انتخاب کا موقع دیا جاتا تھا اس رواج کے بارے میں ڈاکٹر شمیم نکہت لکھتی ہیں:

''شادیاں بھی عام طور پر لڑکیوں کی مرضی کے مطابق
ہوتی تھیں کسی بھی رشتہ کے سلسلے میں نامۂ و پیام سے قبل
لڑکی کی رضامندی حاصل کر لی جاتی تھی۔اگر کبھی کوئی ایسی
صورت ہوئی کہ ایک لڑکی کے کئی خواستگار ہوئے تو لڑکی ان
میں سے کسی ایک کو منتخب کرتی تھی۔ یہ رسم برہمنی عہد تک قائم
رہی انتخاب کی اس رسم کو ''سوئمبر'' کہا جاتا تھا''۔22؎

اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ شادی کے سلسلے میں لڑکیوں کی پوری مرضی شامل ہوا کرتی تھی وہی پوری آزادی کے ساتھ اپنے شوہر کا انتخاب کر سکتی تھی۔ ڈاکٹر محمد شہزاد شمس نے رگ وید میں شادی کی رسومات کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''رگ وید میں شادی کے لئے آٹھ طرح کے رسومات

رائج تھیں:

1 ۔ برھمہ: بیٹی کی شادی کے لیے باپ خود پڑھے لکھے لڑکے کا انتخاب کرتا تھا۔

2۔ دیو : پجاری سے شادی ہونا (ایسا پجاری جو تقدس کا کام عارضی طور پر کرتا ہو)۔

3۔ آدرش : لڑکے کا باپ شادی میں لڑکی کے باپ کو تحفہ کے طور پر گائے بھینس دیتا تھا۔

4۔ پرجاپتیہ:۔ لڑکی کا باپ جوڑے (میاں بیوی) کو دعا دیتا کہ خدا تمہیں اپنے کام کو انجام دینے کا موقع دے۔

5 ۔ اسور: لڑکے کا باپ قصداً اپنی حیثیت کے مطابق لڑکی اور ان کے رشتہ داروں کو دولت دیتا۔

6۔ گاندھرو: پیار محبت کے ذریعہ کنواری لڑکی ولڑکے کی شادی۔

7۔ راکشس: جبراً لڑکی کو اٹھا کر لانا اور شادی کرنا۔

8۔ پیشاچ: لڑکی کو گمراہ، پھسلا کر اور مدہوشی کی حالت میں شادی کرنا۔

ان رسموں میں برہمہ اور پرجاپتیہ کا چلن زیادہ تھا جب کہ گاندھرو، راکشس اور دوسرے رسم کا چلن بھی رگ وید میں ملتا ہے۔ لڑکی (Bride) کے باپ کو پیسے دینے کا چلن بھی رگ وید میں موجود ہے''۔23؎

قدیم ہندوستان کی تہذیب میں عورتوں کی شادی سادگی سے کی جاتی تھی ۔اس طرح کی ایک رسم کے بارے میں ڈی ۔ڈی ۔کوسمبی لکھتے ہیں:

''حقیقت میں بعض اوقات رشتے داری کو روٹیوں اور بیٹیوں کے مبادلہ کا تعلق (روٹی ۔بیٹی ۔بیوپار) کہا جاتا ہے یہ ٹھیک ٹھیک مترادف فاضل غذا کے لئے اس مبادلہ کا جو ایک رشتہ شادی والے گروہ کے افراد قدیم ابتدائی زمانے میں باہم کیا کرتے تھے (قدیم روم میں سب سے زیادہ مضبوط بندش والی شادی '' کن فیری شو'' "Confarrealtio" تھی جس کے لغوی معنی میں دلھا دلہن کا آپس میں روٹی کا مبادلہ کرنا اور روٹی کو کاٹنا۔ہم پیالگی کی متحد کرنے والی طاقت لفظ (Companian)(ساتھی) سے بھی ظاہر ہے کیونکہ Corn کے معنی ہیں ساتھ اور (banis) کے معنی ہیں روٹی ۔اسی طرح جدید فرانسیسی زبان کے علم صرف میں لفظ "Comfain" انگریزی کے لفظ ( گہرا دوست کا بدل ہے )''۔24؎

قدیم ہندوستانی دور میں عورت کو اپنی انفرادی حیثیت کا اظہار اعلیٰ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔وہ اپنے شوہر کے ساتھ اپنے گھر رہنے کی مشترک مالک ہوتی تھی ۔حالانکہ عملی اعتبار سے وہ ماتحت ،شراکت دار کی حیثیت رکھتی تھی اس سلسلے میں ڈی ۔ڈی ۔کوسمبی لکھتے ہیں ۔

''مردوں کو زیادہ بھاری زرعی کام میں ہاتھ بٹانے کے
لیے عورتیں ہل چلانے کا کام کرتی ہیں ۔ زیادہ تر قدیم
قبیلوں میں کھودنے والی چھڑی اور کھرپے کا کام یعنی تمام
زراعت کے کام عورتوں کے لیے ہی وقف ہیں اسی طرح
شکار کرنا مردوں کے لیے مخصوص ہے''۔25ے

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جتنی عورت کو عزت دی جاتی تھی عورت بھی اپنی حیثیت کے موافق گھر اور خاندان کی مدد کرتی تھی ۔ وہ گھر کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ زراعت کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹاتی تھی ۔اسی لیے عہد قدیم میں عورتوں کو بیٹوں، بہنوں، بیویوں اور ماؤں کی حیثیت سے خاندان میں مساوی طور پر محترم مقام دیا گیا تھا۔دھرم شاستر اور پنچ تنتر میں بھی عورت کو اونچا مقام دیا گیا ہے:

''دھرم شاستر نے باعصمت بیوی کو دیوی کا درجہ دیا
ہے۔اپنی محبت اور شفقت کی وجہ سے اس کا مقام باپ اور
استاد سے بھی اونچا ہے ۔ پنچ تنتر میں کہا گیا ہے کہ گھر کی
دیکھ بھال کا پتہ بیوی کی تہذیب سے چلتا ہے۔اس کے بغیر
گھر ایک بھیانک جنگل کی طرح ہوتا ہے''۔26ے

رگ ویدی عہد میں بیوہ کی شادی جائز تھی ۔عورت اپنے شوہر کے انتقال کے بعد آزاد تھی چاہے وہ دوسری شادی کرے یا پھر اپنے والد کے گھر رہے شادی نہ کرنے کی صورت میں عورت کے والد یا بڑا بھائی اس کی کفالت کا ذمہ دار کہلاتا تھا۔ بیوہ کی شادی کے متعلق محمد شہزاد شمس نے رگ وید اور اتھر وید کے حوالے سے لکھا ہے:

''بیواؤں کی دوسری شادی کی کوئی ممانعت نہیں تھی وہ
جب چاہتیں، دوبارہ شادی رچا سکتی تھیں ۔اتھر وید میں اُن

کو 'پونر بھو' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ان کے لیے تارک
الدنیا ہونا ضروری نہیں تھا اور نہ ہی وہ گوشہ نشینی کے لیے
مجبور کی جاتی تھیں۔۔۔اتھر وید (۲۔۳۱۔۱۸) اور رگ وید
(۸۔۱۸۔۱۰) کے مطابق شوہر کے مرتے ہی شمشان
گھاٹ پر ہی اس کا بھائی اس بیوہ کو اپنی بیوی کے طور پر قبول
کر کے اپنے گھر لے آتا تھا۔اس وقت بیوہ کی شادی اس
کے شوہر کے بھائی کے ساتھ ایک عام بات تھی۔ جو
یہودیوں کے یہاں اور دوسرے قدیم ملکوں میں بھی رائج
تھی ۔ غیر مردوں سے بھی شادی کرنے میں کوئی پریشانی
نہیں تھی''۔27ے

اس اقتباس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ویدک دور میں انسان فطری حقوق کی پاسداری کرتا تھا۔ عورت کو شوہر کے مرنے کے بعد یہ آزادی تھی کہ چاہے وہ دوسری شادی کرے یا پھر اکیلی ہی زندگی گزارے۔ بیوہ کو سماج میں عام عورتوں جیسا سلوک کیا جاتا تھا اُنہیں محرومی کی زندگی گذارنا نہیں پڑتی تھی۔جیسا کہ بعد کے ادوار میں بیوہ کے ساتھ برا سلوک کیا گیا۔ڈاکٹر آمنہ تحسین بیوہ کے موقف پر رگ وید کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''بیوہ کو اس دور میں دوبارہ شادی کی اجازت تھی یہ
طریقہ ویدک دور میں معمول کا طریقہ سمجھا جاتا تھا۔حالانکہ
دوبارہ شادی کرنے والی بیوہ عورت گرہنی (بیوی) کا مقام
حاصل کرنے کی آرزو نہیں کرسکتی تھی۔ وہ گھر کی دیکھ بھال
کرنے والی بن سکتی تھی۔ لفظ (پیرا پووا) کا استعمال ایسی

عورت کے لیے کیا جاتا تھا جس نے دوسرا شوہر کرلیا ہو اس
سے ثابت ہوتا ہے کہ بیواؤں کی دوبارہ شادی ہوتی تھی۔
رگ وید میں استعمال کیا ہوا لفظ ''ویدھیشو'' کا مطلب عورت
کا دوسرا شوہر ہوتا ہے اتھر ویدا میں پنر بھا کا حوالہ ملتا ہے
جس کے معنی دوبارہ شادی شدہ بیوہ کے ہیں''۔28

ہندوستان میں عہد وسطیٰ میں 'ستی' کی مذموم رسم کا ذکر ملتا ہے، اس رسم کے مطابق عورت کو اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ پہلو میں لٹا کر زندہ جلا دیا جاتا تھا' یہ رواج انگریز دور حکومت تک چلتا رہا' جس پر انگریز حکومت بھی انگشت بدنداں رہ گئی اور اس رسم پر پابندی عائد کی۔ ہندوستانی سماجی رہنماؤں نے بھی سماج کی اس برائی کے خاتمہ کے لیے تحریکیں چلائیں لیکن اس رسم کا ذکر ویدک دور میں نہیں ملتا۔ آمنہ تحسین لکھتی ہیں:

''رگ وید میں ستی یا بیواؤں کو زندہ جلا دینے کا کوئی
تذکرہ نہیں ملتا۔۔۔ بیوہ کو اپنے متوفی شوہر کے پہلو میں
لیٹ جانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ لیکن بعد میں اسے چتا سے
اتر جانے کیلیے کہا جاتا تھا اور دعا کی جاتی تھی کہ وہ ایک
خوشحال زندگی گزارے اور بچوں اور دولت سے لطف اندوز
ہو۔''29

ستی کی رسم ویدک دور کے کسی بھی مورخ کے ذریعہ مروج نہیں قرار دی گئی۔ اسی سلسلے میں محمد شہزاد شمس نے بھی اپنی تصنیف 'عورت اور سماج'' میں لکھا ہے:

''ستی کی مذموم رسم کا ذکر اس عہد میں نہیں ملتا''۔30

رگ وید کے آخری دور (1500 ق۔م۔ تا 500 ق۔م) ۔ میں عورتوں کی حیثیت کم سے کم تر

ہوگئی۔سماج میں ذات پات کی باقاعدہ گروہ بندی ہوگئی جولوگ مقدس کتابوں کا علم رکھتے ۔قربانیوں میں پروہت کے فرائض انجام دیتے تھے،وہ برہمن کہلانے لگے اور جولوگ جنگ کرتے اُنہیں 'چھتری' کہا جانے لگا تجارت پیشہ اور کاریگر کو ویشیہ کا نام دیا گیا اور مفتوح اور محکوم غلاموں اور صفائی کے کام انجام دینے والوں کو'شودر' کہا گیا۔

عورتوں کے حقوق ویدک عہد کے آخری دور میں سلب کر لیے گئے کیونکہ اس دور میں مرد نے زراعت ،حکومت اور سیاست پر اپنا اثر ورسوخ بڑھالیا تھا۔عورت کوصرف چار دیواری میں مقید، شوہر اور بچوں کی خدمت پر مامور کردیا گیا۔اس سے متعلق پروفیسر اندرا لکھتی ہیں:

'' عورت دھیرے دھیرے سماجی زندگی میں اپنا وقار
کھورہی تھی اور وہ مرد کی خواہشات کو پورا کرنے کا صرف
ایک آلہ ہوکر رہ گئی تھی۔۔۔ایک شوہر کا بیان ہے کہ خدا نے
اس کی بیوی کواس کی خدمت اورتسکین کے لیے دیا ہے''۔31

ویدک عہد کے آخری دور میں عورت کومرد کے مقابلہ میں دوسرا درجہ دیا گیا تھا۔انہیں تعلیمی میدان میں وہ آزادی میسر نہ تھی جو ویدک عہد کے اوائل میں حاصل تھی۔اس دور میں عورت کوگھر سے باہر جا کرتعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔انہیں تعلیم گاہوں میں بھیجنے کے بجائے والدین، بھائی یا گھر کے بارسوخ افراد سے تعلیم دینے کو بہتر سمجھا جانے لگا۔ رماشنکر ترپاٹھی لکھتے ہیں:

''(ویدی عہد کے آخری دور میں )عورتوں کا درجہ بھی سماج
میں ہر حیثیت سے اونچا نہیں تھا''۔32

مابعد ویدک دور میں عورت کے سماجی اور خاندانی مقام میں انحطاط پیدا ہوگیا جائداد کے حق سے

عورت محروم کر دی گئی تھی جائداد پر صرف مرد حق دار تھے ۔عورت اگر خود بھی کسی طرح کماتی تو وہ بھی مرد سر پرست کے حوالے کر دیتی ،اس عہد کے جائداد کے حقوق پر مؤرخ رماشنکر ترپاٹھی لکھتے ہیں:

''عورت نہ باپ کی جائداد کی وارث ہوسکتی تھی نہ اپنی
کسی جائداد کی مالک بن سکتی تھی اگر تھوڑا بہت کچھ کمائی تو وہ
باپ یا شوہر کے حق میں واگذاشت ہوجاتا''۔33

مابعد ویدک دور میں عورت کو تعلیم سے دور کر دیا گیا۔انہیں جائداد کے حق سے محروم کر دیا گیا۔اتنا ہی نہیں بیٹی کی پیدائش کو ہی بدنصیبی کی علامت سمجھا جانے لگا۔بیٹوں کی پیدائش کی خواہش کی جانے لگی کیونکہ وراثت ،حکومت کے جانشین کے لیے بیٹے کا حق مانا جانے لگا بیٹی کی حیثیت پر آمنہ تحسین مندرجہ ذیل اقتباس لکھتی ہیں:

'' بیوی ساتھ ہے۔ بیٹی پریشانی اور بیٹا فردوس
بریں کی روشنی'' 34

لڑکی کی پیدائش کے بارے میں ماشنکر ترپاٹھی نے بھی اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ:

''لڑکی کی ولادت بدنصیبی کی علامت سمجھی جاتی تھی''۔35

ویدک عہد کے بعد کے عہد کو اپنیشدوں کا عہد کہا جاتا ہے جہاں عورت کی سماجی حیثیت تبدریج کم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔اس دور میں عورت کے تمام تر حقوق بڑی حد تک محدود ہو گئے اور ان پر سماجی بندشیں لگادی گئیں۔اب وہ آزادانہ طور پر مذہبی رسوم کی ادائیگی نہیں کرسکتی تھیں۔عام طور پر عورتوں کے لیے وید اور مقدس کتابوں کا پڑھنا جرم قرار دیا گیا۔جس سے تعلیم یافتہ عورتوں کی حیثیت بھی سماج میں گرتی چلی گئی اور یہ بات بھی عام کر دی گئی تھی کہ:

''اگر کسی عورت نے کتاب چھو لی یا قلم پکڑلیا تو اس

کے خاندان پر مصیبت نازل ہوگی''۔36

سماج میں عورتوں کو حقیر نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اُنہیں جائداد میں صرف استری دھن یعنی وہ دولت جو اسے شادی کے وقت ماں باپ اسے تحفتہً دیتے تھے' اُسی پر اکتفا کرنا پڑتا تھا۔ رومیلا تھاپر اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں:

''عورت چونکہ موروثی جائداد سے محروم تھی، اس لیے
اس کا حق جائداد صرف استری دھن تک محدود تھا۔ استری
دھن کو کوئی دوسرا ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ لیکن اس دھن کے باوجود
عورت کو کوئی اقتصادی یا دیگر آزادی حاصل نہ ہوئی''۔37

لڑکیوں کی شادی بیاہ اور ازدواجی زندگی میں بھی عورت کی حیثیت میں تنزلی آ گئی تھی۔ مردوں کنے کئی بیویاں رکھنا شروع کر دیا تھے۔ جس کا باعث خاندانی وراثت میں دراڑ پڑ گئی۔

چونکہ تاریخی کتابوں میں بھی لکھا گیا ہے کہ:

''(ویدی عہد کے آخری دور میں) راجہ اور امراء کئی
شادیاں کرتے تھے جو یقیناً کنبے کے لیے کافی تکلیف دہ
ثابت ہوتی ہوں گی''۔38

رگ وید کے ابتدائی دور میں عورت کو جو مردوں کے مقابلہ میں مساویانہ اور ایک نظریے کے تحت مردوں سے بھی اونچا مقام دیا گیا تھا جو آگے چل کر انحطاط کا شکار ہو گیا۔ تعلیم کو نظر انداز کرنے، کمسنی میں شادی' لڑکیوں کی پیدائش کو بدنصیبی کی علامت سمجھنے' کی وجہ سے عورت کی حیثیت میں تنزلی پیدا ہو گئی۔ عورتوں کا مقام شودروں (نچلی ذات) کے مساوی سمجھا جانے لگا۔ گویا ویدک عہد کی ابتداء میں جو آزادیاں و مراعات عورت کو حاصل تھیں وہ بعد میں تقریباً ختم ہو گئیں۔

اپنیشد وں کے دور کے بعد(600ق ۔م ۔تا700ق ۔م )سوتروں، پرانوں اوررزمیہ داستانوں، رامائن' مہا بھارت کا دور آ تا ہے۔اس دور میں عورت کی سماجی حیثیت اور بدتر ہوگئی عورت کوملکیت کا حق نہیں تھا۔اس پر تعلیم کے دروازے بند ہو گئے ۔عورت کا مذہبی رسم و رواج میں داخلہ ممنوع ہو گیا ۔اس دور میں ا سمرتی کے قوانین لوگوں کے لئے ندائے خدا کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہندوستان میں منو کے قانون کو بہت سراہا گیااوران پر بلا تامل عمل کیا گیا۔منو کے اصول کے تحت عورت کوشودر ذات کے طبقے میں رکھا گیا،منو کے مطابق:

''عورت دنیا میں مرد کو ورغلاتی ہے۔اس لئے کوئی بھی
شخص اس کی محبت میں رہ کر محفوظ نہیں رہ سکتا۔۔۔عورت کو
اپنے بستر، گھر ، زیورات، ناپاک خواہشات، غصہ، بے
ایمانی، کینہ پروراور بداطواری سے ہی محبت ہوتی ہےاسی لئے
عورتوں کومقدس کتابیں پڑھنے کی اجازت نہیں ہے''۔39؎

منو نے عورت کوفتنہ پرور گردانا ہے،اسی لئے وہ عورت کی آزادی کے خلاف تھا۔کیلاش ناتھ شرما منو سمرتی کے خیالات کواس طرح لکھتے ہیں:

''سمرتیوں کے مصنفین نے عورتوں کوناسمجھ اوراخلاق و
کردار کا کمزور بتایاہے''۔40؎

منوسمرتی کے دور میں عورت کومرد کا خدمت گاراور ماتحت بنادیا گیامرد کے سہارے کے بغیر وہ زندگی نہیں گزارسکتی تھی۔اس کا تنہا وجود اپنی کفالت نہیں کرسکتا تھا۔اسی لئے بچپن اورنو جوانی میں اس کا محافظ اور پرورش کرنے والا باپ ہوتا ہے۔جوانی میں وہ شوہر کی دست نگر ہوتی ہےاور بڑھاپے میں اس کا لڑکا سہارا بنتا تھا،اسی سلسلے میں منولکھتا ہے:

''یہ بنیادی بات ہے کہ رات دن عورت کو مرد اور

خاندان کے ماتحت رہنا چاہیے۔بچپن میں باپ، جوانی میں
شوہراور بڑھاپے میں بیٹے کی ماتحتی میں ہو،ایک عورت کو
کبھی بھی آزادنہیں چھوڑا جاسکتا ہے''۔41

مشہور مؤرخ رماشنکر تر پاٹھی نے منو کے لکھے گئے اشعار کے حوالے سے عورت کی آزادی کو سلب کرنے کی بات لکھی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''۔۔۔۔شعر میں منو کہتا ہے کہ،عورتیں مردوں کو گمراہ
کرنے کا ذریعہ ہیں۔۔۔۔عورت کبھی آزاد خودمختار زندگی
نہیں گزار سکتی۔اسے تو زندگی بھر کسی نہ کسی کی نگرانی اور
سر پرستی میں رہنا ہوتا ہے بچپن میں باپ کی جوانی میں شوہر
کی،اور بڑھاپے میں بیٹوں کی''۔42

کم عمری کی شادیوں کا رواج اپنیشدوں کے دور میں ہی شروع ہوگیا تھا۔منو اسمرتی میں کم عمر کی شادیوں کو قانونی حق دے دیا گیا جیسا کہ تاریخی کتابوں سے واضح ہے کہ:

''وہ (منو) بارہ سال یا آٹھ سال کی عمر میں لڑکی کی
شادی کو جائز قرار دیتے ہیں''۔43

منوسمرتی میں کم عمری کی شادیوں کے رواج کے متعلق آمنہ تحسین نے بھی شادی کی عمر آٹھ سال ہی لکھی ہے لیکن وہ کشتریوں کے پاس شادی کی عمر کو کچھ حد تک یعنی 14 یا 15 سال لکھتی ہیں انہوں نے اپنی تصنیف ''مطالعات نسواں''میں منو کے حوالے سے لکھا ہے:

''اس دور (منوسمرتی دور) میں شادی کی عمر آٹھ سال
مقرر کی گئی۔۔۔مذہبی رہنماؤں کا خیال تھا کہ اگر لڑکی کی عمر

آٹھ سال سے تجاوز کر جائے تو والدین گنہگار ہوں گے۔
صرف کشتری خاندانوں میں لڑکی کی شادی 14 یا 15 سال
کی عمر میں کی جاتی تھی''۔ 44

منو نے عورت کو باپ اور شوہر کی حفاظت میں رہنے پر زور دیا۔اس کی نظر میں عورت ایک ایسی مخلوق ہے جس کے پاس نہ تو غور وفکر کرنے کے لئے دماغ ہے اور نہ ہی وہ کسی قسم کے جذبات واحساسات سے متاثر ہوتی ہے،منو کے مطابق:

''منو کے قانون کے مطابق،عورتیں چونکہ تلون مزاج
ہوتی ہیں اس لئے انہیں گواہ کی حیثیت سے پیش نہیں کیا جا
سکتا تھا''۔45

منو نے عورت کو حقیر و ذلیل پیش کرنے کے لیے اُسے جھوٹا بھی کہا ہے:

''جھوٹ بولنا عورتوں کا ذاتی خلاصہ ہے''۔46

منو اسمرتی کے دور میں عورت کو کوئی حق نہیں تھا کہ وہ شوہر سے علاحدگی اختیار کرے۔لیکن مرد کو اختیار تھا کہ عورت اگر صرف لڑکیاں ہی پیدا کر رہی ہو تو وہ اُسے طلاق دے سکتا تھا،منو کے مطابق:

''اگر عورت بانجھ ہوتی ، یا صرف لڑکیاں پیدا کرتی یا
شوہر کے ساتھ بے وفائی کا برتاؤ کرتی تو شوہر اُسے طلاق
دے سکتا تھا''۔47

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ بیٹیوں کی پیدائش کی خواہش نہیں کی جاتی تھی۔منو نے عورت کو گوشہ نشینی اور پرہیز گاری کی زندگی میسر کرنے کی پرزور حمایت کی تھی۔اس نے لڑکیوں کو جنیئو پہننے سے محروم کر دیا تھا۔ ویدک عہد میں جس طرح سے برہمچاریوں کو دھاگے کے عمل سے گزارا جاتا تھا، جسے جینئو کہتے ہیں۔یہی عمل

برہم چرنی بھی کرسکتی تھی۔اس طرح ویدک عہد میں عورتوں کے خاص طبقے میں جنئو کا رواج تھا۔منو جب ایک ہندو مصلح کی طرح ہندوستان میں ابھرا تو اس نے جینئو صرف مردوں کے لئے مخصوص کردیا۔اس عہد میں منو سمرتی کے اصول وقوانین کو نہ صرف اپنایا گیا بلکہ اس پر سختی سے عمل کیا گیا۔وہ بیوہ کی شادی کی اجازت نہیں دیا:

''منو عقد بیوگان اور نیوگ (صلہ رحمی کی شادی) کے

خلاف ہیں''۔48

منو ایک عورت کو بیٹی کے روپ میں باپ کی فرمانبردار اور بیوی کے روپ میں شوہر کی فرمانبردار اور اگر شوہر کی موت واقع ہوجائے تو شوہر کے ہی نام پر زندگی گزارنے کا حکم دیتا ہے:

''بیوی کو شوہر کی وفاداری کرنی چاہیئے ، وہ کوئی ایسی

حرکت نہ کرے جس سے اس کا شوہر ناخوش ہوجائے اگر

شوہر مرجائے تو دوسرے شوہر کے بارے میں سوچے بھی

نہیں۔۔۔یہاں تک کہ اگر اس کا شوہر خراب ہو،اور کہیں

اور سے عیاشی کر کے آیا ہو، پھر بھی اسے ایک سچی بیوی کی

طرح اپنے شوہر کو خدا کی طرح پوجا کرنی چاہیئے''۔49

منو،مردوں کو عورت کی غلطی پر پیٹنے کی بھی اجازت دیتا ہے،جیسا کہ اس نے کہا

''اگر بیوی کسی طرح کوئی غلطی کرے تو اسے رسی سے

باندھ کر چھڑی سے پیٹنا چاہتے ہیں''۔50

منوسمرتی دور میں برہمن ذات کا عروج عورتوں کے موقف کا مخالف بن گیا۔اس دور کے ہندو قانون سازوں نے بیواؤں پر چند فرائض عائد کردئے جو اپنے شوہر کی چتا پر نہیں چڑھتی تھیں اور زندہ رہنا چاہتی تھیں ایسی بیوہ عورتوں کے لئے سخت قانون بنائے گئے تھے،جن پر وہ زندگی بھر عمل کرتیں۔انہیں پرہیز

گاری، فاقہ کشی اور زندگی کی دوسری لذتوں سے دور رکھا گیا۔ بیوہ کی زندگی کے متعلق ہندو قانون ساز منو کہتا ہے:

''1۔اس کی (بیوہ) موت تک اسے مصیبتوں پر صبر کرنا چاہئے۔ اپنے آپ پر قابو رکھنا چاہیے، باعصمت رہنا چاہئیے اور انتہائی بہترین فرض انجام دینا چاہئے۔

2۔اسے (بیوہ) اپنی خوشی سے اپنے جسم کی پرورش خالص، پھولوں، جڑوں اور پھلوں کے ذریعہ کرنی چاہیے۔ اسے اپنے شوہر کی موت کے بعد دوسرے مرد کا نام نہیں لینا چاہیے۔

3 ۔منو پھر کہتا ہے کہ ایک نیک بیوی وہ ہے جو اپنے شوہر کی موت کے بعد مسلسل باعصمت رہے۔ چاہے اسے بیٹا نہ بھی ہو۔تو دوسرے پاکیزہ مردوں کی طرح جنت میں جاتی ہے''۔51؎

اس دور میں غیر منصفانہ،فرسودہ رواج جیسے بچپن کی شادی' ایک سے زیادہ بیویوں کا رواج' تعلیم کی ممانعت، مذہبی رسوم پر پابندی کی وجہ سے عورتوں کی حیثیت میں کمی واقع ہوئی' اُنہیں نچلی ذات یعنی شودروں کے برابر موقف دیا گیا۔

اس (منواسمرتی) کے دور میں عورتوں کے مقام وموقف کے بارے میں متضاد نظریے ملتے ہیں۔ ابتدائی دور کے چند ارباب اختیار عورتوں کو نیکی کا مسکن قرار دیتے ہیں۔ وہ ان کی دیوی کی حیثیت سے پوجا کرنے کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ مندرجہ ذیل حوالوں میں یہ ذکر ملتا ہے:

''جہاں عورتوں کی پرستش (عزت) کی جاتی ہے وہاں دیوتاؤں کی برکتیں نازل ہوتی رہتی ہیں۔لیکن جہاں ان کی

عزت نہیں کی جاتی وہاں تمام کام بے نتیجہ ہو کر

رہ جاتے ہیں''۔ 52؎

منو کے بیان کے مطابق عورت کا احترام ضروری ہے:

''جہاں عورتوں کا احترام کیا جاتا ہے وہاں دیوتا

رہتے ہیں''۔53؎

منو نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ:

'' ایک اچاریہ اپنی بزرگی اور شان و جلال پر دس

اپدھیائے سے سبقت رکھتا ہے جب کہ ایک باپ سو اچاریہ

سے سبقت رکھتا ہے۔لیکن ایک ماں ہزار باپ سے بھی زیادہ

سبقت رکھتی ہے''۔54؎

ان اقتباسات سے یہ ظاہر ہے کہ منو نے عورت کو عزت واحترام کی بھی تائید کی جہاں ایک عورت کو دیوی کی طرح پرستش کرنے کی بات کی وہیں عورت کو جھوٹا بھی کہا' منو نے ماں کے روپ میں عورت کو محترم اور پاکباز اور عزت کے قابل کہا ہے لیکن تمام قوانین کے منجملہ عورتوں کے متعلق منو کے نظریات اچھے نہیں تھے۔

ہندو دھرم کی مقدس مذہبی کتابوں میں بھی عورت کو وہ عزت واحترام نہیں دیا گیا جو مردوں کو حاصل تھا۔مہابھارت ، رامائن جیسی اہم اور مقدس کتابوں میں بھی عورت کو کمتر کر کے پیش کیا گیا۔رامائن مہابھارت کے دور کو رزمیہ دور سے موسوم کیا جاتا ہے۔

مہابھارت میں دھرت راشٹر کے سو (۱۰۰) بیٹوں کوروں اور پانچ پانڈوؤں کے درمیان عظیم الشان مجادلہ کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔اس رزمیہ نظم میں عورت کو ایک شئے کے طور پر پیش کیا گیا ہے رماشنکر ترپاٹھی لکھتے ہیں:

''درجودھن نے یدھشٹر کو بہلا پھسلا کر جوا کھیلنے پر مجبور

کیا۔ بازی میں یدھشٹر اپنا سب کچھ ہار گیا۔ اپنا راج، اپنی
بیوی اور اپنی عزت''۔55

رزمیہ دور میں راجہ مہاراجہ عیش و عشرت کی زندگی گزارنے لگے، بادشاہوں کے دربار میں ناچ گانا عام ہو گیا دربار کی کسی بھی تقریب یا پھر راجہ کی تاجپوشی کی تقریب میں عورتوں کو ناچ گانے پر مجبور کیا جاتا تھا اس سلسلے میں رما شنکر ترپاٹھی لکھتے ہیں:

''راجا شان و شوکت کی زندگی گذارتا تھا اور ناچنے والی
لڑکیاں اور معمولی کردار کی عورتیں اس کے ملازمین اور
خدمت گاروں میں شامل ہوتی تھیں''۔56

رزمیہ دور میں ذات پات کی بنیادیں مضبوط ہو چکی تھیں۔ سماج میں سب سے اونچا درجہ امراء اور برہمنوں کا تھا۔ عورتوں کی حیثیت ویدک عہد کے مقابلہ میں انحطاط پذیر تھی۔ عورت بیوہ ہو جاتی تو اسے صرف منحوس اور مکروہ ہی نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے اپنے متوفی شوہر کی جلتی چتا پر بیٹھ کر جلنے کا عملی مظاہرہ بھی کرنا پڑتا تھا۔

ہندوستانی سماج میں عورت کی مظلومی اور بے بسی کا شرمناک پہلو اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ شوہر کی چتا پر نذرِ آتش ہونے کے لئے نہ صرف مجبور کی جاتی تھی بلکہ بیواؤں کو یہ سمجھایا جاتا تھا کہ اس کی فلاح اور عزت ستی ہو جانے میں پوشیدہ ہے۔ جیسا کہ ''ہندوستان کی قدیم تاریخ'' میں لکھا ہے:

''(رزمیہ دور میں) رسم ستی کا ذکر جا بجا ملتا ہے اور چند
زوجیت رائج دکھائی دیتی ہے''۔57

ستی کی رسم کا ذکر مذہبی کتابوں میں بھی ملتا ہے:

''مہابھارت'' میں ایک اور ''رامائن'' میں تین ستی ہونے

کا ثبوت ملتا ہے''۔58؎

رزمیہ دور میں ستی کی رسم کو بہت بڑھاوا ملا۔ اگر کسی وجہ سے عورت متوفی کے شوہر کی جلتی چتا پر خود کو نہیں جلاتی تھی تو اُس عورت کو سماج میں گری ہوئی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ایسی عورت کا سر منڈا دیا جاتا تھا کہ وہ بدصورت نظر آئے اور اس کی طرف کوئی مرد نہ دیکھے۔ اسے بدقسمت اور منحوس سمجھا جاتا اور اسے کسی بھی مذہبی اور غیر مذہبی رسوم میں شرکت کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں چینی سیاح ہیون سانگ نے اپنے مشاہدے کی بنیاد پر لکھا ہے کہ:

''اس نے کسی عورت کو دوسری شادی کرتے ہوئے نہیں
دیکھا۔۔۔ستی کا رواج نہ صرف زور پکڑ گیا تھا بلکہ اس کی
قصیدہ خوانی بھی ہونے لگی تھی''۔59؎

ستی اور لڑکیوں کی خرید وفروخت کا رواج سکندر کے حملے کے وقت بھی موجود تھا۔ سیاحوں جیسے اسٹرالومیگا ستھنیز اور ڈیوڈاروس، جو سکندر کے ہمراہ تھے اس رواج کی مذمت کی انہوں نے کہا کہ:

''کھتائین قبیلہ میں اور دوسرے قبیلوں میں بھی ستی کا
رواج پایا جاتا تھا۔یعنی بیوہ عورتیں اپنے شوہر کی چتا پر اپنے
کو جلا دیتی تھیں۔ٹکسلا میں یونانیوں نے یہ عجیب وغریب
رسم دیکھی کہ غریب ماں باپ اپنی لڑکیوں کو بازار میں لاکر
بیچ ڈالتے تھے''۔ 60؎

غرض کہ عورتوں کے لیے سماج میں کوئی معزز مقام نہیں تھا۔ ان کی سماجی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جہاں ان کے ساتھ ظلم و بربریت کا مظاہرہ نہ کیا گیا ہو۔لیکن یہ بے بس عورتیں مردوں کی حاکمانہ بالادستی اور جابرانہ اقتدار کے سائے میں رہ کر زندگی بسر کرتی رہیں حتیٰ کہ اشوک اعظم جو ہندوستان کی تاریخ کا عظیم بادشاہ

گزرا ہے جس نے بڑی جنگجو فوج کے ساتھ کلنگا پر فتح حاصل کی لیکن جنگ کی خونریزی تباہی و بربادی کو دیکھ کر جنگ سے کنارہ کشی اختیار کی اور اپنی طویل سلطنت میں امن وامان قائم کیا اس کے دور میں بھی عورتوں کو مردوں کے مساوی مقام حاصل نہیں ہوا۔ تاریخی حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ

''چٹانی فرمان نمبر پانچ میں حرم (اور دھن) کے حوالے
ثابت کرتے ہیں کہ عورتوں کو تنہا رکھنا اور ان کی آزادی پر
پابندی لگانا اس وقت کوئی انوکھی بات نہ تھی''۔ 61

اشوک اعظم کے بعد کے دور میں عورت کی حیثیت میں نمایاں فرق نہیں آیا بلکہ ہندو سماج ذات پات کے نظام میں تقسیم ہو گیا۔

ہندوستان کی تاریخ میں مسلم حکمراں کی آمد اور ان کے لائے ہوئے مذہب، رسم و راج نے ہندوستان کی تہذیب میں بہت سی تبدیلیاں لائیں لیکن عورت کے موقف میں خاطر خواہ اضافہ نہ کر سکے۔

عہد وسطیٰ میں ہندوستانی معاشرہ میں عورتوں کی حالت اور ان کے فرائض منصبی واضح طور پر کمتر سمجھے جاتے تھے۔ ان کا کام مردوں کی خدمت کرنا تھا اور زندگی کے میدان عمل میں انہیں مردوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ اور سماج کے ضوابط اور طور طریقوں نے اس پر ذہنی کم مائیگی کی مہر ثبت کر دی تھی لڑکیوں کی پیدائش کو بدنصیبی سمجھنا عام بات تھی۔ کنور محمد اشراف مشہور مؤرخ لکھتے ہیں:

''پیدائش کے وقت اسے (عورت) ناخواندہ مہمان
تصور کیا جاتا تھا کیونکہ ہندوؤں کے مذہبی عقائد کی رو سے
بدنصیب بیٹی باپ کے گناہوں کا کفارہ ادا نہیں کر سکتی۔ اسی وجہ
سے بعض اقوام میں اسے بچپن میں قتل کر دیا جاتا تھا''۔ 62

عہد وسطیٰ میں بیٹی کی پیدائش کو نامبارک سمجھا جاتا اور بچپن میں ہی اس کو شادی کر دی جاتی، شادی

کے لئے لڑکی کی مرضی جاننا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔اور طلاق حاصل کرنے کا بھی عورت کوئی حق حاصل نہیں تھا چونکہ ہندوستانی رواج کے مطابق شادی ایک بندھن ہے جو شوہر کے ساتھ بیوی کو بھی ستی ہوکر نبھانا پڑتا ہے اسی سلسلے میں کنو محمد اشرف لکھتے ہیں:

''اسے (عورت) کبھی نہ ٹوٹنے والے رشتہ میں منسلک کر کے ایک عدد شوہر کے سپرد کردیا جاتا تھا۔۔۔کیوں کہ عموماً ہندوؤں کے ازدواجی قانون میں طلاق کی کوئی نہیں جانتا۔ کیونکہ ہندوؤں میں شادی شوہر اور بیوی کے درمیان ایک ایسا تعلق ہے جو کبھی نہیں ٹوٹتا''۔ 63

اس طرح پیدائش سے موت تک عورت کی زندگی انتہائی ناخوشگوار ہوتی تھی انہیں قوت واقتدار کے ہر موقع سے محروم رکھا جاتا تھا۔انہیں مذہبی رسم ورواج میں حصہ لینے کی اجازت نہیں تھی۔ تاریخ میں اس متعلق لکھا گیا ہے:

''وہ مذہبی میدان میں بھی کسی باوقار مقام سے محروم رہتی تھیں۔ جیسا کہ میرا بائی۔۔۔کو جسے بندرابن کے گوسائیں نے اپنے سامنے آنے کی اجازت نہیں دی تھی''۔64

کنور محمد اشرف کئی تاریخی کتابوں کے تجزیاتی مطالعہ کے ذریعہ ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں ہندو سماج کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''ہندوؤں کے عقائد کے مطابق ایک لڑکے کو جنم دینا عورت کا اہم ترین فرض تھا اور اگر اس کے بیٹا ہوجاتا تھا تو

لوگ اس کی عزت کرنے لگتے تھے اور اس کی اچھی دیکھ
بھال بھی ہوتی تھی۔۔۔۔ دیگر معاملات میں ہندوستانی
عورت گھر اور گھریلو امور تک ہی محدود رہتی تھی۔ وہ زندگی
بھر خود کو اپنے شوہر کی وفادار بیوی ثابت کرنے اور اسے
خوش رکھنے میں مصروف رہتی تھی اس کے برخلاف نا قابل
بھروسہ تصور کیا جاتا تھا‘‘۔65

اس دور میں مسلمانوں پر دوسرے مما لک جیسے ترکی اور ایران کی ثقافت کا گہرا اثر تھا اس کے علاوہ ہندوؤں کے درمیان تہذیب و ثقافت اور رسم و رواج کے تبادلوں نے عورت کی حیثیت کمتر کر دیا تھا۔ عورت کی پاکدامنی کو بے حد اہمیت دی جانے لگی ۔ کئی بیویاں رکھنے کا رواج عام ہو گیا خاص طور سے عہد وسطیٰ میں کئی بیویاں رکھنا سماجی بڑائی کی شان تھی۔ اس لیے بادشاہ و امراء کئی بیویاں رکھتے تھے نچلے طبقہ میں معاشی بدحالی کی وجہ سے یہ رواج ترقی نہ کر سکا لیکن ان کی بھی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ کئی شادیاں کریں۔ اسی سلسلے میں کنو محمد اشرف لکھتے ہیں:

’’عورتوں سے متعلق مسلمانوں کی روایات ہر ملک میں
جداگانہ تھیں۔ ترک عموماً اپنی عورتوں کو اچھی خاصی آزادی
دیتے تھے، ایرانی عورت ہندوستانی عورت کے معاملے میں
نسبتاً بہتر تھی ، ہندوستان میں مسلمانوں نے قدیم ایران
روایات پر عمل کیا جس کی وجہ سے عورت کو کم تر تصور کیا
جانے لگا۔ عام شہوت پرستی اور جنسی بے راہ روی کی بنا پر غیر
صحت مندانہ طرز فکر کو فروغ ملا۔ عورت کی پاکدامنی کو مبالغہ

آمیز حد تک اہمیت دی گئی اور تقریباً اسی حد تک مردوں کے

پاکدامن نہ ہونے کی ہمت افزائی کی گئی''۔66

امیر خسرو نے بھی عورت کی پاکدامنی کو غیر معمولی اہمیت دی ہے: عورت کی پاک دامنی کے سلسلے میں امیر خسرو کے مشاہدات جنہیں مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے:

''ایک لڑکی سے جس کی پاک بازی پر معمولی سے بھی

شبہات ہوں کوئی بھی معزز آدمی شادی نہ کریگا چاہے وہ

الزامات بعد میں بے بنیاد ثابت ہوجائیں۔ شاعر نے اس

لئے ہر ایمان دار لڑکی کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے

علاوہ کسی کی پیار بھری باتوں میں آنے کے بجائے اپنی جان

دے دے''۔67

ان چند حوالوں سے ہندوستانی عورت کی معاشرت اور روایات کے پس منظر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے مجموعی طور پر چند ایک عورتوں کو چھوڑ کر عورتوں کا مقام انحطاط پذیر تھا۔ بادشاہ جب جنگ میں فتح یاب ہوتے تو غلاموں میں عورتیں مرد ہوتے لیکن ان غلاموں میں مردوں کا کام محنت ومشقت کا ہوتا تھا اور عورتوں کو گھریلو کام کاج پر معمور کیا جاتا تھا فیروز تغلق جب بنگال فتح کیا تو اُس نے دوسرے تمام فرامین کے سے یہ فرمان بھی جاری کیا تھا کہ عورتوں پر ظلم نہ کیا جائے:

''ہر حالت میں عورتوں کی خوں ریزی بہت ہی قابل

نفرت جرم تصور کی جاتی تھیں۔68

فیروز تغلق جب بنگال کے سلطان الیاس شاہ کی سلطنت پر حملے کرنے کا جواز تلاش کیا تھا۔ اس کی رائے میں دیگر جرائم کے علاوہ موخرالذکر پر خواتین کے قتل کرنے کا جرم بھی عائد تھا۔ فیروز تغلق بڑے عقیدت

مندانہ جذبات کے ساتھ دعویٰ کرتا ہے کہ

''کسی بھی عقیدے اور رسم میں عورت کا قتل جائز نہیں
ہے خواہ عورت کافر ہی کیوں نہ ہو۔'' 69؎

عہد وسطیٰ میں عورتوں کی ذہنی ترقی مختلف طبقات میں مختلف ہوتی تھی۔ دیہاتوں میں جہاں دیہی مسائل دولت کا ایک جز ہوتا ہے وہاں پر عورت کی تعلیمی ترقی کی کوئی گنجائش نہ تھی وہ کھیتوں میں کسانوں کی طرح کام کرتی اور گھر کی ذمہ داری اٹھاتی۔ گھر کے کام کے علاوہ بچوں کی پرورش بھی عورت ہی کرتی تھی۔ ہندوستانی معاشرہ عہد وسطی کے سماجی حالات میں لکھا ہے:

''غریب طبقہ کی کسان عورتیں گھریلو کھیتی باڑی کے کاموں
اور بچوں میں اس قدر مصروف رہتی تھیں کہ انھیں ذہنی مشغلے یا
تفریح کا موقع کم ہی میسر آتا تھا۔ ان کا ذہنی نشوونما ایک بہت
ہی پست معیار سے آگے نہ بڑھتا تھا''۔ 70؎

دیہاتوں کی عورتوں کے برخلاف اعلیٰ طبقہ کی عورتیں علم و ہنر سیکھتیں۔ عہد وسطیٰ میں جنگیں عام تھیں جس کی وجہ سے بادشاہ اور امرا کی خواتین کو تعلیم و تربیت دی جاتی تا کہ وقت ضرورت یہ اپنا دفاع کر سکے۔ ہمیں تاریخی حقائق سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ

''اعلیٰ طبقے کی خواتین ایک مہم جویانہ اور غیر محفوظ زندگی
بسر کرتی تھیں۔ اس کی وجہ سے وہ بہت سے علوم و فنون سیکھنے
پر مجبور تھیں۔ دیول رانی، روپ متی اور میرابائی ہندو تہذیب
کی اچھی مثالیں ہیں''۔ 71؎

''مسلمان عورتوں کی بھی کئی مثالیں ہیں جنھوں نے

حکومت پانے اوراس کو چلانے فن مہارت رکھتی تھیں جیسے:

''سلطان رضیہ کے دہلی میں تخت نشین ہونے سے ثابت
ہوتا ہے کہ مسلمان امراء اور شاہی خاندان کے افراد اپنی
خواتین کو بہترین تعلیم وتربیت سے بے بہرہ نہیں
رکھتے تھے''۔72؎

مغلوں کے دور میں اعلیٰ طبقہ کی عورتوں کو تعلیم و تربیت کی آزادی کے ساتھ ساتھ تفریح کا بھی موقع دیا جاتا تھا۔عورتیں تیر چلانا،تلوار بازی،غلیل کے استعمال سے واقف تھیں اور مرد دوستوں، رشتہ داروں سے ملتی تھیں۔اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو۔

''مغلوں کے دور میں ہندوستانی امراء میں ایک صحت
مند روایت شروع ہوئی۔گلبدن بیگم کا بیان ہے کہ ہمایوں
کے شاہی حرم کی خواتین اپنے مرد دوستوں مہمانوں کے
ساتھ آزادی سے ملتی جلتی تھیں۔بعض اوقات یہ خواتین
مردانہ لباس زیب تن کر کے باہر جاتی تھیں۔پولو کھیلتی تھیں
اور موسیقی سے دل بہلاتی تھیں۔وہ غلیل کے استعمال اور
دیگر فنون لطیفہ کی بھی ماہر تھیں۔مقابلتاً زیادہ آزادی نے
مغل خواتین مین عزت اور خودداری کا ایک احساس پید
اکردیا تھا اور مشہور مغل شہنشاہوں کی مائیں اپنے اپنے
میدانوں میں اتنی ہی فنکارانہ صلاحیتوں کی حامل تھیں جتنے
ان کے بیٹے اپنے میدانوں میں تھے۔کمتر درجے کی
خواتین کے سلسلہ میں مورخین تقریباً خاموش ہیں۔ہاں اتنا

> اندازضرور ہوتا ہے کہ ان کی زندگی بھی اعلیٰ طبقے کی خواتین
> سے مشابہ تھی۔ بعض داشتائیں بہت سلیقہ شعار اور
> ہنرمند تھیں''۔73

مغل حکمرانوں نے مرد ہو کہ عورت دونوں کی جرأت مندی کی حوصلہ افزائی کی ہے عورتوں کی ہمت اور حوصلہ مندی کی مثال مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتی ہے۔

> ''مثال کے طور پر دیکھئے اکبر کی والدہ وحیدہ بانو کا واقعہ:
> بیان کیا جاتا ہے کہ جب ہمایوں نے اس سے شادی کی
> پیشکش کی تو اس خاتون نے اس تجویز کو ماننے سے انکار
> کردیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ کسی ایسے مرد سے شادی نہیں کرنا
> چاہتی تھی جس کا اپنا سماجی مرتبہ اس کے سماجی مرتبہ سے
> بہت زیادہ بلند ہو اس نے کہا ''میں ایسے آدمی سے شادی
> کرنا پسند کروں گی جس کے گریبان تک میرا ہاتھ پہنچ سکے نہ
> کہ ایسے آدمی کے ساتھ کہ جس کے قدموں تک میری
> رسائی نہ ہو۔ یعنی اس کا اصرار اس بات پر تھا کہ وہ ہم رتبہ
> فرد سے شادی کرے اور اس سلسلے میں نور جہاں اور ممتاز محل
> کی مثالیں تعارف کی محتاج نہیں ہے''۔74

اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ عہد وسطیٰ میں ہندو ہو یا مسلمان دونوں مذاہب کی شہزادیوں اور امیرزادیوں سے قطع نظر عورتیں مظلوم و محکوم تھیں۔ تعلیم صرف امیرزادیوں تک ہی محدود تھی حالانکہ مغل حکمرانوں کے خاندانوں میں ایسی کئی خواتین تھیں جنھوں نے اپنی علمی اور سیاسی صلاحیتوں کا لوہا منوایا تھا۔

اب ہم ہندوستان میں پردے کے رواج اور ارتقاء پر ایک نظر ڈالیں۔ پردہ کا رواج قدیم دور سے ہندوستان میں پایا جاتا تھا لیکن مسلمانوں کی آمد سے پردے کا رواج عام ہوتا گیا۔

''پردہ ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کے معنی ہیں حجاب یا
کسی چیز کو چھپانا۔ عام طور پر لفظ نقاب کے لیے استعمال
ہوتا ہے۔عورت کے لیے یہ اصطلاح اس کے کسی جداگانہ
عمارت یا عمارت کے کسی جداگانہ حصے میں رہنے پر دلالت
کرتی ہے۔ جسے دوسرے الفاظ میں حرم کہا جاتا ہے''۔75

ہندوستان میں عام خیال ہے کہ عورتوں کی ترقی اور سماجی حیثیت مین اتار کا سبب پردہ ہے۔ بقول رومیلا تھاپر کہ:

''ابتدائی صدیوں میں عزت دار گھروں کی خواتین پردہ
کرنے لگی تھیں اور اسلام کے رائج پڑنے سے عورت کی
گوشہ نشینی کو اور بھی بڑھا دیا''۔76

لیکن دوسرے مورخوں نے پردہ کو عورت کے فطری عمل کے طور پر پیش کیا ہے چوں کہ عورت فطرتاً شرمیلی اور الگ تھلگ رہنا پسند کرتی ہے اس لیے وہ پوری زندگی حرم میں رہنے کو زیادہ محفوظ اور آرام دہ سمجھتی۔ عہد وسطیٰ میں کسان عورتوں اور اعلیٰ طبقہ کی عورتیں خصوصی نقاب استعمال نہیں کرتیں تھیں اس سلسلے مٰں کنور محمد اشرف لکھتے ہیں

''عام کسان عورتیں کوئی پردہ یا خصوصی نقاب استعمال
نہیں کرتی تھی اور نہ ہی الگ تھلگ رہتی تھیں جب وہ کسی
اجنبی کے پاس سے گزرتیں تو وہ اپنی ساڑی یا سر کے لباس کا

پلو تھوڑ سا اپنے چہرے کے اوپر کر لیتی تھیں۔ اعلیٰ طبقہ کی
خواتین اس حد تک ہی پردہ کرتی تھیں جس حد تک کہ ان
کے ذرائع اجازت دیتے تھے کیوں کہ وہ گھریلو کاموں سے
آزاد تھیں۔ اعلیٰ طبقہ میں پردہ شرافت کی دلیل تصور
کیا جاتا ہے''۔ 77؎

مسلم حکمرانوں نے پردہ کی سخت پابندی پر کوئی حکم یا فرمان جاری نہیں کیا اور نہ ہی عورتوں کو شہر میں نقل وحرکت پر پابندی عائد کی۔ فیروز شاہ تغلق سے پہلے عورتوں کو ہر جگہ آنے جانے کی عام اجازت تھی جس ذکر اس طرح ہے۔

''فیروز شاہ تغلق سے پیشتر ملک کی رعایا پر پردہ لاگو
کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی''۔ 78؎

مغل دور میں ہندو سماج میں بیٹی کا مقام اقل ترین حد تک پہنچ گیا تھا۔ اس دور میں بچپن کی شادی سماجی زندگی کا مقبول عام رواج تھا بیٹیاں نو یا دس سال کی عمر تک بیاہ دی جاتیں تھیں جیسا کہ مورخ کنور محمد اشرف نے لکھا ہے:

''شادی کے لیے عمر کی کوئی خاص حد مقرر نہ تھی۔
ہندو مسلمان دونون کم سنی کی شادی کو بہتر خیال کرتے تھے،
(جب نانک کی شادی ہوئی اس کی عمر اس وقت 14 سال
تھی)۔ حالاں کہ اکبر نے ان معاملات میں دخل اندازی
کی خواہش کی اور اس نے شادی کے لیے کم از کم عمر لڑکے کی
16 اور لڑکی کی 14 سال مقرر کی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس

کے ان قوانین پر کس حد تک عمل ہوا''۔ 79

عہد وسطیٰ میں شادی کی تمام ذمہ داریاں ماں باپ پوری کرتے تھے۔ شادی کے وقت والدین کو بہت سے نازک اور پیچیدہ مسائل سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ مثلاً خاندان کا رتبہ، آبائی رسوم وروایات اور فریقین کی سماجی عزت، والدین اپنی ذاتی ذمہ داریاں انتہائی احتیاط اور پوری تفصیل سے کرتے تھے۔ شادی میں جہیز بھی دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ تاریخی کتب میں لکھا ہے:

''بڑے پیانے پر جہیز دلہن کے ساتھ دینا ہوتا تھا۔ بعض
حالات میں دلہا کو چند لونڈیاں بھی دی جاتی تھیں جو اس کی
ملکیت ہو جاتی تھیں۔ 80

زندگی کا نقطہ انقلاب فرد کی موت ہوتی ہے۔ عہد وسطی میں یہ تصور عام تھا کہ موت سے اس فرد کا وجود ختم نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ ایک زندگی سے دوسری زندگی میں داخل ہوتا ہے۔ موت کے بعد بڑی دلچسپ رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ مسلمانوں میں زیادہ رسوم کی ادائیگی نہیں کی جاتی تھی صرف متوفی کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے احباب واعزا بڑی تعداد میں جمع ہو کر قرآن خوانی کرتے تھے۔

ہندو رسم ستی کسی مرد کی موت پر اسکی بیوی کے لیے آفت ناگہانی ثابت ہوتی چونکہ ستی کی رسم کے مطابق شوہر کی موت کے بعد بیوی بھی خود کو اپنے شوہر کی چتا کے ساتھ جل کر موت کی آغوش میں چلی جاتی ہے۔

کسی بیوی کا شوہر کی لاش کے ساتھ جلنے کا بیان بہت تکلیف دہ تھا۔ عورت کے لے یہ رسم ادا کرنا بہت خوفناک تھا۔ ابن بطوطہ ایسی عورت کو ستی ہوتے دیکھا تھا جس کا شوہر دور دراز مقام پر جنگ میں شہید ہو چکا تھا۔ ابن بطوطہ نے آنکھوں دیکھا حال اس طرح لکھا ہے:

''ایسی عوت جس کے شوہر دور دراز مقام پر جنگ میں

شہید ہو چکے تھے۔ ان حالات میں بیوی اپنے شوہر کی موت کی خبر سن کر غسل کرتی۔ اسکے بعد اپنے بہترین کپڑے اور زیورات زیب تن کرتی۔ جلد ہی اسے ایک جلوس کی شکل میں شمشان گھاٹ کی طرف لے جایا جاتا۔ برہمن اور دیگر اعزا جلوس کے ہمراہ چلتے اور مستقبل کی بہترین زندگی پر اسے انتہائی مبارکباد دی جاتی۔ وہ عورت اپنے دائیں ہاتھ میں ایک کھوپرا اور بائیں ہاتھ میں ایک آئینہ لے کر گھوڑے پر سوار ہو جاتی۔ جلوس سایہ دار درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف گانے اور باجے کے ساتھ روانہ ہوتا۔ اس جھنڈ میں پانی کا ایک تالاب اور پتھر کی ایک مورتی تھی۔ تالاب کے قریب آگ جلتی اس پر متواتر تل کا تیل ڈالا جاتا۔ یہ آگ عام لوگوں کی نگاہ سے اوجھل ہوتی تھی۔ پورا ماحول دوزخ کا منظر پیش کرتا تھا۔ خدا ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ سایہ دار جھنڈ میں پہنچ کر عورت تالاب کے پانی میں نہاتی اور تب اپنے عمدہ کپڑوں اور زیورات کو ایک ایک کر کے سپرد آتش کرتی۔ آخر میں وہ کسی سے ایک بغیر سلا کپڑا مانگ کر اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیتی اور بہت ثابت قدمی اور جرات کے ساتھ آگ کی طرف قدم بڑھاتی جو ابھی تک اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوتی تھی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر اگنی دیوی سے دعا کرتی تھوڑی دیر خاموشی سے عبادت کرتی اور تب

اچانک غیر متزلزل ارادے کے ساتھ خود کو شعلوں کے سپرد کر دیتی۔ٹھیک اس وقت دوسری طرف سے ڈھول تاشوں کا شور بلند ہوتا جس کا مقصد واضح طور پر خوفناک منظر سے توجہ ہٹانا ہوتا تھا۔ دوسرے افراد جو ستی کی حرکات کو بغور قریب سے دیکھتے رہتے تھے، جلتی ہوئی عورت کے جسم پر لکڑی کے وزنی ٹکڑے ڈال دیتے تا کہ وہ اس سے نکل نہ سکے۔ یا نکلنے کی جدوجہد نہ کر سکے۔ ابن بطوطہ اس منظر کی تاب نہ لا کا غش کھا گیا۔ اسے لوگوں نے وہاں سے ہٹادیا''۔81

اگر کوئی عورت ستی ہونے سے انکار کرتی تو سماج میں اسے طرح طرح کی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا اور اس کے خاندان کو ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑتا۔ مورخ ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس تعلق سے لکھا ہے:

''اگر بیوائیں آگ میں جلنے سے انکار کر دیتیں تو ہندو عوام اسے اس حد تک خوف زدہ کر دیتے ہیں کہ اس کے لیے آگ میں جل کر مرنا زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے''۔82

اس دور میں کئی مسلم شہنشاہوں جیسے ہمایوں اور اکبر نے ستی کی حوصلہ شکنی کی اور کئی اقدامات کیے۔ ہندوستان میں ایک اور رسم کا ذکر ملتا ہے جسے ''جوہر'' کہتے ہیں۔ جب کسی راجپوت سردار اور اس کے ساتھیوں کو کسی جنگ میں فتح حاصل کرنے کی امید بالکل ختم ہو جاتی تو وہ عام طور پر اپنی عورتوں بچیوں کو قتل کر دیتے تھے یا انھیں کسی زمین دوز عمارت میں بند کر کے اس میں آگ لگا دیتے۔اس کے بعد یقینی طور پر موت کو گلے لگانے کے لیے دھاوا بول دیتے تھے۔ چند بری کے راجہ میدانی رائے شکست اور جوہر کی تفصیلات بابر نے اس طرح

نقل کی ہیں:

''اپنے شکست کے بعد میدنی رائے کے جنگ جو
سپاہیوں نے اپنے تمام بچوں اور عورتوں کو قتل کیا اور آخری
دم تک تلواریں سونت کر لڑنے کے لے نکل پڑے''۔83

جوہر کی رسم شمالی ہند میں رائج تھی لیکن دکن میں اس طرح کی عسکری روایات کو فروغ نہیں ہوا۔ مورخین نے اس کا رواج کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

''تلنگانہ کا راجہ علاء الدین خلجی کے حملے کے وقت جوہر
کرنے سے ہچکچایا حالانکہ اس کے متعدد افسر اس کے لیے
تیار تھے''۔84

عورتوں کی حیثیت میں انحطاط کے لیےعصمت فروشی کے پیشہ کا بھی بہت اثر رہا۔عصمت فروشی کا پیشہ بعض لحاظ سے ہندوستان میں قدیم زمانے سے رائج تھا۔عہدہ وسطی میں مقدس مندروں میں لڑکیاں پیش کرنے کی روایات کافی مضبوط تھی۔قدیم ہند کتاب کام سوتر میں عصمت فروش عورتوں کو قابل احترام تصور کیا گیا ہے۔

قرون وسطیٰ میں عیش وعشرت کے شوق نے معاشرے میں قحبہ خانے کی روایت کا خیر مقدم کیا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عورت کا وجود محض لذت کی فراہمی تک سمٹ گیا اور اب اجناس کی طرح منڈی میں اس کی قیمت بھی مقرر کی جانے لگی۔محمد شہزاد علاء الدین خلجی کے فرمان کے حوالے سے لکھتے ہیں

''پردے کی سختی سے قحبہ خانوں میں تیزی آنے لگی۔
دہلی میں اس کی تعداد اتنی بڑھی اور سماج میں اس کے
اثرات اتنے پھیلنے لگے کہ علاء الدین خلجی نے اس سے

متعلق خصوصی فرمان جاری کیا کہ اسے جلد سے قابو میں
لایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو۔ان کی شادی کرا کر خانگی
زندگی گزارنے کے لیے مجبور کیا جائے''۔[85]

مسلم معاشرہ میں بھی ہندوؤں کے رسم و رواج سرائیت کرنے لگے تھے اسی لیے لڑکیوں کو معمولی تعلیم دی جاتی اور سن بلوغت کو پہنچتے پہنچتے ہی رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیئے جاتے البتہ اس سلسلہ میں چند خواتین نے جو اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتی تھیں۔اپنی تعلیم جاری رکھتے ہوئے سیاست ادب، فلسفہ اور فنون لطیفہ میں نہ صرف گہری دلچسپی دکھائی بلکہ انھیں بلند مقام بھی حاصل ہوا۔سیاست میں جنوبی ہندوستان کے حکمراں کاکتیہ خاندان کی مہارانی رد رمادیوی اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔دہلی کے حکمراں شمس الدین التمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ جو تقریباً 4 سال تک دہلی پر حکمراں رہی۔احمد نگر کی چاند بی بی جو نقاب پوش ہو کر اکبری فوجوں سے مردانہ وار لڑی اور بابر کی بیٹی نے گلبدن بانو سے اپنے بھائی ہمایوں کی سوانح عمری ''ہمایوں نامہ'' تصنیف کی۔ہمایوں کی بھتیجی سلمیٰ سلطانہ فارسی شاعرہ تھیں اس کے علاوہ نور جہاں اور ممتاز محل شعر و ادب کی دنیا میں نام کمایا اور اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء مشاق کاتب تھیں۔

مختصر یہ کہ اس عہد کا ہندو سماج ذات پات میں بٹ گیا تھا اور چند ایک کے سوا عورتوں کی حیثیت میں انحطاط پایا جاتا ہے مسلمان عورتوں کے حقوق کو بھی ہندوستانی تہذیب کے زیر سایہ پامال کر دیئے گئے۔ہندوستانی سماج نے عام عورتوں کے ساتھ جو جابرانہ رویہ اپنایا تھا وہی رویہ مسلم عورتوں کے ساتھ اپنایا جانا ایک فطری عمل بن گیا۔

ہندوستان کی تاریخ میں اٹھارویں صدی عیسوی ہمہ جہتی انحطاط کا دور مانی جاتی ہے جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے پچھلے ادوار سے بھی زیادہ تاریک ترین دور تھا۔مغل شہنشاہیت میں انتشار، مختلف یورپی

طاقتوں کے عروج فرسودہ رواجوں، رسوم، توہمات اور نامعقول اجارہ داری نے ملک کو تباہ کر دیا تھا۔ ان حالات میں عورتیں اپنی آزادانہ شناخت کھو بیٹھیں تھیں۔ وہ مکمل طور پر مردوں کی ماتحت بنا دی گئی تھی۔

☆☆☆

# حوالے


1۔ بحوالہ شمیم نکہت، پریم چند میں نسوانی کردار، نصرت پبلیشرز دہلی، 1975ء، ص22

2۔ بحوالہ آمنہ تحسین، مطالعات نسواں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 2008ء، ص37

3۔ قدیم ہندوستان کی تاریخ، از رام شنکر تر پاٹھی مترجم سید سخی حسن نقوی، ترقی اردو بیورو وزارت ترقی اردو بیورو وزارت تعلیم حکومت ہند، 1971ء، ص:58

4۔ قدیم ہندوستان کی تاریخ، از رام شنکر ترپاٹھی مترجم سید سخی حسن نقوی، ص58

5۔ ایضاً، ص59

6۔ ایضاً، ص59

7۔ بحوالہ شمیم نکہت، پریم چند میں نسوانی کردار، ص22

8۔ بحوالہ شمیم نکہت، پریم چند میں نسوانی کردار، ص24

9۔ بحوالہ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص31

10۔ بحوالہ آمنہ تحسین، مطالعات نسواں، ص41

11۔ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص31-32

12۔ شمیم نکہت، پریم چند میں نسوانی کردار، ص24

13۔ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص31-32

14۔ آمنہ تحسین، مطالعات نسواں، ص37-38

15۔ قدیم ہندوستان کی ثقافت وتہذیب تاریخی پس منظر میں، از ڈی ڈی کوسمبی مترجم بالمکند عرش ملسیانی ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، 1901ء، ص107

16۔ قدیم ہندوستان کی تاریخ، از رام شنکر ترپاٹھی مترجم سید سخی حسن نقوی، ص61

17۔ قدیم ہندوستان کی ثقافت وتہذیب تاریخی پس منظر میں، از ڈی ڈی کوسمبی مترجم بالمکند عرش ملسیانی ص 112

18۔ بحوالہ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص32

19۔ شمیم نکہت، پریم چند میں نسوانی کردار، ص26

20۔ آمنہ تحسین، مطالعات نسواں، ص38

21۔ بحوالہ شمیم نکہت، پریم چند میں نسوانی کردار، ص26-27

22۔ شمیم نکہت ڈاکٹر، پریم چند میں نسوانی کردار، ص27

23۔ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص33-34

24۔ قدیم ہندوستان کی ثقافت وتہذیب تاریخی پس منظر میں، از ڈی ڈی کوسمبی مترجم بالمکند عرش ملسیانی، ص76

25۔ ایضاً، ص68

26۔ آمنہ تحسین، مطالعات نسواں، ص40

27۔ بحوالہ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص34

28۔ آمنہ تحسین، مطالعات نسواں، ص41

29۔ ایضاً، ص42

30۔ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص39

31۔ بحوالہ شمیم نکہت، پریم چند میں نسوانی کردا، ص27

32۔ قدیم ہندوستان کی تاریخ، از رما شنکر تر پاٹھی مترجم سید سخی حسن نقوی، ترقی اردو بیورو وزارت ترقی اردو بیورو وزارت تعلیم حکومت ہند، 1971ء، ص76

33۔ ایضاً، ص76

34۔ آمنہ تحسین، مطالعات نسواں، ص44

35۔ رما شنکر تر پاٹھی، قدیم ہندوستان کی تاریخ، ص76

36۔ بحوالہ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص36-37

37۔ ایضاً، ص37

38۔ قدیم ہندوستان کی تاریخ، از رما شنکر تر پاٹھی مترجم سید سخی حسن نقوی، ص76

39۔ بحوالہ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص38

40۔ بحوالہ شمیم نکہت، پریم چند میں نسوانی کردار، ص28

41۔ بحوالہ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص38

42۔ قدیم ہندوستان کی تاریخ، از رما شنکر تر پاٹھی مترجم سید سخی حسن نقوی، ص102

43۔ ایضاً

44۔ آمنہ تحسین، مطالعات نسواں، ص49

45۔ قدیم ہندوستان کی تاریخ، از رما شنکر تر پاٹھی مترجم سید سخی حسن نقوی، ص102

46۔ بحوالہ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص39

47۔ قدیم ہندوستان کی تاریخ، از رما شنکر تر پاٹھی مترجم سید سخی حسن نقوی، ص102

48 ایضاً،ص102

49 بحوالہ محمد شہزاد شمس،عورت اور سماج،ص39

50 ایضاً،ص39

51 آمنہ تحسین،مطالعات نسواں،ص47

52 قدیم ہندوستان کی تاریخ،از رما شنکر تر پاٹھی مترجم سید سخی حسن نقوی،ص102

53 آمنہ تحسین،مطالعات نسواں، ص49

54 محمد شہزاد شمس،عورت اور سماج،،ص39

55 قدیم ہندوستان کی تاریخ،از رما شنکر تر پاٹھی مترجم سید سخی حسن نقوی،ص93

56 ایضاً،ص96

57 ایضاً،ص98

58 محمد شہزاد شمس،عورت اور سماج،ص43

59 ایضاً،ص43

60 قدیم ہندوستان کی تاریخ،از رما شنکر تر پاٹھی مترجم سید سخی حسن نقوی،ص173

61 ایضاً،ص204

62 بحوالہ ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں،از۔کنور محمد اشرف،مترجم قمرالدین نیشنل بک ٹرسٹ،نئی دہلی،1974ء،ص226

63ایضاً،ص226

64ایضاً،ص227

65 ایضاً،ص227

66ایضاً،ص 227-228

67 ایضاً، ص228-229

68 ایضاً، ص230

69ایضاً، ص 231

70 ایضاً، ص231

71 ایضاً،ص231

72 ایضاً، ص231

73 ایضاً، ص 231-232

74 ایضاً، ص232

75 ایضاً ص232

76 آمنہ تحسین، مطالعات نسواں، ص51

77 بحوالہ ہندوستانی معاشرہ عہدِ وسطیٰ میں، از۔ کنور محمد اشرف، مترجم قمرالدین، ص234

78 ایضاً، ص235

79 ایضاً، ص243-242

780 ایضاً، ص246

81 ایضاً، ص252-253

82 ایضاً، ص255

83 ایضاً، ص262

84 ایضاً، ص355

85 بحوالہ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، 2006 ، ص52

☆☆☆

# باب سوم

## ہندوستان کے مختلف مذاہب میں عورت کا مقام

# ہندوستان کے مختلف مذاہب میں عورت کا مقام

اس مقالے کا اصل موضوع ''اردو ناولوں میں ملازمت پیشہ خواتین کے مسائل'' ہے لیکن انسان کی زندگی کے ہر پہلو پر مذہب کا اثر پایا جاتا ہے۔ اسی لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مقالے کے دوسرے باب میں عورت نے مذہبی نقطہ نظر سے جو مقام حاصل کیا ہے اس پر بھی روشنی ڈالی جائے۔

ہندوستان میں کئی مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں اسی لیے یہاں کے متنوع کلچر کو ''کثرت میں وحدت'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس کثیر آبادی والے ملک کے مختلف مذاہب جیسے ہندو مذہب، بدھ مت، جین مت اور عیسائیت، اسلام وغیرہ ہیں۔ اس باب میں ان مذاہب میں عورت کا کیا مقام و مرتبہ ہے یہی بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہندو مذہب میں عورت کے مقام کا یقین کرنے کے لیے ہندوؤں کی مقدس کتابیں جیسے وید، اپنشد، دھرم شاستر، رامائن، مہابھارت سے مدد لی جاسکتی ہے۔

''وید'' سنسکرت لفظ ہے۔ جس کے معنی علم و دانش، کے ہیں یہ نام ہندو دانشوروں و مفکروں کے تفکرات کے چار مجموعوں کو دیا گیا ہے۔ ''وید'' ہند آریاؤں کے قدیم ترین ادب کی ترجمانی کرتے ہیں۔ رگ وید، سام وید اور اتھروید کے انداز تفکر میں پختگی اور جغرافیائی حوالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی تدوین کافی طویل عرصے تک ہوتی رہی ہے۔ اولین مجموعہ رگ وید ہے اور سب سے آخر میں اتھر وید کا نام لیا جاتا ہے۔

ہر وید تین حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔سمیتھا' بر ہمنا اور اپنشد ''سمیتھا'' نظم کی طرز میں لکھی گئی ہے۔ یہ وید کا قدیم ترین اور اہم حصہ تصور کیا جاتا ہے یہ دعاؤں' بھجنوں اور گیتوں پر مشتمل ہے۔اس کے برعکس بر ہمنا اور اپنشد نثری انداز میں ترتیب دیئے گئے ہیں۔ مذہبی رسومات اور الہیات کے مسائل بر ہمنا کے موضوع ہیں۔ ''' رگ وید'' کو ویدمتی ادب میں خالص ادبی نقطہ نظر سے نمایاں اہمیت دی گئی ہے۔اس کا اسلوب بیان سادہ اور فطری ہے۔ ہندو مذہب صرف مذہب کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ یہ ایک ملک '' ھند'' کی بھی پہچان ہے۔ ہندوستان کے قدیم باشندوں نے دریائے سندھ کو اپنا مسکن بنایا تھا۔اس خطے پر بیرونی حملہ آوروں نے ھند کا نام دیا اور یہاں کے رہنے والے باشندوں کو'' ہندو یا ہندوی'' کہا گیا اور اِن باشندوں کا مذہب ہندو مذہب کہلایا۔سید حامد حسین اس نظریئے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ہندو تہذیب نے اپنا یہ نام اس وجہ سے اختیار کیا کہ
اس کے قدیم ترین پیرو اس خطے میں آباد تھے جہاں
دریائے سندھ اور اس کے معاون دریا بہتے ہیں اور اس
خطےء کے باشندوں کو ایرانیوں اور وسط ایشیاء کے دوسرے
حملہ آوروں نے'' ہندو'' کا نام دیا تھا''۔1

ہندوستان جغرافیائی بنیاد پر وسیع الرقبہ ملک ہے اور کثیر آبادی کی وجہ سے دنیا میں شہرت رکھتا ہے انسانی تہذیب کی تاریخ میں ہندو فکر ونظریئے کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں تہذیب تمدن کے قدیم آثار ملتے ہیں اور ہندو نظریہ حیات آج بھی تاریخی تسلسل کو برقرار رکھے ہوئے ہیں اس باب میں ھندو مذہب کے نظریئے حیات کے حوالے سے عورت کے مقام پر دلائل پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

ہندو مذہب میں تاریخی ادوار کے اعتبار سے دیکھا جائے تو عورت کا مقام قدیم دور سے درجہ بہ درجہ

روبہ زوال پذیر رہا ہے۔محمد شہزاد شمس اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔:

''ویدک عہد (۱۵۰۰ سے ۱۰۰۰ قبل مسیح) میں عورت کا سماجی مقام کافی بلند تھا اس سماج میں عورت ایک آزاد فرد کی حیثیت رکھتی تھی''۔

ویدک عہد کے بعد (۱۰۰۰ سے ۶۰۰ قبل مسیح) برہمن و اپنشدوں کا دور آتا ہے، جہاں عورت کی سماجی حیثیت بتدریج کم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے اس دور میں عورت کے تمام تر حقوق بڑی حد تک محدود ہوگئے اور ان پر سماجی بندشیں لگادی گئیں۔

اس کے بعد (۶۰۰ سے ۲۰۰ ء ق ۔م) سوتروں، سمرتیوں پرانوں اور رزمیہ داستانوں (راماین اور مہابھارت) کا عہد آتا ہے اس دور میں عورت کی حالت اور ابھی بدتر ہوگئی۔اس پر نہ صرف تعلیم کے دروازے بند ہوگئے بلکہ وہ سراپا ناپاک، جھوٹا، فریب، ہوس پرستی اور کم عقلی کا مجموعہ سمجھی جانے لگی''۔2

ان ادوار کی تاریخ کو مدنظر رکھتے ہوئے تفصیل سے عورت کی حیثیت کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ویدک عہد میں عورت کو مرد کی معاون و مددگار سمجھا جاتا تھا۔عورت کو ماں، بیٹی، بیوی کے رشتوں میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا اور انھیں تمام سماجی حقوق دیئے گئے تھے عورت کو تجارت صنعت وحرفت میں ہر طرح کی سہولتیں مہیا کی جاتی تھیں اس کے علاوہ مذہبی اور غیر مذہبی رسوم میں عورتوں کو مساوی مواقع دیئے

جاتے تھے۔رگ وید کے حوالے سے سید حامد حسین لکھتے ہیں:

''ہندو بالعموم عورتوں کے بارے میں ایک بلند نظر رکھتے ہیں ۔عورت کو ہر کام میں مرد کا معاون ومددگار (سہہ دھرمنی) کہا گیا ہے''۔3

رگ وید میں عورت کو تعلیم حاصل کرنے کی آزادی دی گئی تھی اس کے علاوہ وہ سماج میں اپنا خاص مقام رکھتی تھی لیکن بعد کے ادوار میں منوسمرتی میں عورت کی آزادی سلب کردی گئی حامد حسین نے رگ وید کی تفسیر کے حوالے سے آگے لکھا ہے:

''ساین نے ''برگ وید'' تفسیر پر لکھتے ہوئے کہا ہے کہ زن وشوہر ایک ہی حقیقت کے دو برابر کے حصے ہیں اسی لئے وہ ہر معاملے میں برابر ہیں اور مذہبی اور غیر مذہبی مسائل میں برابر کے شریک ہیں لیکن بعد میں منو اور یاگیہ ولگیر تک پہنچتے پہنچتے یہ تصور بدل گیا''۔4

ویدک دور میں عورت کی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مہ نور زمانی بیگم، رقم طراز ہیں:

''یہاں (ہندوستان) میں ویدوں کے زمانے میں آریہ قوم اس بات کے لئے کوشاں تھی کہ ان کی عورتیں زندگی کی تمام راہوں میں مردوں کا ساتھ دیں اور لڑکیوں کو لڑکوں کے برابر تعلیم وتربیت حاصل ہوسکے۔نتیجتاً کئی عورتیں مشہور ویدک اسکالر، شاعرہ، مقرر اور مدرس بن گئیں تھیں''۔5

ویدک دور میں عورت کی کم سنی کی شادیوں کا ذکر نہیں ملتا بلکہ عورت کو پختہ عمر تک پہنچنے کے بعد رشتہ ازدواج میں باندھا جاتا۔شادی کے لئے عورت اپنے شوہر کے انتخاب کے لیے آزاد تھی جیسا کہ مہ نور زمانی بیگم نے لکھا ہے:

'' یہاں (ہندوستان ) میں ویدوں کے زمانے
میں آریہ قوم میں ۔۔۔۔عورت کو اس بات کی اجازت تھی
کہ وہ ایک پختہ عمر کو پہنچنے کے بعد شادی کرے اور شوہر کے
انتخاب میں پوری آزادی سے کام لے''۔6

اسی بات کی وضاحت آمنہ تحسین اس طرح کرتی ہیں:

'' ویدک دور 2500 قبل مسیح تا 1500 قبل مسیح ۔۔
۔۔۔لڑکیوں کی شادیاں سمجھداری کی عمر ہونے کے بعد ہوا
کرتی تھیں یعنی 14 سے 17 سال کی عمر میں اور وہ بھی ان
کی مرضی سے''۔7

شادی صحیح عمر میں کرنے اور شوہر کے انتخاب میں آزاد ہونے کے علاوہ عورتوں کو بیک وقت کئی شوہر رکھنے کی بھی آزادی حاصل تھی: مثلاً دروپدی جو کہ مقدس رزمیہ داستان کی اہم کردار ہے جس کے پانچ شہزادوں سے بیک وقت شادی ہوتی ہے۔

ویدک دور میں عورت، شوہر کے انتخاب کے ساتھ ساتھ مردوں کے بیرونی اُمور جیسے کھیتی باڑی کے کام بیج بونا گھاس کاٹنا، پانی کی مؤثر سربراہی فصل کی حفاظت وغیرہ میں بھی وہ مددگار تھیں۔مہ نور زمانی بیگم لکھتی ہیں:

''عورتیں اس دور (ویدک دور) میں زراعت، تیر کمان

اور کپڑوں وغیرہ کی صنعت میں بھی مرد کے شانہ بہ شانہ کام
کرتی تھیں''۔8

ویدک دور میں عورتوں کو جہاں تعلیم صنعت وحرفت شادی میں پسند ناپسند کا اظہار کرنے وغیرہ کے حقوق دیئے گئے تھے مگر وہاں اسے اپنے والد کی جائیداد کے حصہ داری میں کوئی حقوق نہیں عطا کئے تھے جائیداد کا وارث ہونے کا حق صرف بیٹوں کو دیا گیا تھا رائے بہادر سی گھوش لکھتے ہیں:

''بیٹی کے متعلق جملہ آریہ قوموں میں یہ اصول تھا کہ
شادی سے اپنے باپ کا گوتر ترک کر دیتی تھی اور عملی طور پر
اپنے شوہر کے گوتر میں داخل ہو جاتی تھی اور اس طرح وہ
اپنے خسر کی بیٹی ہو جاتی تھی۔ باپ کو اس پر کوئی حق باقی
نہیں رہتا تھا جس طرح کہ شادی کے قبل اس کو بیٹے اور بیٹی
دونوں پر حاصل تھا''۔9

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت جب تک والدین کے گھر رہتی اس کی پرورش والد کے ذمہ ہوتی اور شادی کے بعد شوہر عورت کا مالک بن جاتا عورت کو نہ ہی اپنے والدین سے جائیداد میں حق حاصل ہوتا اور نہ ہی سسرال میں۔ آریائی سماج میں بیٹوں سے زیادہ بیٹیوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اور اگر کسی شخص کو بیٹا نہ ہو تو بیٹی کو وہ اپنے ہی گھر رکھتا جائیداد کی وارث ہونے کا حق دیا جاتا۔

ہندو مذہب میں جب کسی شخص کو بیٹا نہ ہونے کی صورت میں اپنی بیٹی کو ''پتریکا'' بنایا جاتا۔ اصول پتریکا کو دھرم شاستر میں اس طرح لکھا گیا ہے:

''ہندوستان کی آریہ قوموں میں رگ وید کے زمانے
سے جب کسی شخص کے بیٹا نہیں ہوتا تھا تو وہ اپنی بیٹی کو پتریکا

بنا سکتا تھا پتریکا بنانے کا یہ اثر ہوتا تھا کہ وہ اپنے باپ کے

گوتر میں مثل بیٹے کے رہتی تھی اور اس کو وہی حقوق حاصل

ہوتے تھے جو بیٹے کو ہوتے تھے''۔ 10ؔ

ہندو مذہب میں عورت کے ساتھ بیٹی بیوی، کی حیثیت چندنا انصافیاں ہوئی ہیں لیکن عورت کو ماں کے روپ میں قدیم دور سے لے کر جدید دور تک اعلیٰ مقام عطا کیا گیا ہے۔ دھرم شاشتر میں لکھا گیا ہے:

''اس امر کے متعلق مطلق شبہ نہیں ہوسکتا کہ آریہ قوموں

میں ماں کا حصہ تسلیم کیا گیا تھا''۔ 11ؔ

دھرم شاستر میں خاندانی درجہ بندی کے لحاظ سے پہلے ماں کے درجہ آتا تھا پھر باپ اور باقی دوسرے رشتہ داروں کا مقام، جیسا کہ لکھتے ہیں:

''(دھرم شاستروں) میں جہاں تک کہ خاندان کی

اندرونی حالت کا حال معلوم ہوا ہے حسب ذیل مدراج تھے

ماں کا حق، باپ کا حق والدین کا حق''۔ 12ؔ

ہندو مذہب کے قدیم ویدک دور میں عورت کے مرتبہ اونچا تھا نہ صرف آریاؤں میں بلکہ ان سے پہلے کی قوم یعنی دراوڑوں میں بھی عورت مالکہ اور دیوی کا مقام رکھتی تھی:

''۔۔۔۔دراوڑوں میں مادرسری نظام رائج تھا۔ آریوں کی

آمد کے بعد جس عہد میں ویدیں لکھی جارہی تھیں اس دور میں

بھی عورتوں کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ رگ وید کے بعض نہایت عمدہ

اسلوب عورتوں ہی کے مرتبہ کئے ہوئے ہیں''۔ 13ؔ

ہندو مذہب کے قدیم دور یعنی رگ ویدک دور میں عورت گھر کی مالکہ ہوتی اور وراثت کا سلسلہ عورت

کے دست نگراں ہوتا تھا۔اس کی وجہ کی وضاحت کرتے ہوئے محمد شہزاد شمس لکھتے ہیں:

''اس عہد ( ویدک عہد ) کی اہمیت اس وجہ سے بھی زیادہ تھی کہ نسل و وراثت کا سلسلہ باپ کے بجائے ماں کی طرف سے چلتا تھا''۔14؎

کتاب رگ وید نہ صرف عورت کی حیثیت بلند تھی بلکہ اسے بیوہ پر شادی کی اجازت دی گئی تھی ویدک دور میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں جو اپنے شوہر کے مرنے کے بعد عورت نے دوسری شادی رچائی ہو۔محمد شہزاد شمس عورت کی حیثیت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں لکھا ہے:

''بیواؤں کی دوسری شادی کی کوئی ممانعت نہیں تھی۔ وہ جب چاہتیں، دوبارہ شادی رچا سکتی تھیں۔ اتھرو وید میں اُن کو'' پونربھو'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان کے لیئے تارک الدنیا ہونا کوئی ضروری نہیں تھا اور نہ ہی وہ گوشہ نشینی کے لیئے مجبور کی جاتی تھیں''۔15؎

بیواؤں کی دوسری شادی کے متعلق آمنہ تحسین نے بھی رگ وید کے حوالے سے لکھا ہے:

''ویدک دور میں بیواؤں کی دوبارہ شادی کے چند حوالے ملتے ہیں جن کے مطابق بیوہ نے اپنے متوفی شوہر کے چھوٹے بھائی یا اس کے کسی اور قریبی رشتہ دار سے شادی کرلی تھی''۔ 16؎

ہندو مذہب میں بیواؤں کے ساتھ بہت بڑا گھناؤنا ظلم رائج تھا جسے ''ستی'' کی رسم کہا جاتا ہے ستی کی رسم میں عورت کو اپنے متوفی شوہر کی چتا کے ساتھ زندہ جلا دیا جاتا تھا یہ رسم قدیم رگ ویدوں میں نہیں پائی جاتی

اس کا اطلاق بعد کے دور میں کسی اور رسموں کو لے کر رائج ہوا ہوگا ستی کی رسم کا قدیم ھندو مذہب میں کوئی واقعہ یا تذکرہ نہیں ملتا۔

ستی کی مذموم رسم قدیم ہندو مذہبی رسوم میں کہیں بھی نظر نہیں آتی رگ وید کے اشلوک کے حوالے سے محمد شہزاد شمس نے لکھا۔

> ''ویدک عہد کی تیتریا سمہیتا(Taitteriya Samhita)
> اور ایتر یہ برہمن( Aitrareuya Brahman) میں ذکر
> ہے کہ اس وقت ایک مرد کئی بیویاں تو رکھتا تھا لیکن ایک عورت
> کئی شوہر نہیں رکھتی تھی۔۔۔۔لیکن ستی کی مذموم رسم کا ذکر اس
> عہد میں نہیں ملتا''۔17؎

زاہدہ حنا نے ستی کی رسم کے متعلق یہی بات بتائی ہے۔

> ''(ویدک دور میں) شوہر اور بیوی دونوں مالک سمجھے
> جاتے تھے اور دونوں ساتھ پرستش کرتے تھے اس وقت
> بیوی کے ستی ہونے کا دستور نہ تھا''۔18؎

ویدک عہد میں مجموعی طور پر عورت کا مقام مرد کے مساوی تھا عورت کو ویدک دور میں مردوں کے مساوی حقوق دیئے گئے تھے لیکن وید عہد کے بعد ہندوؤں میں عورت کے متعلق کم تری کا نظریہ ملتا ہے۔

ویدک عہد کے بعد اپنشدوں کا دور آتا ہے۔ان اپنشدوں میں عورت کے تمام حقوق کو محدود کر کے پیش کئے گئے تھے اپنشدوں میں عورت کو علم حاصل کرنے سے باز رکھا گیا تھا۔مقدس کتابوں کو چھونے سے بھی منع کیا گیا تھا صالحہ بیگم لکھتی ہیں:

> ''اگر کسی عورت نے کتاب چھو لی یا قلم پکڑ لیا تو اس کے

خاندان پر مصیبت نازل ہوگئی''۔ 19؎

اور پروفیسر آندرے نے لکھا ہے:

''اپنشدوں میں بھی عورت صرف ایک سامان تفریح و

نشاط تھی''۔ 20؎

ہندو مذہب کے پیروؤں نے اپنشدوں کے تقدس کو چھوڑ کر آگے منوسمرتی کے قوانین کو اپنایا۔ منوسمرتی نے خودساختہ اصول وضوابط رائج کیئے جس میں اس نے عورت کو ہندوؤں کی نچلی ذات یعنی شودروں کے زمرے میں لا کھڑا کیا۔ منوسمرتی کے قوانین عورت کے تمام حقوق وآزادی نسواں کو سلب کر دیئے۔ صغرا مہدی لکھتی ہیں:

''منودھرم شاستر کی رو سے بچپن میں عورت کو باپ کے

زیر فرمان رہنا چاہیئے جوانی میں شوہر کی اور شوہر کے انتقال

کے بعد بیٹوں کے وہ خودمختار کبھی نہیں رہ سکتی''۔ 21؎

منوسمرتی میں عورت کو بیٹی اور بیوی کے روپ میں کمتر درجہ دیا گیا ہے صرف ماں کی حیثیت کو اعلیٰ درجہ حاصل تھا بیٹی باپ اور بھائیوں کی تابعدار ہو اور بیوی ایک بے زبان مخلوق کی طرح ہر حکم بجالائے۔ صغرا مہدی لکھتی ہیں:

''اس (عورت) کا تصور محض ماں اور بیوی کی حیثیت

سے کیا جاتا ہے اور اس کے یہی رول مثالی سمجھے جاتے ہیں۔

ایک مثالی بیوی وفادار اور بے زبان ہوتی ہے اس کا دھرم

شوہر کی خدمت ہے''22؎

منوسمرتی کے بعد آنے والے مقننین نے بھی عورت کی آزادی کی کھلی مخالفت کی۔ ہندوستان کے مشہور مقنن دیانند سرسوتی نے عورت کی نسبت فتویٰ دیا کہ:

''عورت خواہ بچہ ہو یا جوان یا بوڑھی ہر حال میں کوئی بھی

کام خود مختاری سے نہ کرے''۔23؎

ہندو دھرم عورت کو شوہر کی فرمانبرداری میں اپنے آپ کو وقف کر دینے کا درس دیتا تھا عورت شوہر کی خدمت گار و وفا شعار ہونی چاہیئے زندگی میں ہر دکھ کو گلے لگانے کے علاوہ شوہر کے مرنے پر ساتھ ہی خود کو بھی آگ کے شعلوں کے حوالے کر دینے کی تعلیم دی جاتی تھی ۔ثریا بتول علوی لکھتی ہیں:

''ہندوستان میں قدیم زمانہ سے ستی کا رواج اس بات کی علامت ہے گویا عورت کا اپنا کوئی وجود نہیں وہ مرد ہی کے رحم و کرم پر ہے حتیٰ کہ خاوند کی وفات کے بعد اس کی زندگی کا بھی کوئی جواز نہیں۔ ہندو عورتوں کا تو دھرم ہی'' پتی ورتا'' تھا جس کا مفہوم ہے کہ شوہر ہی اس کا معبود و آقا ہے اور وہ اپنے شوہر کے سامنے بے بس اور عاجز ہے''۔24؎

ہندو مذہب کے منوسمرتی کے دور میں عورتوں کو نچلی ذات یعنی شودروں کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے وہ نجس اور کمزور سمجھی جاتی ہے۔جیسا کہ صغرا مہدی لکھتی ہیں:

''ہندو مذہب میں بے شمار عیوب عورتوں سے منسوب کر دیئے گئے ہیں ان کو بھی شدروں کی طرح ویدں کی پڑھنے کی اور قربانی میں حصہ لینے کی ممانعت ہے ۔۔۔ ماہواری اور زچگی کے زمانے میں عورت کے ساتھ نجاست کے تصور وابستہ کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ مذہبی رسومات میں حصہ نہیں لے سکتی ہیں ا۔ ان پابندیوں سے اس تصور کو تقویت ملتی ہے کہ فطری طور پر عورتیں مردوں کے

مقابلے میں کمتر ہیں''۔25؎

ہندو مذہب میں برت رکھنے کا رواج عام ہے عورتیں شوہر کی لمبی عمر کے لیے ''کرواچوت'' کا برت رکھتی ہیں اور اس کے علاوہ بیٹوں کی صحت اور درازی عمر کے لیے بھی برت کا اہتمام کرتی ہیں۔ یہ تمام برت عورتوں کے لیے مخصوص ہیں مردوں پر یہ رسم پورا کرنے کی پابندی نہیں ہے صغرا مہدی لکھتی ہیں:

''وہ اپنے شوہر اور بیٹوں کی سلامتی حفاظت کے لئے
برت رکھے''۔26؎

یہ برت تعلیم یافتہ غیر تعلیم یافتہ تمام عورتیں رکھتی ہیں۔ اس سے انہیں سماج میں اور مذہب میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ آمنہ تحسین مختلف ''برت'' کے بارے میں لکھتی ہیں:

''طویل زندگی کو یقینی بنانے، شوہر کی فلاح و بہبود اور
شادی کے تمدنی مقصد کے حصول کے لئے برت رکھے
جاتے ہیں''۔27؎

ہندو سماج میں بیوہ عورت کا سماجی بائیکاٹ کیا جاتا ہے۔ حالانکہ قدرتی نظام کے تحت مرد' عورت بچے' بوڑھوں کی موت فطری عمل ہے لیکن کسی عورت کے شوہر کے انتقال پر اس کی بیوہ کو اچھا کھانے اچھا پہننے حتی کہ عام محفلوں میں جانا بھی منع ہے۔ بیوہ کو منحوس سمجھا جاتا ہے اور سماج کی شادی شدہ عورتوں اور لڑکیوں کو ان سے دور رہنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ جبکہ اگر کسی مرد کی بیوی کی موت واقع ہو جائے تو اس پر کوئی پابندی عائد نہیں ہو تی۔ اس صورتحال پر صغرا مہدی لکھتی ہیں:

''بیوہ کے ساتھ بدقسمتی کا تصور وابستہ ہے اور اس کو
منحوس سمجھا جاتا ہے وہ سماجی اور مذہبی تقاریب میں حصہ نہیں
لے سکتی اس لئے کہ اس کی منحوسیت دوسروں کو نہ لگ جائے

۔ ہندوں مردوں پر اس قسم کی کوئی پابندیاں اور شرطیں نہیں
ہیں ان کو ایسے کسی خاص لباس یا نشانی کی ضرورت نہیں ہے
جس سے ان کی ازدواجی حیثیت ظاہر ہو نہ ان کو دوسری
شادی پر پابندی ہے نہ رنڈے مرد کو منحوس سمجھا جاتا ہے'' 28ؔ

ہندو مذہب کی مظلوم ترین عورت بیوہ ہے بیوہ کی دوسری شادی کی ممانعت کی گئی ہے اور اس کو منحوس اور ناپاک سمجھا جاتا ہے، بیوہ کو اچھا کھانے پینے سنورنے سے روکا جاتا ہے دوسری طرف کسی مرد کی بیوی مرنے پر اسے کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی جاتی ،لیکن ہندو قانون 1856ء سے اس کی اجازت دی گئی ہے ۔صغرا مہدی لکھتی ہیں:

''سناتن دھرم کی رو سے اونچی ذات کی بیواؤں کو دوبارہ
شادی کی اجازت نہیں ہے جب کہ 1856ء سے قانونی
طور پر ان کو اس کی اجازت مل گئی ہے''۔29ؔ

ہندو مذہب میں عورت کو کسی بھی قسم کی وراثت نہیں دی جاتی وراثتی حقوق صرف بیٹوں کو دیئے جاتے ہیں ۔اسی لئے لڑکیوں کی شادی میں کچھ تحائف اور نقدی کی صورت میں لڑکی کو دیئے جاتے ہیں یہ طریقہ کار قدیم زمانے سے ہی چلا آرہا ہے لیکن موجودہ دور میں یہ ایک سماجی ناسور بن گیا ہے دولہن کو جو تحفہ تحائف دیئے جاتے تھے اُنہیں اب جہیز کی صورت میں لیا جا رہا ہے۔

قدیم دور میں ذات پات کی بناء پر لڑکیوں کو مساوی ذات کا دولہا ملنا مشکل ہو جاتا تو خاندان کے لئے لڑکیوں کو دوسری نچلی ذاتوں میں شادی کرنا باعث ندامت سمجھا جاتا حتیٰ کہ لڑکیوں کو ذات پات اور جہیز کی دولت کو مہیا نہ کرنے کی صورت میں قتل کیا جاتا تھا۔جہز کی لعنت کی تاریخ کے بارے میں کیلاش ناتھ شرما نے لکھا ہے:

''برہم وواہ'' کے ءمطابق لڑکی والوں کوشادی کے وقت
جو جہیز یا نقد روپیہ دولہا کو دینا پڑتا تھا اس کی صورت ایک
قیمت کی سی ہوتی تھی اس رقم یا جہیز کولڑکے کی قیمت سمجھا جاتا
تھا۔ یہ رقم لڑکی کے والدین خوشی سے نہیں دیتے تھے بلکہ مذہبی
طور پر یہ ایک رسم بن گئی تھی جس میں روپیہ کی تعداد مقرر نہیں
تھی جیسا لڑکا ہوتا تھا ویسی ہی اس کی قیمت لگتی تھی۔ عام طور پر
یہ قیمت پہلے سے طے ہوجاتی تھی۔ یہ جہیز کی رسم اور نقد روپیہ
کا مطالبہ اتنا بڑھا کہ اس سے پریشان ہو کر لوگ ایک زمانے
میں نوزائیدہ لڑکیوں کو قتل کر دیتے تھے''۔30؎

ہندو مذہب کی دور سے جہیز کے لین دین میں عورت کی حیثیت کم ہوجاتی ہے بیٹی اپنے والدین کے لیے بوجھ سمجھی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی رسم ہے جس میں لڑکی کے والدین کو ایک موٹی رقم جمع کرنی پڑتی ہے اگر شادی میں جہیز دینے کے لئے والدین کے پاس وافر مقدار میں دولت نہ ہوتو وہ قرضہ لے کر لڑکی کو جہیز مہیا کرتے ہیں صغرا مہدی لکھتی ہیں:

''شادی میں لین دین بھی عورت کی حیثیت کم ہونے کا
ایک اور مظہر ہے۔۔۔۔۔ ہندوستان میں دولہا اور اس کے
ماں باپ کولڑکی کے ماں باپ سے تحفے تحائف لینے کا حق
ہے، مگر دولہن کے ماں باپ داماد کے گھر ایک وقت کا کھانا
کھانا بھی اچھا نہیں سمجھتے''۔31؎

ہندو مذہب میں پائے جانے والے رسوم جیسے ''ستی'' کی رسم اور بیوہ کے ساتھ ظالمانہ سلوک کی سب

سے پہلے مسلم حکمرانوں نے ممانعت کی۔ستی کی رسم کے خاتمے کے لئے حکمراں ہمایوں نے آواز اٹھائی لیکن اس کے دور میں مغلیہ حکومت انتشار کا شکار ہوگئی جس وجہ سے خاطر خواہ نتیجہ اخذ نہیں ہوسکا لیکن اکبر نے ستی کی رسم کو ختم کرنے کے لیے ٹھوس اقدامات کئے اس سلسلے میں مہ نور زمانی بیگم لکھتی ہیں:

''سب سے پہلے ہمایوں اور اکبر نے ستی کو رسم کو ختم
کرنے کی سختی سے کوشش کی۔ چنانچہ مغلیہ عہد حکومت میں
عورتیں حد درجہ خوشحال تھیں''۔32

مغلیہ دور کے آخری دور میں یوروپی باشندوں کی آمد سے ہندوستان کے معاشی نظامے کے ساتھ ساتھ سماجی تبدیلیاں بھی رونما ہونے لگیں پرتگال، فرانس، روس اور برطانیہ کے باشندوں نے ہندوستان کو اپنی اشیائے تجارت کے لیے منافع بخش منڈی کے طور پر استعمال کیا لیکن ان ممالک کی آپسی رسہ کشی میں برطانیہ کی جیت ہوئی اور برطانیہ ہندوستان کے طول وعریض کو ایک تو آبادی بنانے میں کامیاب ہوا۔انگریزی نظم و نسق کے زیر سایہ ہندوستانی عوام کی سماجی زندگی میں چند تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

انگریزوں کے دور سلط میں ہندوستانی عورت کا سماجی استحصال کے ساتھ ساتھ معاشی استحصال بھی ہوا چونکہ اس دور میں ہندوستان کی حکومتوں میں رنجشیں شروع ہوگئی تھیں ملک کے خزانے، فوج اور دفاع کے لئے استعمال کئے جارہے ایسے دور میں ملک کی عوام جس میں مرد وعورت دونوں شامل تھے۔ضروریات زندگی مہیا کرنے کے لئے جدوجہد کرنے لگے اس طرح کے بدحال دور میں عورت پر ظلم میں اضافہ دیکھا گیا۔عورت کو بلا اجرت کام پر معمور کرنا جیسے پوشیدہ بیروزگاری کا نام دیا جاتا ہے اور بہت ہی قلیل اجرت پر عورتوں سے با مشقت کام لینا عام ہوگیا۔

برطانوی عورتوں کو ہندوستان میں اعلیٰ درجات حاصل تھے ان میں اینٹی بسینٹ نے ہوم رول

مومنٹ کے ساتھ ساتھ عورتوں کے حقوق کے لئے بھی آواز اٹھائی اور ہندوستانی علماء اور دانشوروں نے بھی یہ محسوس کیا کہ انھیں عورتوں کے حقوق کی پاسداری کرنی چاہیے ان کی کاوشوں کے نتیجہ میں چند قوانین بنائے گئے۔

''طلاق کے معاملے میں ہندو مذہب کے قوانین اور عیسائی میں کھیتولک فرقے کے قوانین یکساں ہیں دونوں کا خیال ہے کہ شادی کا تعلق خدا کا بنایا ہوا ہے۔ لہٰذا اس کو مت توڑو۔ برطانوی عہد میں ہندوستان کی معیشت پر کاری ضرب لگی جس کا اثر عورت پر بھی پڑا عورت کو کم اُجرت پر کام کرنے کا سلسلہ برطانوی دور میں خوب پروان چڑھا۔ لیکن برطانوی عہد میں عورتوں پر ہونے والے ظلم کے خلاف کئی تحریکیں چلائی گئی۔ اس دور میں مصلحانہ شخصیتوں نے عورتوں کی بہبود اور آزادی کے حق میں کام کرنا شروع کیا۔ راجہ رام موہن رائے ایشور چندر ودیا ساگر، سوامی دیانند سرسوتی سوامی وویکا نندا، اینی بیسنٹ، جیوتی راؤلے، سورن کمار دیوی (ٹیگور کی بہن) نے عورتوں کی بھلائی کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان لوگوں نے عورتوں میں تعلیم کی اشاعت، ہندو بیواؤں کے عقد ثانی کے فروغ اور کمسنی کی شادی اور کثرتِ ازدواج کے خاتمے کی پرزور حمایت کی چنانچہ 1804ء میں انگریزی حکومت نے طفل کشی کے رواج پر پابندی لگادی اور 1829ء میں ستی کی رسم کو قانونی طور پر روک دیا گیا۔ اور 1856ء

میں ہندو سماج میں بیوہ کے عقد ثانی کو بھی جائز قرار

دے دیا گیا''۔33

غرض ہندو مذہب میں عورتوں کی حیثیت کے تعلق سے ہندوستان کے ابتدائی باشندے'' زرخیز نظریہ''یعنی نسلی ارتقاء کواہمیت دیتے تھےلہٰذا وہ ماتا دیوی کی پوجا کرتے تھے۔ ہڑپہ تہذیب میں مادری خاندان کا رواج تھا۔ مادری معاشرے میں عورت زرعی سرگرمیوں میں حصہ لیا کرتی تھی اور پیداواری عمل کا خاص حصہ تھی، رگ ویدی دور میں خواتین باعزت مقام رکھتی تھیں اور کئی خاتون اسکالرس جیسے لوپامرا، دشادرا، گھریتا، ساپچی سبھامیتری، گارگی وغیرہ ویدی مباحث میں حصہ لیا کرتی تھیں اور اپنی قابلیت کو ثابت کر چکی تھیں، تاہم مابعد ویدک دور میں جس ذات پات کے ضابطے اور جائداد کی ملکیت پر مردوں کا قبضہ اور مذہبی دستورالعمل کے پیدا ہونے کے ساتھ عورت کے مقام میں تنزل پیدا ہوتا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ خاندان میں ماں کے حقوق کو کم کرتے ہوئے باپ کے درجہ کو بڑھا دیا گیا۔

خواتین کو پستی سے نکالنے کے لئے کئی تحریکیں چلائی گئیں، جیسے بھکتی تحریک، صوفی تحریک وغیرہ ساری دنیا میں بھی خواتین کے رول پر کانفرنسیں منعقد کی جارہی ہیں۔ اقوام متحدہ نے جولائی 1975ء سے جولائی 1985ء کو خواتین کا دہا قرار دیا گیا۔ ہر سال 8 مارچ (1918)ء کو''یوم خواتین'' کے دن سے موسوم کیا گیا۔ اس کے باوجود عورتیں آج بھی سماجی معاشی، سیاسی، مذہبی، طبقہ واری اور رنگ ونسل کی بنیاد پر تفریقات سے دوچار ہیں خواتین پر ظلم، خودکشی، جہیز کے لئے اموات، جنسی ہراسانی اور لڑکیوں کے قتل جیسے واقعات میں روز بہ روز اضافہ ہی ہو رہا ہے۔

## بدھ مت میں عورت کا مقام

بدھ مت ہندوستان کے قدیم مذاہب میں سے ایک ہے اس کا بانی گوتم بدھ ہیں ان کا اصلی نام تھا۔ گوتم بدھ نیپال کے لومینی باغات کے علاقے میں 567 ق۔م۔ میں پیدا ہوئے والدہ کی طرف گوتم بدھ کا سلسلہ نسب گوتما قبیلے سے ملتا ہے اس لئے گوتم کہلائیے والد کا نام سدھجودھن اور ماں کا نام مایا دیوی تھا ان کے والد کپل وستو کے راجہ تھے گوتم کی والدہ ان کے تولد ہونے کے فوری بعد انتقال کرگئی، گوتم بدھ کی شادی 18 سال کی عمر میں یشودھرا نامی خاتون سے کروادی گئی، انہیں ایک لڑکا راہل تولد ہوا ان سب فطری خوشیوں کے باوجود گوتم بدھ عیش وعشرت کی زندگی کو قطعاً پسند نہ کرتے تھے۔ گوتم بدھ نے 29 سال تک انسان کو مصائب اور مشکلات سے نجات (نروان) دلانے کی کھوج کرتے رہے گوتم بدھ نے سکون قلب کے لئے پیپل کے درخت کے نیچے مکمل یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ ریاضت میں غرق ہوگئے اس دوران انہیں ایک تجلی نظر آئی اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ دنیاوی غم کا حل نیک عمل میں ہے۔ گوتم بدھ نے تقریباً 45 سال مذہب کی تبلیغ وتشہیر میں صرف کردئے انھوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے سلسلے میں اپنا پہلا خطبہ 'سارناتھ' میں دیا جس کے نتیجے میں 5 پانچ سادھوان کے چیلے بن گئے رفتہ رفتہ ان چیلوں نے اپنی ایک تنظیم بنائی جو 'سنگھ' کے نام سے موسوم کی گئی۔

بدھ مت کی تعلیمات کے عام طور پر چار بنیادی اصول بتلائے جاتے ہیں:

1۔اس دنیا میں تمام دکھ ہی دکھ ہیں

2۔دکھ کا محرک دو اصل خواہشات ہیں

3۔ان خواہشات پر اگر انسان قابو پالے تو وہ رنج وغم دکھ درد سے محفوظ رہے گا

4۔ان خواہشات پر فتح انسان کو نیک اعمال کے ذریعہ ہوسکتی ہے۔

نیک اعمال کی راہ کوسنسکرت زبان میں''اشٹ مارگ'' کہا جاتا ہے۔اس طرح خواہشات نفس پر قابول آٹھ طریقوں سے پایا جاسکتا ہے۔

1۔راست عقیدہ، 2۔راست تفکر، 3۔راست عمل، 4 راست گفتار، 5۔راست ذرائع گذر بسر، 6۔راست جدو جہد، 7۔راست حافظہ، 8۔راست مراقبہ۔ان پرعمل کرکے نروان حاصل کیا جاسکتا ہے۔

بدھ مت بنارس۔سارناتھ۔مگدھ۔کوسلا اور کوسمبھی کی ریاستوں میں زیادہ پھیلا راجاؤں نے جیسے اشوک اعظم، راجہ کنشک اور راجہ ہرش وردھن کے علاوہ جنوبی ہند میں ستواہن دورحکومت میں یہاں کے راجاؤں نے اسے پھیلایا۔ بدھ مت کے اصول جین مت کی بہ نسبت کافی سہل اورآسان تھےاسی لئے یہ ساری دنیا کے ممالک جیسے تبت، جاپان، چین، برما میں پھیلا۔

چھٹی صدی ق۔م۔ بنی نوع انسان کی تاریخ میں ایک اثر آفرین دور تھا، دنیا کے مختلف خطوں میں جو ایک دوسرے سے کافی دوری پر واقع تھےلیکن مذہبی اعتبار سے ایک دوسرے کے خطوں میں روحانی سکون کی تلاش میں سرگرداں تھے مثال کے طور پر فارس میں زرتشت اور چین میں کینفوشس اسی زمانے میں اپنی تعلیمات کی اشاعت کررہے تھے۔

ہندوستان کی قوم بھی برہمنوں کی ریاکاری اور ذات پات کے نظام سے تنگ آچکے تھے اور نئے نظریات کی متلاشی تھی۔اسی دور میں بدھ مت اور جین مت دوعقیدوں کا آغاز ہوا۔ بدھ مت اور جین مت میں بنی نوع انسان کو ایسے اصول دیئے جس کی رو سے انسان زندگی کی تکالیف وغموں سے نجات پاسکتا ہے۔ بدھ مت اور جین مت میں راہبانہ زندگی کوفوقیت دی گئی بدھ مت میں نجات حاصل کرنے کے لئےبھکشواوربھکشونی کونروان حاصل کرنا پڑتا تھااورجین مت میں موکش کے ذریعہ نجات حاصل کی جاتی تھی۔

بدھ مت میں نروان یعنی زندگی کے عیش وعشرت سے کنارہ کشی کونجات کا ذریعہ مانا جاتا ہے اور

نروان حاصل کرنے کے لئے جنس کی قید نہیں رکھی گئی ہے اس مقصد کے حصول کے لئے جو سنگھ بنائے گئے تھے ان میں مردوں کے ساتھ عوتوں کو بھی حصہ لینے کی اجازت تھی مقدس ویدوں کو پڑھنے چھونے کی جو ممانعت ہندو مذہب میں عورتوں کو تھی وہ بدھ مذہب میں نہیں تھی۔

بدھ مذہب میں سب سے مقدس کام نروان حاصل کرنا ہے نروان حاصل کرنے کے لیے بھکشو اور بھکشونی کا روپ اختیار کرنا پڑتا ہے اور ایک گروپ ''جسے سنگھ'' کہا جاتا ہے اُس میں شمولیت اختیار کرنی پڑتی ہے اس مذہبی رسم میں گوتم بدھ نے عورت کو شامل نہیں کیا تھا لیکن بعد میں عورتوں کو مذہبی مساوات دیئے گئے۔ آمنہ تحسین لکھتی ہیں:

''گوتم بدھ نے ابتداء میں سنگھ میں عورتوں کی شمولیت
کو غلط قرار دیا تھا۔لیکن بعد میں ان کے شاگرد آنند کے
اسرار پر یہ مخالفت ختم کردی گئی''۔34؎

بدھ مت میں سماجی اونچ نیچ پر کوئی اصول نہیں ہیں اس مذہب کے ذریعہ ذات پات کا نظام جو کہ ہندوستانی سماج کا اہم حصہ تھا اُس کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ چونکہ اس مذہب کے پیروخواہشات نفسانی کو خود پر حاوی ہونے سے گریز کرتے تھے اسی لیے عورتوں اور مردوں میں جو معاشی نسلی وراثتی خلیج تھی وہ ختم ہوگئی۔اس مذہب میں عمل کی ذمہ داری دونوں پر یکساں ہے۔لیکن ان سب کے باوجود نروان کے معاملے میں مرد کو عورت پر فوقیت دی گئی ہے۔صغرا مہدی لکھتی ہیں:

''بدھ مت میں بھکشی کے مقابلے میں بھکشو کی حیثیت
اونچی ہے''۔35؎

بدھ مت میں بھکشو کا مقام بھکشونی سے زیادہ اہم ہوتا ہے حتیٰ کہ اگر بھکشونی عمر رسیدہ ہو تو بھی وہ مرد

بھکشو کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔

بدھ مذہب میں بیٹی کی پیدائش کو قطعاً برا نہیں سمجھا گیا لڑکیوں کو مقدس کتابوں کو پڑھنے اور مذہبی تعلیم سیکھنے کا حق حاصل ہے۔ آمنہ تحسین بدھ مذہب کی عالم عورتوں کے بارے میں لکھتی ہیں:

''بدھ مت کی اصلاحی تحریکوں میں بھی عورتیں زیادہ
تعداد میں شامل تھیں ۔بعض تو رہنما کی حیثیت تک بھی پہنچ
گئی تھیں۔ ان میں سوما، انوسچا، سجاتا اور سندری وغیرہ کے نام
قابل ذکر ہیں''۔36

بدھ مت عورتوں کو دنیا میں برائیوں کی ذمہ دار نہیں سمجھتا لیکن نروان حاصل کرنے کے لیے عوتوں سے دور رہنے کی شرط رکھی جاتی ہے عورت کا مقام پر ثریا بتول علوی لکھتی ہیں:

'' بدھ مت کے نزدیک عورت سے تعلق والا کبھی نروان
حاصل نہیں کر سکتا''۔37

دور جدید میں جن ممالک میں بدھ مت کے ماننے والے کثیر تعداد میں ہیں وہاں پر بھی عورتوں کے ساتھ مساوی سلوک نہیں کیا جاتا۔ ملک چین میں کنفیوشس جس کی حیثیت مذہبی پیشوا کی ہے۔ اور وہ گوتم بدھ کا کٹر مبلغ و پیرو تصور کیا جاتا ہے لیکن اس نے بھی عورت کی مظلومیت کا حل پیش نہیں کیا بلکہ اس کے مطابق عورت لذت کی دوسری چیزوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اسے مرد کے ہر حکم کی تابعداری کرنا لازمی ہے اس ضمن میں کنفیوشس لکھتا ہے:

''مرد حاکم ہے، اس کا کام حکمرانی ہے اور اس کا فرض
اطاعت ہے۔۔۔۔۔۔عورت شادی سے پہلے اپنے باپ
یا بھائی کی فرمابردار ہے، شادی کے بعد شوہر کی اور شوہر کے

بعد اپنے بڑے بیٹے کی اطاعت فرض ہے''۔38؎

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ بدھ مت میں عورت مذہبی وسماجی مساوات کو یقینی بنایا گیا اس کے باوجود خانقاہوں میں بھکشونی (عورت) کو بھکشو سے کمتر مانا گیا بدھ مت کے دور میں بھی عورت بھکشوؤں کے سنگھ کی صدر نہیں بن سکی۔

## جین مت میں عورت کا مقام

تاریخ ہند کی روشنی میں جین مت کے پہلے بانی کی حیثیت سے parasa wamtha کو نمایاں اہمیت دی جاتی ہے لیکن جین مت کو عملی طور پر پھیلانے کا سہرا وردھمان (مہاویر) کے سر ہے، مہاویر 40 قبل مسیح میں شمالی بہار کے علاقے ویسالی کے قریب موضع کنڈ نا میں ایک شاہی خاندان میں جنم لیا۔ ویسالی ایک چھوٹی سی ریاست تھی ان کا خاندان چھتری کہلاتا تھا باپ کا نام ٹری سالہ تھا۔ ان کی شادی ''یشودہ'' نامی نیک سیرت خاتون سے کردی گئی مہاویر کی زندگی عیش وآرام میں گزری لیکن مہاویر دنیاوی عیش وعشرت کو پسند نہ کرتے تھے لہٰذا وہ دنیاوی راحت ومسرت سے کنارہ کشی اختیار کر کے راہبوں کے ایک گروہ ''پرسونتھا'' سے منسلک ہوگئے تاکہ سکون قلب حاصل ہو سکے، تلاش حق کے سلسلے میں صحراؤں اور جنگلوں کی خاک چھانی' در بدر کی ٹھوکریں کھائیں۔ تلاش حق کے سلسلے میں اپنے جسم کو کئی ریاضت کے دوران کئی اذیتیں دیں مگر پھر بھی انہیں روحانی سکون حاصل نہ ہوسکا۔ آخر کار 42 سال کی عمر میں انہیں وہ روشنی دکھائی دی جس کے فیض سے ان کا دل منور ہوگیا بڑی مشقتوں کے بعد مہاویر نے حواس خمسہ پر قابو پایا تاریخ میں اس کو جینا(Jaina) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے بعد میں انہیں مہاویر بھی کہا جانے لگا، لہٰذا ان کے مذہب کو جین 'ازم' کے نام سے جانا جاتا ہے وہ جین مت کی تبلیغ وترویج میں ساری زندگی لگادی وہ 72 سال کی عمر میں پٹنہ شہر کے قریب پاوا کے مقام پر وفات پائی۔

مہاویر کا عقیدہ تھا کہ اگر انسان نجات (نروان) حاصل کرنا ہوتو اسے چاہئے کہ وہ تمام عمر روزہ رکھے۔مہاویر کے نزدیک 'انسانی نجات' موت وحیات کے چکر سے آزاد ہونے کا نام ہےاس چکر سے نجات انسانی طریقوں سے حاصل کرسکتا ہے:

1۔صحیح عقیدہ

2۔صحیح علم

3۔صحیح عمل

جین مت میں خدا کا کوئی تصور نمایاں طور پرنہیں پایا جا تا ان کا عقیدہ ہے کہ ہر شئے میں روح موجود ہےخواہ وہ چیز جاندار ہو یا بے جان یعنی وہ مٹی یا پتھر یا ہوا،جین مت کی تعلیمات میں مہاویر نے اہمسا کونمایاں اہمیت دی ہے۔جین مت کے ماننے والوں کی زیادہ تعداد گجرات، مالوہ، راجپوتانہ اور ریاست کرناٹک میں پائی جاتی ہے۔

جین مت بھی ہندوستان میں پیدا ہوا۔اس مذہب کا ارتقاء ہندو مذہب میں ویدک دور کے بعد شروع ہوا ہندو مذہب نے عورت کو مذہبی امور میں بےخل کردیا تھا لیکن جین مت نے عورتوں کی آزادی زیادہ سے زیادہ حمایت کی جین مت کے تیرھویں تیرتھنکر مہاویر جین کی نظر میں عورت اور مرد دونوں برابر حیثیت رکھتے ہیں، بدھ مت کی طرح جین مت میں بھی راہبانہ زندگی نجات کا ذریعہ سمجھا جاتا ہےاوراس نجات کے راستے پر چلنے کے لیے مردوں کے ساتھ عورتوں کو مساوی مواقع دیئے گئے ہیں،آمنہ تحسین نے لکھا ہے:

''جین مت عورتوں اور مردوں دونوں کی راہبانہ زندگی
پر بہت زور دیتا ہے اور مذہبی تنظیمیں جو سنگھ ہوا کرتے تھے
ان میں راہبوں اور راہباؤں دونوں کی تعداد تقریباً مساوی

ہوا کرتی تھیں''۔39ؔ

جین مت میں عورتوں کو مذہب میں مردوں کے مساوی حقوق کے علاوہ، تعلیم، وتبلیغ، فنون لطیفہ، شاعری، اور فن تعمیر سیکھنے کی آزادی دی گئی تھی جس کی وجہ سے اس دور میں عورتوں میں چھپے ہوا ہنر کے اظہار کا موقع ملا اور عورتوں نے جین مت کی تبلیغ کے لیے جو سنگ تراشی کی جاتی تھی اُس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس اقتباس سے واضح ہے:

بدھ مت سے ایک قدم آگے بڑھ کر جین مت نے عورت کو اعلیٰ درجات، اور قیادت کا حق بھی دیا جین مت میں راہبانہ زندگی کو موکش کہتے ہیں موکش مذہبی عقیدے کا مقدس عمل ہے اور موکش حاصل کرنے کا حق عورت کو مرد کے برابر حاصل ہے۔

اکثر مذاہب میں عورتوں کو شہوت بھڑکانے والی گمراہ کرنے والی نا قابل اعتبار قرار دیا ہے ایسا تصور جین مت میں بھی پایا جاتا ہے تا کہ راہب موکش حاصل کرنے میں اپنے نفس کی پیروی نہ کرے۔

جین مت میں بیوی کی قدر کی جاتی ہے اور راہب کو صرف ایک بیوی رکھنے کی اجازت دی گئی ہے جس کی وجہ سے عورت کا مقام کسی حد تک اونچا ہوا۔ اقتباس:

''جین مت میں کثیر زوجگی ممنوع ہے''۔40ؔ

جین مت میں عورتوں کو بہت سی مراعات حاصل ہیں لیکن ان سب کے باوجود بیوہ کے لیے قدیم روایات پر ہی عمل کیا جاتا تھا۔ بیوہ کی دوسری شادی کی اجازت نہیں دی گئی تھی اسے کو عام عورتوں کی طرح سجنے سنورنے اور آرام دہ زندگی سے پرہیز کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

جین مت میں عورت کو جائیداد کے مالکانہ حقوق دیئے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ بیوہ کو اُس کے شوہر کے مرنے کے بعد اس کے جائیداد کی مختار کل کہا گیا اور ساتھی ہی، بیوہ کو راہبہ بننے کا بھی اختیار حاصل ہے

تمام مذاہب کی طرح بدھ مت اور جین مت میں ماں کا مقام اونچا ہے

## زرتشتی مذہب میں عورت کا مقام:

ہندوستان میں پارسی مذہب کے لوگ کم تعداد میں ہیں۔ یہ زرتشتی ہوتے ہیں، یعنی آگ کی عبادت کرتے ہیں ان کی عبادت گاہیں آتش کدے کہلاتے ہیں اس مذہب میں عورت کو مرد کے مساوی درجات دیئے گئے ہیں، عورت کو مذہبی وغیر مذہبی تعلیم حاصل کرنے کا حق دیا گیا ہے اورانھیں جائداد کی ملکیت کا حق بھی حاصل ہےصغراءمہدی لکھتی ہیں:

'' ان کے یہاں خاندان اور معاشرے دونوں میں
عورت معزز سمجھی جاتی ہے اس کو جائداد میں حصہ لینے کا حق
ہے، مذہبی اور غیر مذہبی تعلیم حاصل کرسکتی ہیں شوہر کوطلاق
دے سکتی ہیں دوسری شادی کرسکتی ہیں''۔41

پارسیوں میں یہ رواج عام ہے کہ شادی بیاہ اپنی برادری میں کیا جائے اگر کوئی لڑکا دوسرے مذہب کی لڑکی سے شادی کرتا ہے تو قابل معافی ہے لیکن کوئی زرتشتی لڑکی دوسرے مذہب کے لڑکے کے ساتھ شادی کرتی ہوتو معافی کی حقدار نہیں ہوتی۔ایسی لڑکیوں کو مذہب سے خارج کردیا جاتا ہےصغرامہدی لکھتی ہیں:

'' پارسیوں میں اگر کوئی مرد کسی پارسی عورت سے شادی
کرے تو معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے،اوراس کے بچے پارسی
ہی مانے جاتے ہیں''۔

''لیکن کسی پارسی عورت کو غیر پارسی مرد سے شادی
کرنے کا حق حاصل نہیں ہے یہاں تک کہ اسے آتش
کدے میں داخل ہونے کی اجازت بھی نہیں ہے''۔42

غرض پارسی مذہب میں مرد کے مقابلے عورت کے حقوق کم ہیں اور مرد کی حیثیت ہی اعلیٰ سمجھی جاتی ہے۔

## عیسائی مذہب میں عورت کا مقام

عیسائی مذہب یروشلم سے شروع ہوا اور آج دنیا کے مغربی مما لک کی آبادی کی اکثریت مذہب عیسائیت کی پیروی کرتی ہے۔اس مذہب کی مقدس ہستی بی بی مریم علیہ السلام ہیں انہیں کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ یروشلم اور اطراف و اکناف کے علاقوں میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کی، عیسائی تثلیث پر ایقان رکھتی ہے، یعنی خدا، بی بی مریم اور عیسیٰ علیہ السلام ۔ اِس مذہب کی مقدس کتاب انجیل(Bible) ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اس مذہب کی تبلیغ عیسیٰ علیہ السلام Disciples اور پادریوں کے ذریعہ عمل میں آئی۔لیکن پادریوں نے عورتوں کے تئیں جو تصویر پیش کی ہے وہ عورت کے مقام کو بالکل گھٹا دیتا ہے۔

عیسائیت میں عورت کو مذہبی مبلغین نے حقیر اور دوسرے درجہ کی مخلوق کہا ہے وہ عورت کو آدم علیہ السلام کے بعد پیدا ہونے والی شئے مانتے ہیں چونکہ آدم علیہ السلام مرد تھے اور انہیں پیدا کیا گیا اور اس کے بعد حوا علیہ السلام کی تخلیق ہوئی اسی بات کو بنیاد مان کر وہ عورت کو مردوں کی محکوم، غلام کا درجہ دیتے ہیں۔

''عیسوی شریعت کو پھیلانے والے پولوس رسول نے عہد نامہ جدید میں تیموتاؤس'' کے نام اپنے پہلے خط میں لکھا:

> ''چاہئے کہ عورت چپ چاپ کمال فرماں برداری سے
> تعلیم پائے اور میں اجازت نہیں دیتا کہ عورت تعلیم دے یا
> مرد پر حکم چلائے بلکہ خاموشی کے ساتھ رہے۔

کیونکہ آدم پہلے بنایا گیا اس کے بعد حوا۔

اور آدم نے فریب نہیں کھایا مگر عورت فریب کھا کر گناہ

میں پھنس گئی''۔43

عیسائی علماء اس بات پر متفق تھے کہ عورت مرد کے زیر رہے وہ کسی پر حکم چلانے کی روادار نہیں ہو سکتی تھی اور نہ ہی وہ مشورہ دے سکتی تھی ثریا بتول علوی ایک پادری کے خط کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''سینٹ پال اپنے ایک خط میں لکھتا ہے'' عورت کو

کمال تابعداری سے سیکھنا چاہئے میں اسے اجازت نہیں

دیتا کہ وہ کچھ سکھائے یا مرد پر حکم چلائے اس کا کام تو یہ ہے

کہ چپ چاپ مکمل فرمانبرداری کرے''۔44

عیسائی مذہب میں یہ مانا جاتا ہے کہ خدا نے پہلے آدم علیہ السلام کی تخلیق کی اور انہیں بڑے آرام و آسائش کی دنیا، (دنیائے جنت) میں رکھا گیا بعد میں آدم علیہ السلام کی ساتھی کے طور پر حوا علیہ السلام کی تخلیق کی گئی اور یہ دونوں جنت کی آسائشوں سے مزین زندگی گزار رہے تھے لیکن جنت میں رہنے کی ایک شرط یہ تھی کہ ایک ممنوعہ پیڑ کے پھل کو نہ کھایا جائے ماں حوا شیطان کے بہکاوے میں آ کر وہ ممنوعہ پھل خود بھی کھایا اور آدم علیہ السلام کو بھی کھانے کے لیے مجبور کر کیا جس کی بنا پر آدم اور پر حوا خدا کی پھٹکار پڑتی ہے اور انہیں دنیائے آزمائش میں بھیجا جاتا ہے اس روایت کے مطابق عیسائی عورت کو اس دنیا کے دکھ تکالیف کا سبب مانتے ہیں چنانچہ ''پرانا عہد نامہ'' میں لکھا گیا ہے۔

حضرت آدم کو پھل کھانے کی ترغیب دینے پر حضرت حوا کو خدا نے سزا کے طور پر یہ حکم دیا:

''میں تیرے دردِ حمل کو بڑھاؤں گا۔ تو درد کے ساتھ بچے

جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کے طرف ہوگی اور وہ تجھ پر

حکومت کرے گا''۔(پرانا عہدنامہ 16-17ص:د)45؎

چنانچہ عیسائیت کے ان تصورات کے نتیجہ میں سماج میں عورت سے نفرت بڑھ گئی عورت کو تمام برائیوں کی جڑ اور شیطان کے بہکاوے میں آنے والی قرار دیا گیا۔سماج میں عورت کی مذہبی نکتہ نظر سے کوئی خاص حیثیت باقی نہ رہی۔مردوں کے مقابلے میں اسے کم تر درجہ دیا گیا،صغرا مہدی بھی بائبل کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''بائبل میں عورت کا تصور بہکانے والی اور تحریص دینے
والی کا ہے''۔46؎

عیسائیت میں عورت کو جائداد کے حق سے محروم رکھا گیا ہے کیونکہ عورت کو مرد کا محکوم کہا گیا ہے اسی لئے مردوں کو ہی جائداد کے حقوق دیئے گئے ہیں عورت کو شوہر کی فرمانبردار،فرض شناس رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔صغرا مہدی لکھتی ہیں:

''(عیسائیت) میں شوہر کے اس حق کو تقویت دی کہ وہ
بیوی پر اور اس کی جائداد پر اپنا کنٹرول رکھے۔لیکن
میاں بیوی کے باہمی رشتے میں فرض شناسی اور عزت پر بھی
زور دیا گیا''۔47؎

عورت کو انجیل میں شوہر کی فرمانبرداری کے ساتھ ساتھ دوسری خصوصیات کا بھی ذکر کیا گیا ہے،آمنہ تحسین انجیل کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''انجیل میں ایک مثالی عورت کا تصور بھی پیش کیا گیا
ہے۔اس کی قابل ذکر خصوصیات میں اپنے ہاتھوں سے کام
کرنے کی صلاحیت ، مہربانی، محبت والی، عقل والی،

ضرورت مندوں کے لئے خیرات کرنے والی، بچوں کی
اچھی دیکھ بھال کرنے والی اور خصوصاً شوہر کو آرام وسکون
دینے والی کے طور پر پیش کیا گیا ہے''۔48

عیسائیت میں عورت کو مذہبی کتاب پڑھنے اور مذہبی رسوم ادا کرنے کی آزادی دی گئی ہے وہ راہبہ بھی بن سکتی ہے لیکن وہ کلیسا کے تنظیمی امور کی سرپرست اعلیٰ نہیں بن سکتی۔

''کلیسائی تنظیم میں پادری کو ذمہ داری اس (عورت) کو
نہیں سونپی جاسکتی''۔49

عیسائیت میں عورت کو سماج کی تعمیر میں مکمل تعاون کرنے کا حق دیا گیا ہے وہ سماج کی ایک ذمہ دار رکن ہے اسی لئے عیسائی عورتیں تعلیم وروزگار میں پیش پیش رہیں، صغرا مہدی آگے لکھتی ہیں:

''عیسائیت میں شادی عورت کی زندگی کا واحد مقصد
نہیں ہے وہ ایک ذمہ دار آزاد اخلاقی ہستی ہے۔ اس
روایت کی وجہ سے سب سے پہلے عیسائی عورتوں نے تعلیم
حاصل کی، نرسوں، ڈاکٹروں اور معلمات کی حیثیت سے
ملازمتیں حاصل کیں''۔50

مذہب عیسائی میں بچپن کی شادی کا رواج نہیں ملتا اور نہ ہی بیوہ کے ساتھ غیر اخلاقی سلوک کیا جاتا ہے، مرد صرف ایک ہی بیوی رکھ سکتا ہے کثیر زوجگی کا نظام نہیں ہے لیکن عورت شادی کے بعد کسی بھی صورت میں شوہر سے علاحدہ نہیں ہوسکتی۔ مستقل شادی کے نظریے کی وجہ سے عورت شوہر کی محکوم بن کر رہتی ہے۔اس کے متعلق آمنہ تحسین نے وضاحت کی ہے:

''عیسائی مذہب میں کثیر زوجگی ممنوع ہے صرف ایک

ہی بیوی کے مقام نے کسی حد تک اس مذہب میں عورت
کے مقام کو بہتر کیا ہے۔ وہیں مستقل شادی کے نظریئے نے
شادی کو ایک مقدس بندھن قرار دیا ہے جس کی وجہ سے
طلاق کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مختلف نامساعد حالات میں
بھی عورت اپنی شادی کے رشتے کو منقطع نہیں کرسکتی''۔ 51

عیسائیت نے عورت کو کئی ایک حقوق دیئے ہیں لیکن عورت کو مرد کے مساوی حقوق نہیں دیئے گئے اور نہ ہی عورت کو مردوں کے برابر سماجی، مذہبی اور مملکتی حقوق دیئے گئے۔

## مذہب اسلام میں عورت کا مقام

مذہب اسلام عربستان سے شروع ہوا لیکن اس مذہب میں قدیم ترین مذاہب جیسے یہودیت، عیسائیت کی بنیادیں پیوستہ ہیں۔ اسی لئے مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اللہ کے آخری رسول حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم جس دین کو لوگوں کے سامنے پیش کیا وہ دین اسلام ہے مذہب اسلام میں سوائے اللہ کے کسی اور کی عبادت کسی بھی صورت میں نہیں کی جاتی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ اسلام کو اپنے بندوں تک پہنچایا۔ اسلام کے بنیادی ارکان پانچ ہیں۔

1۔ توحید ورسالت کا اقرار(اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ ایک ہے اور محمد صلعم اللہ کے رسول ہیں)۔

2۔ نماز (روزآنہ پانچ وقت کی نماز فرض ہے)

3۔ روزہ (اسلامی سال کے نویں مہینے رمضان کے روزے رکھنا)

4۔ زکوٰۃ (صاحب نصاب پر زکوٰۃ فرض ہے)

5۔حج (صاحب استطاعت کے لئے زندگی میں ایک مرتبہ حج فرض ہے)

مسلمانوں کی مقدس کتاب جو بذریعہ وحی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی وہ قرآن مجید ہے۔قرآن مجید دستور حیات ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے اپنے آخری رسول محمد صلعم پر بذریعہ وحی نازل فرمائی۔

مسلمانوں کے پاس قرآن مجید کے بعد احادیث کا درجہ ہے، احادیث حضرت محمد صلعم کی فرمائی ہوئی ہدائتیں ہیں، جو اپنی عملی زندگی میں برت کر دکھایا۔

موجودہ دور میں اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اسلام نے عورت کو مرد کے برابر حیثیت نہیں دی ہے اور اس کی ترقی پر اتنی پابندیاں عائد کر دی ہیں کہ وہ زندگی کی دوڑ میں لازماً پیچھے رہ جاتی ہے اور ہمیشہ مرد کی دست نگر رہتی ہے حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام نے سب سے پہلے مساوات مرد وزن کا علم بلند کیا ہے۔

اسلام میں مرد و عورت کی مساوات پر چھٹی صدی عیسوی میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان رسالت اور قرآن پاک کے احکام کے ذریعہ عمل میں آیا۔بقول قرۃالعین حیدر:

''اسلام نے عورت کو بعض ایسے اعزازات دیئے جو اس
وقت دنیا میں عورتوں کو کہیں بھی حاصل نہیں تھے اور مذہبی
اعزاز و استحاق انہیں مغربی ممالک میں 1918ء سے پہلے
مل سکے''۔52

مرد و عورت کے پیدائشی حقوق اور ان کا فطری ایکدوسرے پر انحصار کرنا اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے۔

''اسلام کی نظر میں عورت اور مرد کی کوئی تفریق نہیں ہے۔

سارے انسان نفس واحد سے پیدا ہوئے ہیں۔ دونوں کی اصل

ایک ہی ہے اس حیثیت سے اسلام مساوات مرد وزن کا پہلا

علمبردار بن کر دنیا میں ابھرتا ہے''۔ 53؎

مذہب اسلام کے ظہور سے قبل عورت کی تاریخ مظلومی، محکومی اور ذلت آمیز تھی عورت کو دوسرے درجہ کی مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ بازاروں میں جانوروں کی طرح خرید وفروخت ہوتی تھی۔ اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں تھی وہ زندگی کے ہر موڑ پر مرد کی محکوم تھی۔ لیکن قرآن کے احکام کے ذریعہ مرد کے ساتھ ساتھ عورت کو بھی محترم ومکرم قرار دیا گیا۔ اقتباس:

''یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ

نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا

رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً ج وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ

تَسَآءَلُوْنَ بِہٖ وَالْاَرْحَامَط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ

رَقِیْبًا ہ (سورہ النساء . آیت . ۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان

سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت

سے مرد اور عورتیں پھیلا دیئے اور اللہ سے ڈرو جس کے ذریعہ تم

ایک دوسرے سے مدد طلب کرتے ہو اور رشتوں کا احترام کرو۔

بے شک اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔'' 54؎

اس اقتباس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انسانی ارتقاء کا مرحلہ انسان کے جوڑے کے ذریعہ ہوا ہے نہ کہ کسی اور مخلوق کے ذریعہ، اس کے علاوہ عورت کو مرد کا ہی ایک حصہ ہونے کی تصدیق کی گئی ہے اس اولین جوڑے سے بے شمار مرد اور عورتیں پیدا ہوئے۔ ان کے درمیان رشتے اور تعلقات قائم ہوئے اور پوری نسل انسانی پھیلی اور یہ اس بات کا اعلان تھا کہ انسان ایک دوسرے

کے لئے لازم وملزوم ہیں ایک انسان دوسرے انسان کے درمیان جو امتیازات دنیا نے قائم کئے ہیں تمام غلط ہیں مذہب اسلام مرد و عورت کو ایک دوسرے کا ادب واحترام کا درس دیتا ہے اور ان دونوں کو آپس میں زندگی کے نشیب و فراز میں ایک دوسرے کے مدد و معاون رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

مذہب اسلام نے دین اور دنیا میں عورت کا سر بلند کیا ہے کیونکہ زندگی کے حسن عمل میں جو اجر وثواب مرد کو حاصل ہے وہی عورت کو بھی حاصل ہے قرآن پاک میں صاف صاف لکھا ہے کہ:

"مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ
فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ
مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝
جو شخص بھی نیک عمل کرے گا چاہے وہ مرد ہو یا عورت
اگر وہ مومن ہے تو ہم (اس دنیا میں) اسے اچھی زندگی
بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ضرور ان
کے اچھے کاموں کا اجر عطا کریں گے"۔55

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پیدائشی طور پر کوئی نیک ہے اور نہ ہی بد، نہ کوئی نیچی ذات کا ہے اور نہ اونچی ذات کا بلکہ نیک عمل کے ذریعہ انسان عزت واحترام کا مستحق ہے تمام مذاہب میں نیک اعمال کی تعریف ایک جیسی ہے جیسے کہ سچ کہنا، انصاف، غربا، فقرا، کی مدد، بے کس یتیموں سے حسن سلوک امن و امان کا قائم رکھنا وغیرہ مذہب اسلام میں بھی یہی درس دیا گیا ہے۔

مذہب اسلام نے عورت کو صنفی نامساوات کے نظریئے سے آزاد کیا۔ عورت کو تمام درجات دیئے گئے جو زمانے جاہلیت میں اس سے چھن گئے تھے اُس کو مقدس عبادات اور رسم و رواج میں مرد کے برابر درجہ دیا گیا۔ بقول سید قطب:

''اسلام نے عورت کو بحیثیت ایک صنف کے پوری
طرح مردوں کی صنف کے مساوی قرار دیا ہے اس نے
صرف ایسی برتری کو روا رکھا ہے جس کی بنا فکری استعداد و
استطاعت اور ذمہ داری ومہارت ہے، اور ظاہر ہے کہ اس
کا فی نفسہ جنسی اختلاف سے کوئی تعلق نہیں۔ جہاں بھی
فطری استعداد ، ذمہ داری اورمہارت یکساں ہو وہاں
دونوں کو مساوی مقام دیا گیا ہے۔۔۔۔روحانی اور دینی
اعتبار سے دونوں برابر ہیں''۔56؎

قرآن پاک کے اس اقتباس سے بھی یہ تصدیق ہوتی ہے کہ دینی اور روحانی اعتبار سے مرد اور عورت مساوی ہیں:

''وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ
ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ
يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا۝

''جو نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ
مومن ہوتو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان
کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی''۔57؎

ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان دنیا نے جو امتیازات قائم کیئے ہیں قرآن پاک کی اس آیت سے باطل ثابت ہوتے ہیں:

''فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِيْعُ

**عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ج**

**بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ** ج(آل عمران.195)

جواب میں اُن کے رب نے فرمایا! میں تم میں سے کسی کا

عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں خواہ مرد ہو یا عورت ،تم

سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو''۔58

مذہب اسلام میں انسان کی معاشرتی زندگی کے جو کام ہیں اُس کا اجروثواب دنیاوآخرت میں حاصل ہونے کے احکام قرآن پاک میں صادر ہوئے ہیں اس اجروثواب کے مستحق بلاتفریق مرداورعورت دونوں ہیں کسی فریق کو کسی فریق پر فوقیت نہیں دی گئی۔مندرجہ ذیل آیت میں دونوں کو یکساں مخاطب کیا گیا ہے:

**''اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ**

**وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ**

**وَالصّٰدِقٰتِ وَ الصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ**

**وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ**

**وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ**

**وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ لا**

**اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ہ**

بلا شبہ مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور اہل ایمان مرد

اور اہل ایمان عورتیں اور بندگی کرنے والے مرد اور بندگی

کرنے والی عورتیں اور سچ بولنے والئے مرد اور سچ بولنے

والی عورتیں اور صابر مرد اور صابر عورتیں اور خشوع کرنے

والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں اور صدقہ کرنے

والے مرد اور صدقہ کرنیوالی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ

دار عورتیں اور شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والی عورتیں اور

اللہ تعالیٰ کو زیادہ یاد کرنے والے مرد اور زیادہ یاد کرنے والی

عورتیں اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور اجرعظیم تیار کیا''۔

(الاحزاب۔35)59ء

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب اسلام میں مردوں کو کسی بھی میدان کارِ زندگی میں چھوٹ نہیں دی ہے بلکہ ہر قدم پر دونوں کو عبادت، صداقت، صبر، مظلومیت، پاکدامنی کو اپنا کر زندگی گزارنے کی نصیحت کی گئی ہے اور ایسے ہی لوگوں کو دنیا اور آخرت میں کامیابی حاصل ہوگی۔

اسلام نے مرد اور عورت کو برتر یا کم تر درجہ کی سخت مخالفت کی ہے بلکہ مرد اور عورت کو اس مذہب نے معاون و مددگار کے رشتہ سے باندھا ہے۔ انسان کی معاشرتی زندگی میں ہر موقع پر مرد اور عورت کو ایک دوسرے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ سماج میں کئی ادارے، محکمہ جات، سوسائٹیاں پائی جاتی ہیں جن کو چلانے کے لئے مرد و عورت کو ایک دوسرے کے معاون ہونا ضروری ہے قرآن پاک میں ارشاد ہے:

''ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے

کے معاون ہیں وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے

روکتے ہیں''۔(التوبہ۔۹)60ہ

مذہب اسلام میں عورت کو اس کے فطری تقاضوں کی بنیاد پر گھر کے ذمہ داریوں کی پورا کرنے کی تلقین کی ہے۔ عورت کا مزاج، رجحان اور نفسیات بھی اس کا تقاضہ کرتے ہیں عورت کے اندر محبت دلداری، ہمدردی و غم خواری، ایثار و قربانی، صبر و تحمل حلم و بردباری اور خدمت کے جذبات مرد سے زیادہ ہیں۔ ان کی وجہ سے وہ اپنے ماحول کو مسرت اور خوشی، راحت اور سکون اور دلجوئی اور محبت سے بھر سکتی ہے۔

زندگی کی مشکلات کا سامنا کرنے اور ہر طرح کے نشیب وفراز میں ثابت قدمی کے ساتھ آگے بڑھنے کے لئے طاقت جفاکشی،عزم و ہمت کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ مرد میں یہ صفات زیادہ پائی جاتی ہیں اسی لئے فطری طور پر مردوں کو پیچیدہ اور دشوار مسائل تفویض کیے گئے ہیں قرآن پاک میں ارشاد ہے:

''اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ

بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ط

(النساء۔۳۴)

''مرد عورتوں پر قوام ہیں اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں

سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد

اپنے مال خرچ کرتے ہیں''۔ 61

مذہب اسلام عورت کے لیے عزت وشرف کا مقام اس کا گھر سمجھتا ہے اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ عورت گھر کو راحت کدہ اور سکون کا مرکز بنادے تا کہ گھر پہنچ کر مرد اپنی ساری تکلیفیں پریشانیاں بھول جائے قرآن پاک میں ارشاد ہے:

''وَقَرْنَ فِىْ بُيُوْتِكُن (الاحزاب۔۳۳)اور اپنے

گھروں میں سکون سے رہو''۔62

مذہب اسلام میں عورت کو گھر میں پرسکون رہ کر اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کا جو حکم دیا گیا ہے لوگ اس کی غلط تاویل پیش کرتے ہیں حالانکہ اسلامی نکتہ نظر سے عورت کو پردے میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے اور تجارت کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔اسلام کی تاریخ میں کئی ایسی مثالیں ملتی ہیں جیسا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی بیوی خدیجۃ الکبریؓ عرب کی رئیس تاجر تھیں اور ام المومنین حضرت عائشہؓ اپنے وقت کی بڑی عالمہ اور ریاضی داں کہلاتی ہیں۔ پردہ اور عورت کی معاشرتی زندگی پر شمیم نکہت لکھتی ہیں:

''اسلام نے عورت کو پردہ کرنے کا حکم دیا۔اسلام سے
قبل بھی پردے کا رواج تھا۔لیکن اس رواج اور اسلام کے
حکم میں فرق ہے۔وہ رواج صرف شان ریاستوں کی بناء
پر تھا کہ بڑے آدمیوں کی عورتیں پردے میں رکھی جاتی تھیں
اور نچلے طبقہ کی عورتیں عام طور پر باہر نکلتی تھیں لیکن اسلام
نے تمام عورتوں کے لئے یکساں قانون بنایا اور حکم دیا کہ
عورتیں دیدہ دانستہ اپنی نمائش نہ کریں چونکہ بے حجاب مرد و
زن سے ملنے اور ان کے سامنے آنے جانے میں معاشرتی
خرابیوں کے پیدا ہونے کا زیادہ امکان تھا۔اس لیے کہا گیا
کہ جہاں سامنے آئے بغیر مطلب نہ حل ہوسکتا ہو وہاں سے
بے شک پردے کی اوٹ سے کام لو''۔63؎

سماجی برائیوں میں بے حیائی ایک بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔مذہب اسلام صاف ستھرے سماج کی تشکیل کی حمایت کرتا ہے۔عورت کو پردے میں رہنے کا حکم عورت کی آزادی کو ختم کرنا نہیں بلکہ عورت کی حفاظت کرتا ہے۔شمیم نکہت بھی یہ بات لکھتی ہیں۔

''اسلام میں کھلم کھلا مردوں اور عورتوں کے ملنے کو پسند
نہیں کیا گیا ہے لیکن گھر سے باہر جانے کی ممانعت بھی نہیں
کی گئی ہے بشرطیکہ باہر جانا نمائش کے لیے نہ ہو۔ضرورت
کے تحت گھر سے باہر جایا جا سکتا ہے۔لیکن ایسی حالت میں
مردوں کو بھی حکم دیا گیا ہے کہ وہ عمداً کسی عورت کی طرف نہ
دیکھیں''۔64؎

مذہب اسلام میں صرف عورت کو ہی برائیوں کے لئے مور دِالزام نہیں ٹھہرایا بلکہ جہاں کہیں بھی تاکید کی گئی ہے وہاں مرد کو بھی ملوث کیا گیا ہے۔قرآن پاک میں عورت کے حقوق کی وضاحت کی گئی ہے۔عورت کی مختلف حیثیتوں یعنی ماں،،بہن، بیوی، بیٹی کے مقام ومرتبہ کے ساتھ ساتھ ان کے حقوق وفرائض کی وضاحت کردی گئی موجودہ دور میں ان تمام حقوق کی عمل آوری کے ذریعے ایک صحت مند معاشرہ تشکیل پاسکتا ہے۔

موجودہ دور کی بے راہ روی کے بھیانک نتائج پر روشنی ڈالتے ہوئے سید جلال الدین عمری لکھتے ہیں:

''موجودہ دور میں جہاں کہیں اختلاط مرد و زن کی
اجازت دی گئی وہاں اس کے بڑے بھیانک تجربہ ہوا ہے۔
عفت وعصمت اجڑ گئی اور جنسی آوارگی وبائے عام کی طرح
پھیل گئی ہے اب اس کی اصلاح بھی اتنی دشوار ہوگئی ہے کہ
اسے ایسی سماجی برائی کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا ہے جس
سے نجات کی کوئی صورت نہیں ہے اور اس کے نتائج بد کو بھی
چارو ناچار برداشت کیا جارہا ہے''۔ 65

اسلام عفت وعصمت کے معاملہ میں بڑا احساس واقع ہوا ہے اس نے عورت اور مرد کے آزادانہ میل جول اور اختلاط کو سختی سے منع کیا ہے، وہ اس بات کو غلط سمجھتا ہے کہ عورت اور مرد کی کھلم کھلا آزادی خود کو ایسی آزمائش میں ڈال دیں کہ اس سے نکلنا ان کے لیے مشکل ہوجائے۔

مذہب اسلام نے زنا اور بدکاری کے ارتکاب ہی سے نہیں بلکہ اس کے قریب جانے سے بھی منع کیا ہے قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

''وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ط وَسَآءَ سَبِيْلًا

(بنی اسرائیل۔32)

زنا کے قریب مت پھٹکو اس لیے کہ وہ بے حیائی کا کام

ہے اور بہت ہی برا راستہ ہے''۔

موجودہ دور میں اخلاقی اقدار پر سختی سے عمل پیرا ہوتا بہت ضروری ہے کیوں کہ اخلاقی گراوٹ پورے سماج کو برباد کر دیتا ہے اور اس کا سیدھا اثر عورت کی حیثیت کی گراوٹ کا سبب بنتا ہے۔ سید جلال الدین عمری لکھتے ہیں۔

''عفت و عصمت بظاہر ایک اخلاقی قدر ہے لیکن اس

سے پورہ معاشرے کا رخ متعین ہوتا ہے''۔66؎

مذہب اسلام نے ایک طرف تو اس کے سارے حقوق از روئے قانون محفوظ کر دیئے ہیں اور دوسری طرف پورے معاشرہ کو اس کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کا حکم دیا ہے۔ اسلام ایسی فضا پیدا کرتا ہے کہ عورت جس حیثیت میں بھی رہے عزت و احترام کے ساتھ رہے جب تک یہ فضا باقی ہے اس کی عزت و احترام میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔ گھر میں عورت کی تین نمایاں حیثیتیں ہیں، ماں، بیوی، اور بیٹی۔ اسلام نے ان تینوں حیثیتوں میں اسے بڑا اونچا مقام عطا کیا ہے۔ اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے کوئی اس سے اس کا مقام چھین نہیں سکتا۔

مذہب اسلام میں خدا اور رسول ﷺ کے بعد سب سے اونچا مقام ماں کا ہے۔ مذہب اسلام کی واحد مقدس کتاب قرآن مجید میں جگہ جگہ ماں کے ساتھ حسن سلوک اور اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ

اشْكُرْلِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ o.

ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ

اچھا سلوک کرے۔اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے
اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھوٹا ہم نے حکم دیا
کہ میرا شکر ادا کر اور اپنے والدین کا بھی شکر بجالا۔ میری ہی
طرف تجھے پلٹنا ہے۔ (لقمان:14)67

بچہ کی نگہداشت، پرورش، خدمت اور تعلیم و تربیت میں ماں، باپ دونوں برابر کے شریک ہوتے ہیں لیکن چند ایک قدرتی قانون جیسے حمل، وضع حمل اور دودھ پلانے کی تکلیف تنہا ماں برداشت کرتی ہے۔نو ماہ تک حمل کا بوجھ اٹھانا بچہ کو جنم دیا اور دودھ پلانا اور اس پورے عرصہ میں سخت احتیاط کی زندگی گذارنا آسان نہیں ہوتا۔اس صعوبت کے برداشت کرنے میں باپ شریک نہیں ہوتا۔اس لیے ماں کا احسان باپ سے زیادہ ہے۔قرآن مجید میں ارشاد ہے

"وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسَانًا ؕ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا ١٤
وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا

"ہم نے انسان کو وصیت کی کہ وہ اپنے والدین کے
ساتھ حسن سلوک کرے۔ اس کی ماں نے تکلیف اٹھا کر
اسے پیٹ میں رکھا اور تکلیف اٹھا کر اسے جنا اس کے حمل
اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے"۔68

(الاحقاف:15)

عملی ذمہ داریوں سے صرف نظر کرتے ہوئے خالص انسانی اعتبار سے مذہب اسلام نے عورت کو مرد سے کہیں زیادہ درجہ دیا ایک حدیث کے مطابق:

"ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس

آ کر کہا: اے رسول اللہ میرے حسن سلوک کا سب سے
زیادہ حقدار کون ہے؟
آپؐ نے فرمایا: ''تیری ماں'' اس نے پوچھا اس کے
بعد کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا ''تیری ماں'' سائل نے پھر
دریافت کیا، اس کے بعد کس کا نمبر ہے اپﷺ نے
جواب دیا: ''تیری ماں'' اس نے کہا پھر کون؟ آپؐ نے
فرمایا ''تیراباپ''۔(بخاری ومسلم) 69

مذہب اسلام میں خدا کے بعد انسان پر سب سے زیادہ حق ماں باپ ہی کا ہے۔ماں باپ کے حق کی اہمیت اور عظمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ قران پاک میں ایک جگہ ماں باپ کے حق کو خدا کے حق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

''اورآپ کے رب نے فیصلہ فرمادیا کہ تم خدا کے
سوا کسی کی بندگی نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیک سلوک
کرو۔'' (بنی اسرائیل:آیت؟)١٩ 70

والدین کا احترام کرنا ضروری ہے کیوں کہ وہ اپنی غیر معمولی قربانی سے مثل جانفشانی اور انتہائی شفقت سے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔قرآن پاک میں بھی تاکید کی گئی ہے۔

'' وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ہ ٢٣ ۔اوران سے احترام
کی بات کیجئے۔'' 71

احادیث میں ماں کی خدمت،اطاعت اوراس کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے آپ محمدﷺ کا ارشاد ہے:

"اُدُصِی امرا ً بِاُمّہٖ اُوْ صِی امْراً بِاُمِّہٖ اُوْصِی

امْراً بَاُمِّہٖ اُصِیْ امْراً بَاَبِیْہٖ o

میں آدمی کو اس کی ماں کے بارے میں تاکید کرتا ہوں

میں آدمی کو اس کی ماں کے بارے میں تاکید کرتا ہوں میں

آدمی کو اس کی ماں کے بارے میں تاکید کرتا ہوں، میں

آدمی کو اس کے باپ کے بارے میں تاکید کرتا ہوں"۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

"قُلْتُ یَارَسُوْلَاللہ مَنْق اَعْظَمُ' النَّاسِحَقاً عَلیَ

الْمَرْأَۃِقَالَزَوْجُھَا قُلْتُ مَنْ اَعْظَمُ المنَّاسِ حَقًّا عَلَی

الرُجُلِ قَالَ اُمُّھَا o

میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) عورت پر سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟ آپؐ نے فرمایا اس کے شوہر کا۔ میں نے پوچھا مرد پر سب سے بڑا حق کس کا ہے؟ آپؐ نے فرمایا اس کی ماں کا"۔72

قرآن اور احادیث کی روشنی میں یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ مذہب اسلام میں پہلے تو عورت کو اونچا مقام دیا گیا ہے دوسرے مذاہب میں بھی عورت ماں کے روپ میں محترم ہی کہلاتی ہے لیکن جن حقوق کو مذہب اسلام نے واضح کیا ہے ان کے ذریعہ عورت ماں کے روپ میں محترم اور حسن سلوک کی پہلی حقدار مانی گئی ہے۔ قاضی عیاض کہتے ہیں:

"بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ماں اور باپ دونوں حسن

سلوک کا برابر استحقاق رکھتے ہیں۔لیکن جمہور کے نزدیک ماں

کا حق زیادہ ہے۔امام نووی فرماتے ہیں یہی رائے صحیح ہے۔

اس لئے کہ صریح احادیث اس کی تاکید کرتی ہیں۔

حارث محاسبی کہتے ہیں کہ اس پر اجماع ہو چکا ہے کہ حسن

سلوک کے معاملہ میں ماں کا حق باپ سے زیادہ ہے"۔73

مذہب اسلام میں عورت کا مستقبل وجود ہے شادی کے بعد نہ تو اس کی شخصیت شوہر کی شخصیت میں گم ہو جاتی ہے اور نہ ہی وہ شوہر اور سسرال کی محکوم وغلام ہوتی ہے۔شادی کے بعد عورت بعض ذمہ داریاں سنبھالنی پڑتی ہیں وہیں بعض حقوق بھی اسے حاصل ہوتے ہیں۔

مذہب اسلام نے عورت کو الفت محبت اور سکون کا ذریعہ بنایا ہے قرآن پاک میں ارشاد ہے:

" وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ

اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً

وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ؀

اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے

لیے تمہاری ہی جنس سے جوڑے بنائے تا کہ تم ان کے پاس

سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا

کر دی یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و

فکر کرتے ہیں"۔74

اس میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عورت کوئی کم تر مخلوق نہیں ہے بلکہ عورت اور مرد ایک ہی جنس ہیں اور عورت الفت،محبت اور ہمدردی وغم خواری کی پیکر ہے اسی لیے عورت کو سکون کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

دستور کے مطابق مذہب اسلام میں عورتوں کو مساوی حقوق دیئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ باہمی حقوق کے لحاظ سے دونوں کی حیثیت یکساں ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے:

"وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ
عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ ٢٢٨

دستور کے مطابق عورتوں کے اسی طرح حقوق ہیں، جس طرح
ان کی ذمہ داریاں ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ برتری کا ہے
اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے"۔75

بیوی کو یہ حق ہے کہ وہ مرد سے نان نفقہ، رہائش، مہر، حفاظت وصیانت حاصل کرے اگر ان حقوق کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی کرے تو از روئے قانون وہ انہیں حاصل کر سکتی ہے۔

اسلامی دستور کے مطابق مرد صرف اپنی بیوی کے حقوق ہی ادا نہیں کرے بلکہ اس سے بڑھ کر اس کے ساتھ اچھے سلوک کرنے کی تاکید کرتا ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے:

" وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى
اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝ ١٩

ان کے ساتھ بھلے طریقہ سے زندگی بسر کرو۔ اگر تم ان کو ناپسند کرتے ہو
تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناپسند ہو اور اللہ نے اسی میں بہت سی بھلائی
رکھ دی ہو" 76

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بیوی سے حسن سلوک ہر حال میں مطلوب ہے۔ بعض اوقات بیوی کی

شکل وصورت، مزاج وعادات آدمی کوناپسند ہوتے ہیں اس کا اثر ازدواجی زندگی پر بھی پڑتا ہے اس طرح کے مواقع پر مرد کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ بیوی کی سیرت، ہنرمندی سلیقہ شعاری اور دوسرے پہلوؤں کو دیکھنا چاہیئے بیوی کی ایک بات ناپسند ہو تو دس باتیں قابل تعریف ہوسکتی ہیں اس لئے شرافت واخلاق کا ہی نہیں حکمت ودانائی کا یہی تقاضہ ہے کہ آدمی گھر کے وسیع مفادات کو ملحوظ رکھے اور حسن صورت کے بجائے حسن سیرت کو ترجیح دے۔

بیوی سے حسن سلوک روا رکھنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی احادیث مروی ہیں جیسا کہ:

اس حسنِ سلوک کی بہترین تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں ملتی ہیں، حضرت معاویہ قشیریؓ نے بیوی کے حقوق پوچھے تو فرمایا:

"اَنْ تُطْعِمَهَا اِذَ ا طَعِمْتَ وَ تَكْسُوْهَا اِذَا
اكْتَسَيْتَ وَلَاتَضْرِبِ الْوَجْهَ وَلَاتُقَبِّحْ وَلَاتَضْجُرْ
اِلَّا نِی الْبَيْتِ o

جب تم کھاؤ تو اسے بھی کھلاؤ، جب تم پہنو تو اسے بھی پہناؤ۔ (غصہ سے بے قابو ہوکر) اس کے منہ پر مت مارو اور اس کو برا بھلا مت کہو۔ (اس سے کنارہ کشی ضروری ہوجائے) تو گھر سے مت نکال دو بلکہ گھر ہی کے اندر اس سے علاحدہ رہو"۔

یہی روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے:

اَطْعِمُوْ هُنَّ مِمَّا تَا كُلُوْنَوَاكْسُرُ هُنَّ مِمَّا
تَكْسُوْنَ وَلَاتَضْرِبُوْهُنَّ وَلَا تَقُبِّحُوْهُنَّ o

تم جو کھاؤ وہی ان کو بھی کھلاؤ، جو پہنو وہی ان کو بھی

پہناؤ، ان کو مار پیٹ مت کرو اور برا بھلا مت کہو۔

(ابوداؤد)77ؔ

مندرجہ بالا احادیث سے واضح ہوجاتا ہے کہ عورت کو کھانے پینے پہننے میں فرق نہ کرو جو بھی گھر کے افراد کھاتے ہوں پہنتے ہوں وہی عورتوں کو بھی مہیا کیا جائے یہ بات سماج میں عام ہے کہ مرد حضرات محنت و مشقت کرتے ہیں اُنہیں مقوی غذائیں دی جانی چاہیےلیکن عورت بھی اپنی سکت کے مطابق کام کرتی ہیں جس کے بارے میں قرآن اور احادیث میں مفصل ذکر ہے لہٰذا عورتوں کو غذا اور لباس کی مساوات کے بارے میں تاکید کی گئی ہے کیوں کہ ایک عورت کا صحت مند رہنا خاندان اور معاشرہ کو صحت مند بناتا ہے۔ عورت کی کوئی بات ناگوار گزرنے پر بھی صبر وتحمل سے کام لینے کی صلاح دی گئی ہے، اس لئے کہ یہ ناگواری وقتی اور عارضی ہوتی ہے غصہ میں کیا گیا کام بعد میں شرمندگی کا باعث بنتا ہے اور غصہ کی وجہ سے باہمی تعلقات میں دراڑ پڑ سکتی ہے، اس لئیے عورتوں پر دست درازی کو منع کیا گیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا:

''لَا یَغْـرکُ مُـوْ مِنٌ مُوْمِنَةً ،نْ کَرِ ہَ مِنُهَاخُلُقاً

رَجِیَ مِنُهَا اٰخَرُ o

کوئی مؤمن کسی مؤمنہ (بیوی) سے نفرت نہ کرے اگر

اس کی ایک عادت اچھی نہ لگے تو دوسری اچھی لگے گی''۔

(مسلم)78ؔ

مذہب اسلام میں اور احادیث میں اخلاق پر بہت زور دے کر کہا گیا ہے خوش اخلاقی کو آدھا دین تک کہا گیا ہے حسن اخلاق کا عملی مظاہرہ اپنے گھر میں ہونا چاہئے نہ کہ صرف دکھانے کے لئے اپنے دوست و احباب کے ساتھ۔ بیوی زندگی کی سب سے قریب ساتھی اور غم گسار ہوتی ہے لہٰذا بیوی کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھنے

سے پرسکون زندگی حاصل ہوتی ہے۔ بیوی بچوں سے محبت اور مکمل تال میل سے گھر جنت کا نمونہ بن سکتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَاناً اَحْسَنُھُمْ خُلُقَاً

وَخِیَارُکُمْ خِیَارُکُمْ لِنِسَائِھِمْ o "

ایمان والوں میں سب سے کامل ایمان اس شخص کا ہےء

جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں اور تم میں بہتر لوگ وہ

ہیں جو اپنی عورتوں کے حق میں بہتر ہیں۔"

ایک روایت میں بیوی بچوں کے ساتھ لطف و محبت کو ایک ایسا وصف قرار دیا گیا ہے جس سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں:

" اِنَّ مِنْ اَکْمَلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَاناً اَحْسَنُھُمْ خُلُقاً

وَّ اَلْطَفُھُمْ بِاَھْلِہٖo"

"اہل ایمان میں سب سے کامل ایمان اس شخص کا ہے

جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں اور جو اپنے بیوی بچوں

کے ساتھ زیادہ لطف و محبت سے پیش آئے"۔

حضرت عائشہؓ ہی کی ایک اور روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِہٖ وَاَنَا خَیْرُکُمْ لِاَھْلِی o تم میں بہتر

شخص وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے حق میں بہتر ہو اور میں

بھی اپنے گھر والوں کے لئے بہتر ہوں ہے (ترمذی)79۔

مذہب اسلام عورت کو صرف گھر کے کام کرنے والی ڈری اور سہمی عورت سے نکال کر سماج کے

باعزت مقام تک پہنچایا ہے۔حضور اکرم ﷺ کی عملی زندگی کے تجزیئے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے وہ اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ گھر کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹاتے تھے۔لہٰذا گھر یا گھر سے باہر کے کاموں میں اعلیٰ وادنیٰ کا فرق نہیں ہے ہر کام اپنی جگہ اپنا ایک خاص مقام،اہمیت وافادیت کا حامل ہوتا ہے۔سماج میں ایک عورت کی قدر ومنزلت اس کے بیٹا یا بیٹی پیدا کرنے پر کی جاتی تھی عورت کو بیٹی پیدا کرنے پر حقارت اور ذلت کا سامنا کرنا پڑتا اور بیٹا پیدا ہونے پر عزت اور رفعت حاصل ہوتی۔لڑکا اور لڑکی کی پیدائش کا ذمہ دار عورت ہی کو ٹھہرایا جاتا مرد اِس ذمہ داری سے اپنے آپ کو الگ کر لیتا۔لوگ لڑکے کو بہت بڑا سرمایہ سمجھتے تھے اور ان کے وجود پر فخر کیا جاتا تھا ان سے فوجی قوت میں اضافہ ہوتا اور معاشی سرگرمیوں میں یہ مددگار رہوتے ان کے برعکس لڑکیوں کو بوجھ سمجھا جاتا اِن کا وجود باعث ذلت وندامت سمجھتے تھے۔قرآن مجید میں عربوں کے پاس لڑکی کی پیدائش پر ان کے جذبات کی اس طرح تصویر کشی کی ہے:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا ج
وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۵۸ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا
بُشِّرَ بِهٖ ط اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى
التُّرَابِ ط (النحل : ۵۸.۵۹)

جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غم سے گھٹنے لگتا ہے۔اس خبر بد کی وجہ سے لوگوں سے چھپا پھرتا ہے (اور اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ) آیا ذلت برداشت کرتے ہوئے اسے باقی رکھے یا مٹی کے نیچے دفن کردے۔80

عرب قبائل میں چند ایسے افراد تھے جو لڑکی کی پیدائش پر سماجی نکتہ چینی و ذلت کو برداشت کرتے

ہوئے بھی لڑکیوں کی پرورش کرتے لیکن سماجی دباؤ کے تحت عرب قبائل میں یہ رواج عام ہوگیا تھا کہ لڑکی کو زندہ دفن کر دیا جاتا۔

مذہب اسلام نے قتل اولاد کی سخت مذمت کی اسے ایک سنگین جرم قرار دیا اور ہمیشہ کے لئے اسے ختم کر دیا قرآن میں کہا گیا ہے کہ قیامت کے روز اس سنگین جرم اور سنگ دلی کا خدا کو جواب دینا ہوگا۔

قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

وَاِذَا الْمَوْءٗ دَةُ سُئِلَتْ ۙ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۚ

اور اس وقت کو یاد کرو جب کہ اس لڑکی سے پوچھا جائے گا

جسے زندہ دفن کیا گیا تھا کہ کس جرم میں اسے مارا گیا۔ 81

لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کا رواج عرب ہی نہیں دوسرے ممالک جیسے چین، جاپان، ہندوستان میں بھی پایا جاتا تھا لیکن عرب میں مذہب اسلام کی تعلیمات کے ذریعہ اس جرم کو منظر عام پر لا کر قاتلوں کو سخت سزائیں دی گئیں۔

''وہ (عرب) عورت سے اتنے بددل ہوگئے کہ لڑکیوں

کے پیدا ہوتے ہی انہیں زندہ درگور کر دینا اپنا فریضہ سمجھنے لگے

اور یہ امر ایک باقاعدہ رواج بن گیا تھا، ویسے صرف عرب ہی تنہا

اس رواج کے عامل نہیں تھے بلکہ چین، جاپان اور ہندوستان میں

بھی لڑکیوں کو والدین خود قتل کر دیا کرتے تھے''۔ 82

عربوں میں لڑکی کے زندہ دفن کرنے کی اصل وجہ جہالت اور ایک قبیلہ کا دوسرے قبیلے کے درمیان انتقاماً جنگ تھی یہ انتقامی جنگیں صدیوں سے چلی آ رہی تھیں، لڑکیوں کی وجہ سے ایک قبیلہ کی لڑکیوں دوسرے قبیلے کے لڑکوں کے درمیان دوستی ومحبت پروان چڑھنے کے آثار ہوتے تھے جو کہ عرب قبائل کو منظور نہیں تھا اس

کے علاوہ لڑکیوں کو دوسرے قبائل اغوا کر کے لے جاتے تاکے دوسرے قبیلے کو ذلیل کیا جا سکے۔ اس کی وجوہات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر شمیم نکہت لکھتی ہیں۔

''ان (عرب) کی جہالت اور سخت گیری کٹر پن اور ضد کی بناء پر صدیوں ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ سے لڑا کرتا تھا اور اس طرح سینکڑوں نسلیں صرف جنگ کے لئے وقف ہوجاتی تھیں اسی جہالت میں وہ کسی کو اپنی لڑکی دینا اپنے لئے باعث ہتک سمجھتے تھے۔لہٰذا وہ یا تو لڑکیوں کو زندہ دفن کردیتے تھے یا پہاڑ کی بلندی سے نیچے غاروں میں پھینک دیتے تھے، اسی صورت میں اسلام نے جہاں پورے نظام زندگی کو ترتیب دیا۔ وہیں عورت اور مرد کے حقوق وفرائض کے سلسلے میں بھی قوانین بنائے''۔83؎

مذہب اسلام میں لڑکے لڑکیوں کی پیدائش کو قدرت کی مرضی قرار دیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ وہ کسی کو اولاد سے نوازتا ہے اور کسی کو اس سے محروم کردیتا ہے کسی کو لڑکے عطا کرتا ہے اور کسی کو لڑکیاں کسی کو لڑکے لڑکیاں دونوں عطا کرتا ہے، ان میں سے کوئی بھی صورت نہ تو باعث افتخار رہے اور نہ ہی ذلت ورسوائی کا سبب۔ یہ سب خدا تعالیٰ کی قدرت کے کرشمے ہیں اور اِن صورتوں میں اللہ تعالیٰ کی علم وحکمت ہے قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۙ﴿۴۹﴾ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ

مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝ (سورة

الستورة ۴۹، ۵۰)

اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمان اور زمین کی بادشاہت۔

وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے،

اور جسے چاہتا ہے لڑکے عطا کرتا ہے۔ یا انہیں لڑکوں اور

لڑکیوں کے جوڑے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ بنا دیتا

ہے۔ بے شک وہ علم والا قدرت والا ہے۔84

قرآن مجید کے احکام سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عورتوں لڑکیوں کی حیثیت مردوں کے برابر ہے آبادی کا آدھا حصہ عورت پر مشتمل ہوتا ہے اور بنی آدم کی نسل کی ارتقا و بقا میں عورت، مرد کے برابر حصہ لیتی ہے لہٰذا حضور صلعم اکرم نے بھی اپنے قول و فعل سے لڑکیوں کی تعلیم تربیت اور پرورش کو مقدم رکھا ہے:

لڑکیوں کی پرورش کی ترغیب دی گئی۔ اسے کارِ ثواب اور حصولِ جنت کا بہت بڑا ذریعہ قرار دیا گیا۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَن بُلِیَ مِنْ هٰذِهِ النَبات شَيئاً فَاَحْسَن اَلَيهن

كُنَّ لَهٗ ستراً مِنَ النَّارِ .

اللہ تعالیٰ جس شخص کو ان لڑکیوں کے ذریعہ کچھ بھی

آزمائش میں ڈالے اور وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے

تو وہ اس کے لیے جہنم سے بچاؤ کا ذریعہ

ہوگی۔(بخاری)85

احادیث میں دو تین لڑکیوں یا بہنوں بلکہ ایک لڑکی اور ایک بہن کی پرورش پر بھی جنت کی خوشخبری دی

گئی ہے۔۔حضرت عتبہ بن عامرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ كَـانَـتْ لَـهُ ثَلَاثُ بَـنَـاتٍ فَصَبَـرَ عَلَيْهِنَّ

فَأَطْعَمَهُنَّ وَسَقَا هُنَّ وَكَسَا هُنَّ مِنَ النَّارِ .

جس شخص کے تین لڑکیاں ہوں، وہ ان کے سلسلہ کی

پریشانیوں پر صبر کرے اور اپنی محنت کی کمائی سے ان کو

کھلائے، پلائے اور پہنائے تو وہ اس کے لیے جہنم کی آگ

سے حجاب بن جائیں گی۔(مسند احمد)(ابن ماجہ) 86

مذہب اسلام میں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کی تاکید کی ہے لڑکی کا مرتبہ لڑکے کے مساوی ہے۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وفعل سے واضح کیا ہے کہ:

''علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض

ہے''۔ (ابن ماجہ)87

لڑکیوں کی تعلیم و تربیت اسلامی معاشرے میں یکسانیت کے ساتھ ہوتی ہے۔اس بارے میں ''مالک رام'' نے واضح انداز میں لکھا ہے:

''قرآن سے ہر جگہ اعمال صالح کے اجر میں عورت کو

مرد کے برابر کا درجہ دیا ہے اس لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ

لڑکیوں کی تعلیم کو لڑکوں کی تعلیم سے کم اہمیت دیتا۔88

لڑکیوں کی پرورش و حسن سلوک کی ذمہ داری والدین کے علاوہ بھائیوں پر بھی عائد ہوتی ہے والد کے علاوہ خاندان کی کفالت لڑکوں کے ہاتھوں میں بھی ہوتی ہے لہٰذا احادیث میں اس کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ اگر بھائیوں نے بہنوں کے ساتھ حسن سلوک کیا اُن کی پرورش پر خرچ کیا تو بھائیوں کو بھی اجر وثواب

حاصل ہوگا۔ اسی تعلق سے حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

''لَایَکُونُ لِاَ حَدِ کُمْ ثَلَاثُ بَنَاتٍ اَوْ ثَلَاثُ اَخَوَاتٍ فیحُسِنُ اِلَیْھِنَّ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّۃَ.

(ترمذی)۔

تم میں سے جس کے تین لڑکیاں یا تین بہنیں ہوں اور وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے تو جنت میں ضرور داخل ہوگا''۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مَنْ عَالَجَرِیَتَیْن حَتّٰی تَبْلُغَاجاءَ یومَ الْقِیَا مَۃِ اَنَا وَھُوَ ھٰکَذا . ''

''جو شخص دو بچیوں کی ان کی جوانی کو پہنچنے تک پرورش کرے گا قیامت کے روز میں اور وہ اس طرح (مل کر) آئیں گے۔ (یہ کہہ کر آپ نے انگشتہائے مبارک کو ملا کر دکھایا)''۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مَنْ کُنَّ لَہٗ ثَلَاثُ بنَاتٍ فَصَبَرَ عَلیٰ لَاوَائِھِنَّ وَضَرَّ ائِھِنَّ اَدْ خَلَہُ اللہُ الْجَنَّۃَ بَرَحْمَتِہٖ اِیَّا ھُنَّ قَالَ فَقَالَ رَجُلٌ وَاِبْنَتَانِ یَارَسُوْلَاللہِ قَالَ وَاِنْ ابنَتَنِ قَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللہ وَوَاحِدَۃٌ قَالَ وَوَحِدَۃٌ .

(مسندک حاکم)

''جس کسی کے تین لڑکیاں ہوں اور وہ ان کے سلسلہ کی تکلیفوں اور معاشی پریشانیوں پر صبر کرے تو ان کے ساتھ اس کی ہمدردی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔فرماتے ہیں اس پر ایک شخص نے پوچھا اگر کسی کے دو لڑکیاں ہوں (اور وہ ان کے سلسلہ میں تکلیف برداشت کرے تو؟) آپ نے فرمایا، دولڑکیاں ہوں تو بھی (اللہ تعالیٰ جنت عطا فرمائے گا) ایک شخص نے کہا اگر ایک ہو؟ آپ نے فرمایا ایک ہو تو بھی''۔89؎

لڑکوں اور لڑکیوں میں امتیازی سلوک پر مذہب اسلام نے منع کیا ہے عام طور پر جو لڑکوں سے زیادہ محبت کی جاتی ہے غذا لباس تعلیم وتربیت کے معاملات میں لڑکوں کے ساتھ ترجیحی سلوک برتا جاتا ہے یہ سراسر ظلم اور ناانصافی ہے حدیث میں اس سے منع کیا گیا ہے۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مَنْ كَانَت لَهُ أُنْثٰى فَلَمْ يَئِدْ هَا وَلَمْ يُحِنْهَا وَلَمْ يُؤْثِرُوَلَدَهُ عَلَيْهَا يَعْنِى الذُّكُوْرَادْخَلَهُ اللهُ الْجَنَّةَ .

''جس شخص کے لڑکی ہو وہ نہ تو اسے زندہ درگور کرے اور نہ اس کے ساتھ حقارت آمیز سلوک کرے اور نہ اس پر اپنے لڑکے ہی کو ترجیح دے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے گا''۔90؎

ان احادیث میں لڑکیوں کی پرورش ،تعلیم تربیت، شادی بیاہ اور ان کے ساتھ حسن سلوک میں مساوات کے ذریعہ اجروثواب کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔اسی بات کو مالک رام لکھتے ہیں:

"جب یہ مسلم ہے کہ لڑکی اور لڑکا دونوں ہماری اولاد ہیں اور ہمیں ان سے یکساں سلوک کرنا چاہئے تو ظاہر ہے کہ ان کی تربیت میں بھی کسی طرح کا امتیاز نہیں ہوسکتا پس یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ کوئی شخص عام حالات میں لڑکی کو لڑکے سے کم درجہ دے کر اس تعلیم و تربیت نظر انداز کردے"۔91

مذہب اسلام میں عورت کے رشتوں کے احترام میں ہر بات کو واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے ایک عورت کو مرد کے مساوی صنف کا درجہ دیا گیا ہے اور ماں کی ذمہ داریوں اور تکالیف پر زیادہ درجات عطا کئے ہیں اور بیوی کو گھر کی نوکرانی نہیں بلکہ مالکہ کا درجہ دیا گیا ہے اور لڑکیوں کی پرورش اور تربیت اور حسن سلوک کو موجب اجروثواب قرار دیا گیا ہے اتنا ہی نہیں عورت کو اپنے شوہر کو پسند کرنے اور کوئی معقول وجہ سے علاحدگی اختیار کرنے کا بھی حق دیا گیا ہے۔ بیوہ کی شادی کی کھلی اجازت دی گئی ہے بیوہ کو کسی بھی طرح سے تکلیف پہنچانے سے روکا گیا ہے اس ضمن میں حضور ﷺ نے فرمایا:

"بیوہ کا نکاح بلا اس سے صاف اجازت حاصل کیے نہ کیا جائے اور کنواری کا نکاح بھی اس کا اذن حاصل کئے بغیر نہ کیا جائے ،اس کا اذن خاموشی ہے(بخاری مسلم) 92

بیوہ کی دوسری شادی کی قرآن مجید میں اس حکم کے ذریعہ اجازت دی گئی ہے:

"اورتم میں جو عورتیں بیوہ ہیں ان کے نکاح کردو"

(النور۳۲)93

عالمی سماج میں بیوہ عورتوں کا کوئی وجود واہمیت کو تسلیم نہیں کیا گیا لیکن مذہب اسلام اس کی نفی کرتا ہے بیوہ عورتوں کو بے یارو مددگار چھوڑنے پر سرپرستوں کی سرزنش کرتا ہے اور انہیں شادی بیاہ سے روکے رکھنے اور اپنے مفاد کے لئے استعمال کرنے کی ممانعت کرتا ہے قرآن پاک میں ارشاد ہے:

''اے مومنو! تمہارے لئے ہرگز جائز نہیں کہ تم زبردستی

بیوہ عورتوں کو میراث بنالو''۔(النساء)۔94

لڑکی کی شادی سے پہلے کفالت والد اور بھائیوں کے ذمہ ہوتی ہے شادی کے بعد لڑکی کی کفالت کا ذمہ دار شوہر ہوتا ہے اگر کسی صورت لڑکی کا شوہر انتقال کر جائے یا طلاق ہو جائے تو مذہب اسلام میں لڑکی کی کفالت خود عورت اپنے مہر اور وراثت کے ذریعہ کر سکتی ہے اگر وہ معاشی اعتبار سے خود کفیل نہ ہو تو اس کی اولاد پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اولاد نہ ہونے کی صورت میں باپ یا دوسرے رشتہ داروں پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔قرآن مجید میں طلاق کے بعد عورت کو دستور کے مطابق معاشی مدد کی جائے:

ترجمہ''دستور کے مطابق کچھ دیا جائے یہ متقیوں پر لازم

ہے''۔(البقرہ۔۲۴۱)95

اگر طلاق شدہ عورت حمل سے ہوں تو بچے کی پیدائش تک شوہر پر فرض ہے کہ خرچ برداشت کرے اور اگر عورت بچے کو دودھ پلانے پر راضی ہو تو شوہر پر فرض ہے کہ اس دوران بھی عورت کو کفالت کرے۔ ارشاد خداوندی ہے:

''اور اگر یہ مطلقہ عورتیں حمل والی ہوں تو بچہ ہونے تک ان کا

خرچ دیتے رہو پھر اگر وہ تمہارے کہنے سے بچے کو دودھ

پلائیں تو ان کو اس کا معاوضہ دو''۔(اطلاق۔٦) 96

احادیث میں بھی بیوہ عورتوں کی کفالت کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ سراقہ بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا:

"اَلَا اَدُلُّکَ عَلٰی اَعظَمِ الصَّدَقَۃِ ۔کیا تمہیں یہ نہ بتاؤں کہ سب سے بڑا صدقہ کیا ہے؟"

انہوں نے عرض کیا حضور! (صلی اللہ علیہ وسلم) ضرور بتائیے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"اِبنَتُکَ مَردُودَۃٌ اِلَیکَ لَیسَ لَھَا کَاسِبٌ غَیرُکَ .

اپنی اس بچی پر احسان کرنا جو (بیوہ ہونے یا طلاق دیئے جانے کی وجہ سے) تیری طرف لوٹا دی گئی ہو اور تیرے سوا کوئی دوسرا اس کا کمانے والا نہ ہو۔"

صحابہ کرام اپنی بیوہ اور مطلقہ لڑکیوں کا کس حد تک خیال رکھتے تھے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت زبیرؓ نے اپنے کچھ مکانات مطلقہ بیٹی کے نام وقف کیے تھے۔ اس وقف کی تفصیلات میں یہ بات بھی داخل تھی:

"لِلمَردُودَۃِ مِن بَنَاتِہٖ اَن تَسکُنَ غَیرَ مُضِرَّۃٍ وَلَا مُضِرٍّ بِھَا فَاِنِ استَغنَتَ بِزَوجٍ فَلَیسَ لَھَا حَقٌّ .

ان کی جو لڑکی (طلاق یا بیوگی کی وجہ سے) واپس گھر آجائے گی وہ ان میں رہے گی۔ نہ وہ نقصان پہنچائے گی اور نہ اسے نقصان پہنچایا جائے گا۔ شوہر کی وجہ سے وہ مالی لحاظ سے بے نیاز ہو جائے تو اس کا ان میں کوئی حق نہیں

ہوگا''۔97

اس طرح اسلامی نظام نے عورت کو بیوہ کی حیثیت سے خاندان میں محفوظ مقام عطا کیا ہے اور معاشرتی لحاظ سے اسے اندھیروں سے نکال کر اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق دیا ہے۔

مذہب اسلام جہاں مرد کو یہ اختیار دیتا ہے کہ عورت سے نباہ نہ ہونے کی صورت میں طلاق دے سکتا ہے وہیں عورت کو بھی اختیار حاصل ہے کہ وہ شوہر کے ظالمانہ رویہ سے تنگ آ کر خلع لے سکتی ہیں یہ دونوں صورتیں شادی شدہ زندگی میں صبر کی آخری منزلوں پر ممکن قرار دی گئی ہیں۔

قرآن پاک میں حکم ہے کہ:

''پھر اگر تم کو ڈر ہو کہ وہ دونوں (میاں بیوی) اللہ کی
قائم کی ہوئی حدوں پر قائم نہ رہیں گے تو ان دونوں پر اس
بارے میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ
معاوضہ دے کر چھٹکارا پالے''۔(البقرہ۔۲۹)98

دنیاوی مادی ضروریات کے تئیں جائیداد بنانا اور اس کی وراثت بہت اہم مسائل ہیں جائیداد وراثت کے حقدار کے طور پر صرف لڑکوں کو سمجھا جاتا ہے لیکن مذہب اسلام میں حق ملکیت کی اہلیت اور مالی تصرفات کا مجاز ہونے کے اعتبار سے عورت اور مرد دونوں کو برابر حقوق دیئے گئے ہیں۔قرآن الحکیم میں حکم ہے:

''لِلرِّجَالِ نَصِیبٌ مِّمَّا تَرَکَ الْوَالِدٰنِ
وَالْاَقْرَبُوْنَ ص وَلِلنِّسَآءِ نَصِیبٌ مِّمَّا تَرَکَ
الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْن (النساء.۷)

مردوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ
اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہے اور عورتوں کے لئے بھی

اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے

چھوڑا ہے''۔99ء

مذہب اسلام نے عورت کو زندگی کے داخلی امور کے ساتھ ساتھ خارجی امور میں بھی عورت کی اہمیت وافادیت کو ضروری قرار دیا ہے معاشرتی ناانصافیوں دھوکہ دہی کے فروغ کو روکنے کے لئے کسی بھی معاہدوں کو قلم بند کرنے اور ان پر گواہ بنانے کی تاکید کی گئی ہے اور گواہوں کی فہرست میں عورت کو بھی ملوث کیا گیا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

" وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ط (البقرہ۔۲۸۲)

اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرالو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تا کہ ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلائے یہ گواہ ایسے لوگوں میں سے ہونے چاہئیں جن کی گواہی تمہارے درمیان مقبول ہو''۔100ء

ایم۔ایچ قدوائی نے عورت کو مذہب اسلام میں مختلف سطحوں پر دی جانے والے حقوق کے بارے میں لکھتے۔

''اس طرح اسلام نے مرد اور عورت دونوں کے ساتھ مذہبی اور سماجی ہر سطح پر مساوات کا سلوک کیا۔ یہاں تک کہ عورت کو ملازمت کرنے کا حق بھی عطا کر دیا۔عورت اسلام

کے دائرے میں رہ کر قاضی بھی بن سکتی ہے۔تجارت بھی
کر سکتی ہے اور سوائے چند ایک خاص معاملات پر کل امور
میں فیصلہ دینے کا حق بھی رکھتی ہے''۔101؎

مذہب اسلام میں عورت اور مرد کو جو مساوی مقام دیا گیا لیکن عملی طور پر عورت کے تئیں مساوات کا درجہ بہت کم نظر آتا ہے۔اس سلسلے میں قرأۃ العین حیدر کا خیال ہے:

'' اسلامی قانون بنیادی طور سے یکساں تھا ، اس کی
تاویل وتشریح پانچ بڑے مکاتب فکر نے کی۔عورتوں سے
متعلق بعض قرآنی احکام کی تاویل اس طرح کی گئی جس
سے عورتوں کے مفاد کو ضرب لگی مردوں کی بالادستی کوئی نئی
چیز نہیں ہے''۔ 102؎

مذہب اسلام میں عوت اور مرد دونوں کو مساوی مقام عطا کیا گیا ہے۔زندگی کے ہر میدان میں یکساں مواقع فراہم کئے گئے ہیں۔حلاں کہ چند ایک معاملات میں مرد کو عورت پر فوقیت دی گئی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ عورتوں کے حقوق اور رعایتیں بھی واضح کر دی گئیں ہیں تا کہ مرد خودسری اور تکبر میں مبتلا نہ ہو جائے۔

عورت کے حقوق میں حصول علم کے کلی اختیارات، وراثت اور جائیداد پر پورا اختیار، شوہر کے انتخاب کا حق، مہر اور نان ونفقہ کا حق بعض وجوہ کی بنا پر شوہر سے خلع لے کر یا بیوہ ہو جانے پر عقد ثانی کا حق، آزادی رائے اور عملی زندگی بسر کرنے کا حق، اسلام کے دائرہ میں رہ کر ملازمت کا حق، کاروبار کرنے کا حق چند ایک معاملات کو چھوڑ کر قاضی کے فرائض دینے کا حق مذہب اسلام میں دیا گیا ہے۔ان باتوں سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ عورتوں کو مذہب اسلام میں تعلیم ہو یا ملازمت ہو یا دیگر زندگی کے امور مساوی حقوق دیئے گئے ہیں۔ جبکہ دیگر مذاہب میں یہ بات کم ہی نظر آتی ہے۔

# حوالے


1۔ سید حامد حسین، ہندو فلسفہ مذہب اور منظام معاشرت، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، 1906ء ص 9

2۔ محمد شہزاد شمز، عورت اور سماج، تخلیق کار پبلشرز دہلی، 2006ء، ص 29

3۔ سید حامد حسین، ہندو فلسفہ مذہب اور منظام معاشرت، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، 1906ء ص 53

4۔ سید حامد حسین، ہندو فلسفہ مذہب اور منظام معاشرت، ص 53

5۔ مہ نور زمانی بیگم، کرشن چندر کے ناولوں میں نسوانی کردار، نیشنل فائین پرنٹنگ پریس حیدرآباد 1987ء، ص 47

6۔ مہ نور زمانی بیگم، کرشن چندر کے ناولوں میں نسوانی کردار، ص 47

7۔ آمنہ تحسین، مطالعات نسواں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2008ء، ص: 38 شمیم نکہت سے ڈاکٹر۔ ص 32

8۔ مہ نور زمانی بیگم ''کرشن چندر کے ناولوں میں نسوانی کردار''، نیشنل فائین پرنٹنگ پریس حیدرآباد 1987ء، ص: 47

9۔ رائے بہادر، جے سی گھوش مترجم رائے بیجناتھ انتخاب، اصول دھرم شاستر، دارالطبع جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن 1923ء، ص 20

10۔ رائے بہادر، جے سی گھوش مترجم رائے بیجناتھ، انتخاب، اصول دھرم شاستر ص 21

11۔ رائے بہادر، جے سی گھوش مترجم رائے بیجناتھ، انتخاب، اصول دھرم شاستر ص 29

12۔ رائے بہادر، جے سی گھوش مترجم رائے بیجناتھ، انتخاب، اصول دھرم شاستر ص 30

13۔ زاہدہ حنا، عورت: زندگی کا زندان، تخلیق کار پبلشرز دہلی 2006ء، ص 28-27

14۔ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص 30

15۔ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص 34

16۔ آمنہ تحسین، مطالعات نسواں، ص 43

17۔ محمد شہزاد شمز، عورت اور سماج، ص 34

18۔ زاہدہ حنا، عورت زندگی کا زندان، ص 28

19۔ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص 37-36

20۔ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص 36

21۔ صغرا مہدی، ہندوستان میں عورت کی حیثیت، ترقی اردو بیورو نئی دہلی 1901ء، ص 28

22۔ صغرامہدی، ہندوستان میں عورت کی حیثیت،ص28

23۔ ثریابتول علوی، اسلام میں عورت کا مقام ومرتبہ، اسلامک بل فاونڈیشن، نئی دہلی، 2000ء ص27

24۔ ثریابتول علوی، اسلام میں عورت کا مقام ومرتبہ،ص27

25۔ صغرامہدی، ہندوستان میں عورت کی حیثیت، ص 28

26۔ آمنہ تحسین، مطالعات نسواں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2008ء،ص66

27۔ صغرامہدی، ہندوستان میں عورت کی حیثیت،ص28

28۔ صغرامہدی، ہندوستان میں عورت کی حیثیت،ص28

29۔ صغرامہدی، ہندوستان میں عورت کی حیثیت،ص37

30۔ صغرامہدی، ہندوستان میں عورت کی حیثیت، ص37

31۔ مہ نور زمانی بیگم، کرشن چندر کے ناولوں میں، نسوانی کردار،ص50

32۔ مہ نور زمانی بیگم، کرشن چندر کے ناولوں میں، نسوانی کردار،ص53

33۔ آمنہ تحسین ڈاکٹر، مطالعات نسواں' ص 72

34۔ صغرامہدی، ہندوستان میں عورت کی حیثیت،ص 20

35۔ آمنہ تحسین ڈاکٹر، مطالعات نسواں،ص72

36۔ آمنہ تحسین ڈاکٹر، مطالعات نسواں' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2008ء ص73

37۔ ثریابتول علوی، اسلام میں عورت کا مقام ومرتبہ، اسلامک بک فاونڈیشن نئی دہلی، 1993ء ص27

38۔ بحوالہ ڈاکٹر محمد شہزاد' عورت اور سماج،ص21

39۔ آمنہ تحسین، مطالعات نسواں،ص74

40۔ صغرامہدی، ہندوستان میں عورت کی حیثیت،ص31

41۔ مترجم صغرامہدی، ہندوستان میں عورت کی حیثیت ص31

42۔ مترجم صغرامہدی، ہندوستان میں عورت کی حیثیت ص32

43۔ تخلیق کار زاہدہ حنا، عورت زندگی کا زنداں، تق کار پبلشرز دہلی، 2006ء،ص38

44۔ ثریا بتول علوی، اسلام میں عورت کا موام ومرتبہ،ص27

45۔ آمنہ تحسین، مطالعات نسواں،ص75

46۔صغرامہدی، ہندوستان میں عورت کی حیثیت، ص31

47۔صغرامہدی، ہندوستان میں عورت کی حیثیت، ص31

48۔آمنہ تحسین، مطالعات نسواں، ص76

49۔صغرامہدی، ہندوستان میں عورت کی حیثیت، ص31

50۔ آمنہ تحسین، مطالعات نسواں، ص76

51۔صغرامہدی، ہندوستان میں عورت کی حیثیت، ص31

52۔بحوالہ محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، ص 49

53۔آمنہ تحسین، مطالعات نسواں، ص 79

54۔سید جلال الدین عمری، عوت اور اسلام، مرکزی مکتبہ اسلامی' دہلی، 1979ء، ص 8-7

55۔سید جلال الدین عمری، عوت اور اسلام ص8

56۔سید قطب مترجم ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، اسلام میں عدل اجتماعی' مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، 1981ء ص122-123

57۔ایضاً ' ص:124

58۔ ایضاً ' ص:124

59۔ آمنہ تحسین، مطالعات نسواں، ص 78

60۔ ایضاً ص 78-79

61۔ سید قطب (مترجم: ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی)، اسلام میں عدل، ص125

62۔سید جلال الدین عمری' عوت اور اسلام، ص9

63۔ شمیم نکہت' پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار، ص41-40

64۔ شمیم نکہت' پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار ص 41

65۔ سید جلال الدین عمری' عوت اور اسلام، ص 10

66۔ سید جلال الدین عمری' عوت اور اسلام، ص10

67۔ ایضاً، ص15

68۔ ایضاً، ص16

69۔ سید قطب مترجم ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، اسلام میں عدل اجتماعی، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، 1981ء، ص126

70۔ مولانا محمد یوسف اصلاحی، آداب زندگی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، 2005ء، ص 136

71۔ مولانا محمد یوسف اصلاحی، آداب زندگی، ص 139

72۔ سید جلال الدین عمری، عوت اور اسلام، ص 16-17

73۔ سید جلال الدین عمری، عوت اور اسلام، ص 19

74۔ ایضاً، ص20

75۔ سید جلال الدین عمری، عوت اور اسلام، ص 21

76۔ بحوالہ سید جلال الدین عمری، اسلام اور عورت، ص 21

77۔ ایضاً ' ص 22

78۔ ایضاً ' ص 22

79۔ ایضاً ' ص 23

80۔ ایضاً ' ص 25

81۔ ایضاً' ص 25

82۔ مہ نوز مانی بیگم' کرشن چندر کے ناولوں میں نسوانی کردار' ص46-45

83۔ شمیم نکہت، پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار، ص40

84۔ سید جلال الدین عمری، عوت اور اسلام، ص26

85۔ ایضاً ص 26

86۔ ایضاً ص 26

87۔ مالک رام، عورت اور اسلامی تعلیم، ص 22

88۔ ایضاً ص 23

89۔ سید جلال الدین عمری، عوت اور اسلام، ص27

90۔ ایضاً ص:29

91۔ مالک رام، عورت اور اسلامی تعلیم، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1989ء، ص 22

92۔ سید قطب مترجم ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، اسلام میں عدل اجتماعی، ص85

93۔ آمنہ تحسین ڈاکٹر' مطالعات نسواں' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2008ء ص85

94۔ ایضاً

95۔ ایضاً

96۔ ایضاً

97۔ سید جلال الدین عمری، عوت اور اسلام، ص30

98۔ آمنہ تحسین، مطالعات نسواں، ص85-84

99۔ سید قطب مترجم ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، اسلام میں عدل اجتماعی، ص124

100۔ ایضاً ص126

101۔ مہ نور زمانی بیگم، کرشن چندر کے ناولوں میں نسوانی کردار، ص46

102۔ ڈاکٹر محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج؛ ص49

☆☆☆

# باب چہارم

## اُردو ناولوں میں خواتین کے عمومی مسائل کا تنقیدی مطالعہ

# اُردوناولوں میں خواتین کے عمومی مسائل کا تنقیدی مطالعہ

اردو میں ناول سے پہلے قدیم قصے کہانیاں اور داستانیں ملتی ہیں یہ قصے کہانیاں انسان اپنے تصور اور تخیل سے بناتا تھا جس میں خوابوں کی حسین دلکش رنگین ان دیکھی، عجیب وغریب دنیا ہوتی اور ان میں فوق فطری عناصر کی بھرمار ہوتی تھی۔

قدیم کہانیوں کے بعد داستانیں لکھی جانے لگیں۔ داستان میں ایک حسین خیالی کائنات کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ زمین، آسمان چاند، ستاروں کا سفر اُڑن کھٹولے کے ذریعہ کیا جاتا جادوئی وسحرانگیز مناظر اور مافوق الفطری عناصر شامل کیے جاتے رہے ہیں ''سب رس'' الف لیلیٰ، طلسم ہوش ربا، باغ و بہار، فسانہ عجائب اور بوستان خیال وغیرہ مشہور داستانیں ایسی ہیں داستانیں ہیں جہاں خیالی کہانیوں کے ذریعے عوام کی دلچسپی کا سامان فراہم کیا جاتا رہا ہے۔

1857ء کے بعد ہندوستانی سماج میں سیاسی ومعاشرتی تبدیلیوں کا اثر نہ صرف یہاں کے عوام کی زندگی پر پڑا بلکہ اس کا اثر اردوادب پر بھی مرتب ہوا۔ ادب کو زندگی کے تابع قرار دیا جانے لگا۔ سرسید کی تحریک کے زیرسایہ آسان اور سلیس زبان کو اردونثر کو کے لئے ءاہم سمجھا جانے لگا اور آسان وسلیس زبان میں زندگی کے حقیقی مسائل اس عہد کے ناولوں میں پیش کئے جانے لگے۔ کیونکہ ناول مکمل طور پر ہماری زندگی اور سماج کے نشیب وفراز کی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس لیے اس کے ذریعہ انسانی زندگی اور اس کی سماجی وتہذیبی اقدار اور روایات کا ذکر کہانی کے ذریعے اس عہد کے ادیبوں نے جامع انداز میں کیا ہے اسی لئے اس عہد میں ناول نگاری کی طرف خصوصی توجہ کی جانے لگی۔ وقار عظیم لکھتے ہیں:

''ناول زندگی کی وسعتوں کا حامل ہے'' یعنی زندگی کو اس

طرح ادب کے سانچے میں ڈھالنا کہ اس کی ساری وسعتیں
اور گیرائیاں اس سانچے میں سماسکیں۔ ادب کی کسی اور
صنف کے ذریعے سے ممکن نہیں سوائے ناول کے''۔ 1ؔ

ناول میں موضوع کو پیش کرنے کا انداز دلچسپ ہونا چاہئے اور کہانی میں تسلسل اور ربط بے حد ضروری ہے۔ایک بہترین ناول میں پلاٹ اور کردار کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ایک ناول میں مختلف قسم کے کردار ہوتے ہیں جو حالات ماحول ،فکر، عادات واطوار، جذبات واحساسات اور زبان کے لحاظ سے الگ الگ ہوتے ہیں لیکن ناول نگار کو کردار تراشتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کردار میں اتنی کشش اور تاثر ہو کہ اگر قاری ناول کے واقعات کو نظر انداز کر دے لیکن کرداروں کو نہ بھول سکیں۔لہٰذا کردار مثالی اور اچھے تاثرات چھوڑنے والے ہوں۔وقار عظیم لکھتے ہیں:

''مثالی کرداروں کا مقصد بے حد بلند ہے ان کی مثالیں
لوگوں کو کچھ نہیں تو کم از کم اچھے خیالات کی طرف تو رجوع
کر دیتی ہیں لیکن مثالی کردار کے یہ معنی نہیں کہ وہ مافوق
الفطرت بن جائے ایک بلند نمونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ
انسان نہ معلوم ہو''۔2ؔ

ناول نگار اپنے ماحول کے مشاہدے اور تجربہ کی بنا پر سنجیدگی سے غور وفکر کر کے کردار تراشتا ہے، تصادم اور کشمکش کی سے کوئی نہ کوئی کردار ابھرتا اور غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ممتاز حسین کے ناول میں کردار نگاری کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کردار نگاری ہمیشہ نارمل ہو، کیونکہ آپ ناول کے
ذریعہ زندگی کی فلسفیانہ تعمیر کرتے ہیں اور یہ کام بغیر

انسانوں کی مدد کے نہیں ہوسکتا ہے جو نارمل ہوتے ہیں ، یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ تاریخ مجموعی اعتبار سے نارمل انسانوں کے عمل کا نتیجہ ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ کردار اپنی فطرت کا مظاہرہ اپنے عمل کے ذریعہ کریں۔ کیونکہ عمل ہی وہ معیار ہے جس کی بنا پر کسی کردار کو متعین کیا جاتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ چونکہ ناول زندگی کی ایک فلسفیانہ تعمیر ہے ۔۔۔۔ اس لئے کردار صرف اپنی انفرادیت ہی کے حامل نہ ہوں بلکہ ایک مخصوص طبقے اور ٹائپ کی بھی نمائندگی کرسکیں ۔ یہی وہ طریقہ ہے کہ جس کے ذریعہ آپ لاکھوں انسانوں کی نمائندگی ایک فرد کے ذریعہ کراسکتے ہیں اور اس طرح آپ اپنے فن میں تحقیق کے ساتھ تعلیم کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں''۔3

ایک انسان میں خوبیاں اور خامیاں دونوں ہوتی ہیں کوئی بھی انسان صرف خوبیوں کا پتلا نہیں ہو سکتا۔ انسانی تخیلات اگر کسی ایسے کردار کو ڈرامہ یا ناول میں پیش کرتی ہے جو صرف خوبیوں کا مالک ہوتو وہ کردار ہمارے سماج کا زندہ کردار نہیں کہلائے بلکہ ایک فرضی کردار ہوگا جس میں نہ تو زندگی کی حرکت ہوگی اور نہ خیر وشر کی وہ کشمکش جو زندگی کے حقیقی کرداروں کی عکاسی کر سکے۔

ناول کے کردار مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے اپنے عمل سے اپنے طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کردار میں عام انسانوں جیسے عادات واطوار ہونے چاہیے ناول پڑھتے وقت قاری کو یہ محسوس ہو کہ ناول کا المیہ اُس کی زندگی کے کسی حصہ سے جڑا ہے۔ سہیل بخاری لکھتے ہیں:

’’ہمیں صرف انہیں کرداروں سے ہمدردی ہوگی جو
ہماری ہی طرح دکھ سکھ کا تجربہ کرتے ہماری ہی طرح جیتے
اور ہماری ہی طرح مرتے ہیں انسان نہ صرف فرشتہ ہوتا
ہے نہ صرف شیطان وہ ان دونوں کا مرکب یعنی انسان ہوتا
ہے، جس طرح محض نیک انسان کا ملنا محال ہے اسی طرح
محض بد انسان کا ہاتھ آنا ناممکن ہے ۔چنانچہ ہم کو صرف
انہیں کرداروں سے دلچسپی ہوسکتی ہے جو ہماری شبیہ پر
بنائے گئے ہوں ۔۔۔ایک کردار سے مختلف انسانوں کو جو
ہمدردی ہوجاتی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ ان میں سے ہر
ایک اپنی اپنی ذات کا کچھ حصہ اس سے پالیتا ہے‘‘۔4

یوں تو ناولوں کے تمام اجزا اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں لیکن ناول میں کردار نگاری کو خاصی اہمیت حاصل ہے کیوں کہ ناول کردار کے دکھ درد، خوشیاں اور نظریات وتصورات وغیرہ کا قاری پر بڑا گہرا اثر مرتب ہوتا ہے چوں کہ اس باب میں اردو ناولوں کے نسوانی کرداروں پر بحث کی جارہی ہے اس لیے ضروری تھا کہ ناول میں کردار نگاری کی اہمیت کی وضاحت کی جائے ۔اب یہاں اردو ناولوں کے چند اہم خواتین کرداروں کا جائزہ پیش کیا جارہا ہے تا کہ یہ اندازہ ہوسکے کہ اردو ناول نگاروں نے اپنے نسوانی کرداروں کے ذریعے عورتوں کے کن مسائل کو پیش کیا ہے۔

## نذیر احمد کے نسوانی کرداروں کے مسائل

اردو میں ناول نگاری کے آغاز کا سہرا ڈپٹی نذیر احمد کے سر جاتا ہے۔ان کے تمام ناول اصلاحی نوعیت

کے ہیں انہوں نے اپنی لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کی غرض سے یہ ناول لکھے ہیں۔

نذیر احمد نے مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت، رویائے صادقہ، فسانہ مبتلا اور ایامی نذیر احمد کے ناول ہیں۔ ان ناولوں میں عورتوں کی تعلیم وتربیت کی طرف خصوصی توجہ دلائی پارسائی' تہذیب' اخلاق' سلیقہ شعاری' ایثار اور خدمت خلق وغیرہ کو عورتوں کے لیے ضروری قرار دیا۔

نذیر احمد کی پرورش دینی ماحول میں ہوئی تھی اسی لیے وہ مذہب اور مذہبی امور وعمل آوری کو مقدم سمجھتے تھے۔ انہوں نے پہلا ناول ''مراۃ العروس'' 1869ء اپنی لڑکیوں کی اردو تعلیم ومعاشرتی تربیت کے لئے لکھا اسی لئے اس ناول میں عورتوں کی اصلاح ان کی تعلیم اور امور خانہ داری میں مہارت کو کامیاب زندگی گزارنے کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے ناول کی طرف توجہ کی جس کی وہ وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میں دیکھتا تھا کہ ہم مردوں کی دیکھا دیکھی لڑکیوں کو
> بھی علم کی طرف ایک طرح کی خاص رغبت ہے لیکن اس
> کے ساتھ ہی مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ مذہبی خیالات بچوں کی
> حالت کے مناسب نہیں اور جو مضامین ان کے پیش نظر
> رہتے ہیں ان سے ان کے دل افسردہ، ان کی طبیعتیں منقبض
> اور ان کے ذہن کند ہوتے ہیں۔ تب مجھ کو ایسی کتاب کی
> جستجو ہوئی جو اخلاق و نصائح سے بھری ہوئی ہو اور ان
> معاملات میں جو عورتوں کی زندگی میں پیش آتے ہیں اور
> عورتیں اپنے توہمات اور جہالت اور کج روی کی وجہ سے
> ہمیشہ ان میں مبتلائے رنج و مصیبت رہا کرتی ہیں ان
> خیالات کی اصلاح اور ان کی عادات کی تہذیب کرے اور

کسی قدر دلچسپ پیرائے میں ہو جس سے ان کا دل نہ
اُکتائے طبیعت نہ گھبرائے مگر تمام کتاب خانہ چھان مارا
ایسی کتاب کا پتہ نہ ملا تب میں نے اس قصہ کا منصوبہ
باندھا''۔5

مراۃ العروس میں اکبری اور اصغری نیک اور بد کرداروں میں نظر آتے ہیں۔اکبری اور اصغری ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں لیکن ان کے اخلاق و مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے اکبری پھوہڑ پن بدمزاجی بے عملی، بدعقلی سے اپنی ازدواجی زندگی کو تکالیف میں مبتلا کر لیتی ہے۔اکبری کی شادی محمد عاقل سے ہوتی ہے شادی کے بعد اکبری اپنی تنگ مزاجی وغرور کے سبب اپنے شوہر کو اس کی ماں سے الگ رہنے پر مجبور کرتی ہے۔اکبری کو ماں اور نانی کے بے جا لاڈ و پیار نے بد سلیقہ مغرور بنا دیا۔اس کے برخلاف اصغری کی عمدہ تعلیم و تربیت کی بدولت وہ ایک اچھی بیوی ثابت ہوتی ہے کامل سے بیاہی جانے کے بعد اپنے سسرال میں عزت و احترام حاصل کرتی ہے وہ اپنی نند محمودہ کا بھی خیال رکھتی ہے وہ خدمت ایثار و قربانی کو اولین اصول زندگی تسلیم کرتی ہے شوہر کی خوشی اور آرام کے لئے اور خود کو وقف کر دیتی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اِن دونوں کرداروں کے ذریعہ شائستہ با اخلاق سماج کی تعمیر میں جن اوصاف کی ضرورت ہے اصغری کے میں سمو کر پیش کیا ہے۔کردار نگاری کے نقطہ نظر سے اصغری نذیر احمد کا ایسا کردار ہے جو سماج کے لئے مثالی ہے۔

ان دونوں کے علاوہ محمودہ، ماما دیانت اور ماما عظمت کے کردار بھی اہم ہیں ڈپٹی نذیر احمد نے ماما عظمت کے کردار کی صورت میں ماماِئیں و ملازمائیں جو موقع پرست بد دیانت ہوتی ہیں اُن کا نقشہ کھینچا ہے حسن آرا بھی مراۃ العروس کا ایک اہم اور دلچسپ کردار ہے جو امراء اور روسا کی شوخ و تیز لڑکیوں کی نمائندگی

کرتا ہے۔

نذیر احمد کا دوسرا ناول بنات النعش 1876ء میں شائع ہوا۔اس ناول کا موضوع بھی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت ہے یہ ناول مرأۃ العروس کا دوسرا حصہ ہے۔ کیونکہ ناول نگار نے خود اس بات کا اظہار اس ناول کے دیباچہ میں کیا ہے۔

اس ناول میں اصغری مرکزی کردار رہی کی حیثیت رکھتی ہے ''مرأۃ العروس'' میں اصغری جب اپنے گھر کو سنبھال لیتی ہے تو پھر اپنے قرب و جوار کی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا بیڑا اٹھاتی ہے۔ وہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ قائم کرتی ہے،اس مدرسہ میں حسن آرا نامی ایک بدزبان خودسر لڑکی آتی ہے۔حسن آرا جیسی بدسلیقہ،بدمزاج لڑکی اصغری کی علمی سوجھ بوجھ اور تربیت کی وجہ سے بااخلاق اور باعلم لڑکی بن جاتی ہے۔

نذیر احمد کا ناول توبۃ النصوح (1877ء) ان کا اہم ناول ہے۔ یہ پلاٹ اور کردار نگاری دونوں اعتبار سے ان کے پچھلے دونوں ناولوں سے بہتر ہے اس میں جو نسوانی کردار پیش کئے گئے ہیں ان میں فطری معلوم ہوتے ہیں ۔اس ناول کے نسوانی کردار مثلاً فہمیدہ ،حمیدہ ،حضرت بی ،نعیمہ اور صالحہ خاص اہمیت کے حامل ہیں ۔

اس ناول میں فہمیدہ ایک نازک دل رکھنے والی سمجھدار اور سلیقہ شعار عورت ہے جس میں مادرانہ شفقت اور محبت ملتی ہے، وہ اپنے شوہر کی خدمت گذار اور وفا شعار بیوی ہے۔حضرت بی کے کردار میں بے حد دلکشی ملتی ہے، وہ گھر کی بڑی بوڑھی نانی کا ایک عمدہ کردار ہے اس طرح کے کردار مختلف ناموں سے اوسط درجے کے مسلمان گھرانوں میں ہر جگہ دیکھے جاسکتے ہیں،نعیمہ اور حمیدہ بھی اس ناول کے اہم کردار ہیں۔حمیدہ پر مذہبیت کا غلبہ ہے اور نعیمہ عیش وعشرت میں پلی ہوئی ضدی لڑکی ہے جس کی حرکتیں قاری کے لئے دلچسپی پیدا کرتی ہے صالحہ، نعیمہ کی سہیلی ہے جو باشعور نیک اور محبت کرنے والی عورت ہے۔ نذیر احمد نے ان نسوانی

کرداروں کے ذریعہ اوسط درجہ کے مسلمان گھرانوں کی زندگی، توہم پرستی، میاں بیوی کے تعلقات کا اچھا نقشہ کھینچا ہے فہمیدہ شوہر کی تابعدار ہے لیکن اسی کی بیٹی نعیمہ خودسر ہے اور وہ شوہر سے نباہ نہ کر کے میکے چلی آتی ہے، ناول نگار نے کلیم اور نعیمہ کے ذریعہ یہ بتایا ہے کہ اولاد کی تربیت جتنی کم عمری میں ہو وہ اثر کرتی ہے عمر کے پختہ ہونے کے بعد تربیت دینا بہت مشکل اور بعض دفعہ ناممکن ہو جاتا ہے، وہ اس حقیقت کا اظہار نصوح کی زبانی اس طرح کرتے ہیں:

''بچے جن کی عمر چھوٹی ہے، وہ اصلاح پذیر ہیں بڑی
دقت تو بڑی عمر والوں کی ہے۔۔۔۔ نرا سمجھانا اور وہ بھی
اس عمر میں، بڈھے طوطوں کو پڑھانا ہے''۔6

ان کے علاوہ نذیر احمد کے دوسرے ناول ''رویائے صادقہ'' فسانہ مبتلا اور ایامی اور ابن الوقت ہیں مبتلا 1885ء ایک سے زیادہ شادی کے موضوع پر لکھا گیا ناول ہے، اس ناول کو انہوں نے ''محصنات'' کا بھی نام دیا ہے۔ اس ناول میں ایک سے زیادہ شادی کرنے کے برے نتائج دکھائے گئے ہیں۔ اس ناول میں ناول نگاری کے خط وخال واضح نظر آتے ہیں۔ اس کا پلاٹ مربوط ہے مکالمے فطری و برجستہ ہے ڈاکٹر سید عبداللہ فسانہ مبتلا کے بارے میں لکھتے ہیں:

''فسانۂ مبتلا کے تین لاجواب کردار مصنف کی کردار
نگاری کے کامیاب نمونوں کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں
اول مبتلا جو دو بیویوں کے شوہر ہیں غیرت بیگم مبتلا کی پہلی
بیوی ہیں جو اصلاً نسلاً شریف ہیں اور بالآخر ہریالی جو
بازاری عورت ہے مگر مبتلا اس سے نکاح کر لیتا ہے۔ یہ
تینوں کردار کامیاب ہیں اور یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ

مولوی نذیر احمد نے ہریالی ایک طوائف کا وہ سماں دکھایا ہے
جس کی بظاہر ان سے توقع نہ ہوسکتی تھی ۔۔۔۔۔فسانۂ
مبتلا میں نذیر احمد ایک کامیاب صاحب فن معلوم
ہوتے ہیں''۔7

نذیر احمد کا چھٹا ناول ''ایامیٰ'' ہے انہوں نے اس ناول میں عقد بیوگان کی ضرورت اور اہمیت کو موضوع بنایا ہے اس کہانی کا مرکزی کردار'' آزادی بیگم'' عین جوانی میں بیوہ ہوجاتی ہے۔لیکن ہندوستانی سماج کے زیرسایہ مسلمان بھی بیواؤں کے عقدثانی میں پس وپیش کرتے ہیں حالانکہ آزادی بیگم دوبارہ نکاح کرنے کو برانہیں سمجھتی۔

نذیر احمد نے بیوہ کی دوسری شادی کے اہم سماجی اورانسانی مسئلہ کوابھارا ہے انہوں نے آزادی بیگم کی کردارنگاری میں دردمندی مصیبت بے چارگی بدقسمتی اورتشنگی کو بڑی کامیابی کے ساتھ ظاہر کیا ہے۔

نسوانی کردارنگاری اورعورتوں کے مسائل کے لحاظ سے نذیر احمد کے ناول بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ انہیں صرف اردو کا پہلا ناول نگار ہونے کا ہی شرف حاصل نہیں ہے بلکہ عورتوں کے بعض اہم مسائل کو بھی پیش کرنے میں اولیت حاصل ہے نسوانی کرداروں کے لحاظ سے اصغری، اکبری، صالحہ، آزادی بیگم غیرت بیگم اور ہریالی وغیرہ کے کردار نذیر احمد کی فنی مہارت کا نتیجہ ہے۔

## پریم چند کے نسوانی کرداروں کے مسائل

اردو ناولف نگاری میں نذیرا کے بعد پریم چند کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ان کا شمار اردو کے مایہ ناز افسانہ نگار اور بلند پایہ ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔

پریم چند کے ناولوں میں ہم فرد ماو ہم ثواب سے لے کر منگل سوتر (نامکمل) تک اردو ناول نگاری

کےفن کی تکنیک کی مکمل تصویر نظر آتی ہے پریم چند کے ناول کے کردار بنا کسی مرقع و بناوٹ کے عام جیتے جاگتے انسان ہیں، ان کے ناولوں میں ان گنت کردار ہیں جو مختلف طبقات سے تعلق رکھتے ہیں ان کے مسائل و مطالبات مختلف ہیں لیکن پریم چند نے انہیں اپنے طبقے کا نمائندہ کردار بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہرسروپ ماتھر نے پریم چند کی کردار نگاری کے بارے میں لکھا ہے:

''پریم چند کے ناولوں میں کردار حالات سے متاثر ہوتے ہیں اور متاثر کرتے ہیں۔لیکن سب کرداروں کے بارے میں ایسا نہیں کہہ سکتے ان کے ہوری۔ راما ناتھ سمن وغیرہ کے کردار حالات سے پوری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ جب کہ پریم شنکر امرت رائے۔امر کانت وغیرہ کے کردار حالات سے متاثر نہیں ،دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے وہ کردار حالات سے بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں جو حقیقت پسند ہیں لیکن مثالی کرداروں پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ پریم چند نے کردار نگاری میں حرکت اور ڈرامائی انداز یکساں طور پر خیال رکھا ہے وہ کردار کے خیال جذبات اور حالات کو بیان ہی نہیں کرتے۔ان پر حاشیے اور رائے بھی دیتے جاتے ہیں''۔8

پریم چند کے کردار بلا شبہ ہمارے سماج کے جیتے جاگتے کردار ہیں۔ان کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی میں عام انسانوں کی طرح سانس لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کسان ان کے ناولوں کا ہیرو ہے لیکن ایسا ہیرو ہے جس میں کوئی عیب نہ ہو۔مثال کے طور پر ہوری دیہاتی کسانوں کا ایک نمائندہ کردار

ہے جو اپنی قدیم روایات کا پابند اور دوسری طرف ہوری کا بیٹا گوبر نئی سوچ کا علمبردار، جس کو پیش کرنے میں پریم چند نے پوری مہارت سے کام لیا ہے اس طرح متوسط طبقہ کے کرداروں میں رما ناتھ سمن اور دوسرے بہت سے کرداروں کو شامل کیا ہے پریم چند کے نزدیک انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہے۔

پریم چند کے نسوانی کردار بھی ہندوستانی دیہاتی عورتوں کی نمائندگی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ عورتیں جن کی اقتصادی ضروریات دوسروں پر منحصر ہوتی ہیں جن کا کام سارے کنبے کا کھانا پکانا۔ ان کے بچے پیدا کرنا شوہروں کی خدمت کرنا اتنی خدمت کرنا کہ خدمت کرتے کرتے مرجانا۔ مگر پھر بھی وہ اپنے شوہروں کی جائیدادوں کے حصے سے محروم رہتی ہیں۔

پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کرداروں کی تصویر کشی کرتے ہوئے کے۔ کے کھلر لکھتے ہیں:

> ''پریم چند کی عورتیں صرف منگلا چرن نہیں گاتیں اور نہ ہی صرف دیوی جاگرن کراتی ہیں بلکہ اپنے فرائض اور رسوم کی ادائیگی کے بعد اپنے آدمیوں کو ظلم کے خلاف آواز اُٹھانے کو منع نہیں کرتیں، پریم چند کے ناولوں میں بدنصیب بیٹیاں۔ کوکھ جلی بیویاں اور جھریوں زدہ ماتائیں جو وقت پر اپنے آدمیوں کو دھوکہ نہیں دیتیں بلکہ ان کے ساتھ شانہ بہ شانہ چل کر مصیبت کا سامنا کرتی ہیں یہ عورتیں اپنے شوہروں سے مستقل مار کھاتی اور ان سے پیار کرتی ہیں''۔9

عورتوں کو پیٹنا بھی دیہاتی زندگی کا ایک حصہ تھا معمولی سے معمولی بات پر عورت کو پیٹا جاتا تھا۔ ہوری عورت کو نہیں پیٹتا تھا تو دوستوں میں اس کا مردانہ رتبہ کم سمجھا جاتا۔

پریم چند کے نسوانی کردار میں اعلیٰ طبقہ کی عورتوں کے علاوہ نچلے طبقے کی عورتیں بھی شامل ہیں۔

اعلیٰ طبقہ کی عورتیں جن میں راجپوت شہزادیوں اور رانیوں کا شمار ہوتا ہے مثلاً اُمادے۔ لاچھل، سروپ دیئی۔ رانی یا چوگان ہستی کی رانی جانوی اور اندو وغیرہ جو جاگیردار طبقے سے تعلق رکھتی ہیں، اور اپنے خاص معیار اور روایتوں کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہیں۔

پریم چند اپنے کرداروں کے ساتھ پوری رواداری برتتے ہیں گو کہ بعض جگہ ان کی اصول پرستی ان کے کرداروں کے ارتقاء میں حائل ہو جاتی ہے پھر بھی ان کے کردار جامع نظر آتے ہیں ان میں حرکت ہے وہ ناول کے پلاٹ سے اس طرح مربوط ہیں اور اپنے طبقے کے مسائل کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ سماج کے حرکیاتی رکن معلوم ہوتے ہیں۔

پریم چند کے ناولوں میں متوسط طبقہ کے نسوانی کرداروں کی نفسیات اور ان کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے متوسط طبقہ کی عورتیں سماجی سیاسی اقتصادی تبدیلیوں کے زیر اثر اپنے آپ میں تبدیلی لاتی ہیں مثلاً پریم وتی، مادھوی، پورنا، سمترا، پریما، سمن، شانتا' بھولی صوفیہ، گائتری، نرملا، رنگیلی بائی، جالپا، رتن زہرہ، سکھدرا، نینا، سکینہ مالتی گوبندی وغیرہ ایسے متوسط طبقے کے کردار ہیں جو اپنے ماحول اور حالات سے لڑکر اور جدوجہد کے ذریعہ سماج میں عورت کے مساویانہ حقوق کو حاصل کرنا چاہتی ہیں۔

پریم چند کے ناولوں میں نچلے طبقے کی عورتوں کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے نچلے طبقہ کی عورتوں میں اچھوت اور کھیتوں میں کام کرنے والی یا گاؤں کے غریب طبقے کی عورتیں ہیں۔ ان کرداروں کے ذریعہ پریم چند نے اردو ادب میں ایک نئی روایت قائم کی ان عورتوں کے کام کا اپنے خاندان کے لئے محنت ومشقت کرنا اور اپنے شوہر کی تابعداری کرنا ہے۔ نچلے طبقے کے نمائندہ کرداروں میں منی، جگو، سلونی، دھنیا، پنیا، سلیا، چوہیا، سونا، روپا۔ چھینا، ماہاراجن' ہنری وغیرہ ہیں جو اپنے طبقے اور پیشے کے مطابق بہرصورت نمائندہ کردار کہے جاسکتے ہیں۔

پریم چند نے اپنے ناولوں میں مختلف سیاسی وسماجی مسائل پر قلم اٹھایا ہے ان کے یہاں عورتوں اور مردوں کے کردار دوالگ الگ روپ میں نہیں دیکھا یا گیا ہے۔ بلکہ وہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزم کی حیثیت سے لکھتے ہیں اور یہی ان کی کردار نگاری کا کمال ہے۔

پریم چند اپنے ناولوں میں عورت کو شوہر پرست مشرقی روایتوں کی پابند بتایا ہے تو دوسری طرف انھوں نے ایسے بھی نسوانی کردار پیش کئے ہیں جو اچھوتوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے اپنے خاندان اور سماج کی تمام روایتوں کو توڑ دیتی ہیں حتیٰ کہ جان کی بازی بھی لگا دیتی ہیں۔ وہ مردوں کے ساتھ جیل جاتی اور ملک کی تعمیر، سماجی اصلاح اور بیوہ کی شادی جیسے مسائل میں دلچسپی لیتی ہیں۔

پریم چند کے نسوانی کرداروں کے بارے میں رانی گرگ لکھتی ہیں:

''۔۔۔۔۔ پریم چند کے بارے میں کچھ نقادوں کی رائے ہے کہ وہ عورتوں کی کردار نگاری میں کامیاب نہیں ہوئے لیکن ہمیں تو لگتا ہے کہ بھارتیہ جیون میں عورتوں کے جذبات طورطریق اس کی طاقت اور کمزوری اور کردار کی بلندی اور پستی کی جتنی نفسیاتی عکاسی پریم چند نے کی ہے وہ گورگی سے کہیں زیادہ ہے''۔10۔

پریم چند کا پہلا ناول اپنے دور کے پرآشوب حالات کی تبدیلی پر لکھا گیا جو دھنپت رائے عرف نواب رائے الہ آبادی کے نام سے بنارس کے ایک ہفتہ روزہ ''آوازخلق'' میں قسط وار 1903۔1905 تک شائع ہوا۔ اپنے ابتدائی ناول ''اسرارمعابد'' میں پریم چند نے عورتوں کی زندگی میں جو عدم توازن تھا اس کا ذکر کیا گیا ہے اور دھرم اور مذہب کے نام نہادوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی سماجی اور معاشرتی خرابیوں کو اپنا

موضوع بنایا گیا ہے اوران نام نہاد پیشواؤں کی دوہری شخصیتوں کو بے نقاب کیا۔

پریم چند کا ناول ''ہم فرماو ہم ثواب'' کی کہانی میں اعلیٰ ذات اور نچلی ذات کے فرق کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے اس کے علاوہ اس ناول میں بیوہ کو روایتی رسموں کے کرنے سے باز رکھا گیا ہے اور بیوہ کی دوسری شادی کی اجازت دی گئی ہے۔

''ہم خردو ہم ثواب'' ایک نوجوان وکیل امرت رائے کی کہانی ہے جو پریما سے محبت کرتا ہے لیکن اس کی شادی پریما سے اس لئے نہیں ہو پاتی کہ اس نے سناتن دھرمی عقیدے کو ترک کردیا ہے اور آریا سماجی ہو گیا ہے وہ سماجی و مذہبی مصلح بن جاتا ہے لیکن اسی دوران پریما کی سہیلی پورنا کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے پریما اپنی سہیلی کو بیوگی کی رسموں جیسے سرمنڈانے اور دوسری رسموں سے بچاتی ہے حالانکہ محلے کی عورتیں بہت کوشش کرتی ہیں اور آخر میں لعن طعن پر اتر آتی ہیں پورنا بیوہ گی کی زندگی کی مصیبتیں برداشت کرتے ہوئے سماج سے کنارہ کش ہوجاتی ہے لیکن سماجی مصلح کا کارکن امرت رائے پریما سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور سماج کی اور ہندو دھرم کی بڑی مخالفت کے باوجود دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔

امرکانت اور پورنا کی شادی کے سلسلے میں پریم چند نے ہندو سماج پر ایک کاری ضرب لگائی ہے یعنی دونوں مختلف ذاتوں کے درمیان شادی۔ امرکانت چھتری ہے اور پورنا برہمنی، ہندو دھرم کے مطابق ان کی شادی نہیں ہوسکتی تھی لیکن پریم چند نے صدیوں پرانی اس روایت کو توڑ کر دونوں کی شادی کرادی اس کے علاوہ پریم چند نے اس ناول میں مندروں کی عیاشیوں اور بدکاریوں کے بارے میں بھی لکھا ہے ایک مندر کا حال بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''بارہ دری میں ایک نہایت وجیہہ وشکیل شخص زرد ریشم
کی مرزائی پہنے مسند پر تکیہ لگائے بیٹھا ہے اس کے

روبروایک ماہ پارہ نازنین پیشواز پہنے بصد ناز و انداز جلوہ
افروز ہے۔ رام کلی نے پورنا کا ہاتھ پکڑا اور بارہ دری کی
طرف چلی ۔ بے شمار عورتیں جمع تھیں ایک سے ایک حسین
گہنوں میں لدی ہوئی ۔ بے شمار مرد تھے ایک سے ایک خوش
رو، سب ایک ہی جگہ ملے جلے کھڑے تھے آپس میں نظر
بازیاں ہو رہی تھیں نظر بازیاں ہی نہیں دست درازیاں بھی
ہوتی جاتی تھیں''۔ 11

پریم چند کے ناولوں میں بیوہ کی شادی پر لکھا گیا ناول ''بیوہ'' ہے جس میں مرکزی کردار ادا کرنے والی پورنا مصیبت زدہ اور بدنصیب بیوہ عورتوں کی نمائندگی کرتی ہے اس ناول میں بیوہ کے لئے دوسری شادی کے علاوہ ایک اور راستہ دکھایا گیا ہے یہ آسرا آشرم ہے جہاں بیواؤں کے ساتھ حسن سلوک کیا جاتا ہے۔

پریم چند کا ایک جملہ جسے بیوہ پورنا سے کہلوایا ہے ہندو سماج میں بیوہ کی حالت زار کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔

''ہائے بھگوان رنڈاپا کیا کلنک کا دوسرا نام ہے''۔ 12

پورنا آگے سوچتی ہے:

''بیوہ پر الزام لگا دینا کتنا آسان ہے عوام کو اس کے بارے
میں برے سے برا خیال کرتے دیر نہیں لگتی گویا کجروی ہی بیوگی کی
قدرتی معاش ہے گویا بیوہ ہو جانا دل کی ساری خوشیاں اور
ساری کمزوریوں کا اڈہ پڑنا ہے''۔ 13

پریم چند بیوہ ذلت بھری زندگی سے نکالنے کے لئے اُسے اپنے بل پر کمانے کی صلح دیتے ہیں وہ

جانتے تھے کہ اگر عورت اپنی زندگی گذارنے کے لیے خود روزگار سے جڑ جائیں تو سماج میں اُنہیں عزت حاصل ہو سکتی ہے۔ پورنا اور سمترا کی گفتگو میں پورنا صرف اس بات پر مردوں کی وکالت کرتی ہے کہ چونکہ وہ کماتا ہے اس لئے اس کو رعب جمانے کا بھی حق ہے تو سمترا کہتی ہے کہ:

''بس......بس تم نے لاکھ روپے کی بات کہدی یہی
میں بھی سمجھتی ہوں اس لیے اس کی یہ درگت بنی ہے مگر میں
کہتی ہوں اگر مرد اپنے کنبہ بھر کو کھلا سکتا ہے تو کیا عورت اپنی
کمائی سے اپنا پیٹ نہیں بھر سکتی''۔14؎

پریم چند بیوہ کے مسائل کو اپنے دوسرے ناولوں میں بھی پیش کیا ہے ناول ''جلوہ ایثار'' کی ہیروئن برجن کا شوہر اپنی بری عادتوں کی وجہ سے جان دھو بیٹھتا ہے، وہ ایک امیر مالدار تھا اسی لیے برجن کو معاشی بدحالی کا سامنا نہیں کرنا پڑا اس نے روایات کو قائم رکھتے ہوئے دوسری شادی نہیں کی بلکہ ساری زندگی بھگتی میں گزار دی۔

پریم چند کے ناول ''بازارِحسن'' کو اردو ناولوں میں عورتوں کی نفسیات، عورتوں کی مجبوریاں، سماجی حیثیت، جہیز کے برے اثرات، بے جوڑ شادیاں، شوہر کی ظلم وزیادتی، مجبوراً عورتوں کا طوائف کی زندگی گزارنا ان تمام مسائل کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔

بازارِحسن ناول کا مرکزی کردار سمن ہے سمن عام سی خوددار لڑکی ہے سمن کے والد دیانت دار تھانیدار تھے لیکن سمن کی شادی میں جہیز دینے کے لیے وہ رشوت لیتے ہیں، لیکن یہ رشوت انہیں راس نہیں آتی، وہ رشوت کے جرم میں پکڑے جاتے ہیں اور انہیں سزا ہو جاتی ہے سمن کی ماں گنگا جلی کے رشتہ دار کی مدد سے سمن کی شادی گجادھر سے کر دیتی ہے اور وہ خود چھوٹی لڑکی شانتا کے ساتھ اپنے رشتہ دار کے پاس چلی جاتی ہے۔ گجادھر

غریب تھا ہی ساتھ ہی ساتھ بدمزاج اور شکی بھی تھا، سمن کا شوہر طرح طرح کے ظلم کرتا اور تکلیف پہنچا تا ہے ان سب کو تو وہ برداشت کر لیتی ہے لیکن وہ آوارگی اور بدچلنی کے الزام کو برداشت نہیں کر پاتی اور جب گجادھر گھرا سے نکل جانے کا حکم دیتا ہے تو وہ مجبوراً گھر سے نکل جاتی ہے جب گجادھر سخت الفاظ میں کہتا ہے جاؤ اب منہ نہ دکھانا، تو سمن سوچتی ہے:

''کیا میں ایسی بدنصیب ہوں کہ میرا منہ بھی دیکھنا
نہیں چاہتے کیا سنسار میں سب عورتوں کے شوہر ہوتے
ہیں؟ کیا بیکس عورتیں نہیں ہوتیں میں بھی بیکس ہوں
مزدوری کروں گی بھیک مانگ کر کھاؤں گی مگر انہیں کبھی
منہ نہ دکھاؤں گی''۔ 15؎

سمن دل سے اپنے شوہر کا گھر چھوڑنے پر راضی نہیں تھی وہ ایک شوہر کی خدمت گزار گھریلو عورت تھی جب سمن کے شوہر نے اسے دھتکار کر گھر سے نکال دیا تو وہ اپنی سہیلی سبھدرا کے گھر پناہ لیتی ہے لیکن صرف دو ہی دن بعد اسے گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔ کیونکہ لوگ اس کی سہیلی سبھدرا کے شوہر شرما جی کو الزام دینے لگتے ہیں۔ سمن کو ان حالات میں طوائف خانہ کے سوا کوئی سہارا نظر نہیں آتا۔ پریم چند نے اس ناول میں طوائف خانے کو ''بازارحسن'' کا نام دیا ہے۔ بازارحسن سمن کے گھر کے سامنے ہی تھا وہ کبھی کبھی سوچتی کہ بازارحسن کی چوکھٹ پر امراء اور عزت دار لوگ آتے ہیں اور بازارحسن کی رقاصہ بھولی کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں اور گھریلو عورتیں دو وقت کی روٹی کو ترستی ہیں سمن سوچتی ہے:

''اس نے دیکھا کہ بھولی کے سامنے صرف دولت مند
ہی سر نہیں جھکاتے بلکہ سادھو مہاتما بھی اس کے شہید ناز
ہیں وہی عورت جس کو اپنی مذہبی ریا کاری سے زیر کرنا

چاہتی ہوں یہاں ٹھاکر جی کے مقدس مندر میں عزت اور

تعلیم کے رتبہ پر بیٹھی ہوئی ہے اور میرے لئے کہیں کھڑے

ہونے کی بھی جگہ نہیں ہے'' ۔16

بھولی سمن کو پناہ دیتی ہے۔ بھولی کی کہانی بھی سمن کی طرح ہی ہے بے جوڑ شادی ہے وہ بھی اپنے بوڑھے شوہر کے ظلم سے تنگ آ کر بازارحسن کا رخ کرتی ہے سمن کچھ دنوں میں گانا بجانا سیکھ کر مشہور طوائف بن جاتی ہے۔اس کی ایسی زندگی پر آمادہ ہونے پر شرما جی محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے سمن کو گھر سے جانے دے کر بھول کیا ہے، لہٰذا وہ دوسرے لیڈروں کو ساتھ لے کر طوائفوں میں اصلاح کی تحریک چلاتے ہیں اور سمن کے پاس آ کر اُسے بھی سمجھاتے ہیں، لیکن اس وقت وہ نہیں مانتی لیکن چند دنوں بعد وہ اپنی چھوٹی بہن کو ڈھونڈ ھ کر اس کی شادی اس شخص سے کرادتی جو اس کے دروازے سے بارات واپس لے کر چلا گیا تھا۔اور خود بھی انہیں کے ساتھ دریا کے کنارے رہنے لگتی ہے لیکن اپنی بہن اور پڑوسیوں کی اذیت ناک باتوں سے تنگ آ کر وہ آشرم میں پناہ لیتی ہے اور طوائفوں کے بچوں کو تعلیم و تربیت دینے لگتی ہے۔

پریم چند نے اس ناول کے کردار سمن بھولی کے ذریعہ یہ دکھایا ہے کہ بھٹکی ہوئی عورتوں کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ان میں اچھی اور باعزت زندگی گزارنے کا جذبہ موجود ہوتا ہے انہیں رہنمائی اور مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور سماج انہیں مدد دینے کے بجائے ان کو اذیت دیتا ہے جس کا نتیجہ کہ سماج میں بدکاری اور بے حیائیبڑھتی جارہی ہے۔

پریم چند نے 1922ء میں ''گوشۂ عافیت'' ناول لکھا یہ ناول بہت ضخیم ہے اور دو حصوں میں منقسم ہے۔اس میں مختلف طبقات کے لوگوں اور خصوصاً محنت کش کسانوں اور مزدوروں کی زندگی اور مسائل کی تصویر کشی کی گئی ہے۔اس ناول میں عورتوں کے عام مسائل جو کہ مردوں کے ساتھ ساتھ انہیں بھی جھیلنے پڑتے ہیں

ان کا بھی ذکر پہلو بہ پہلو کیا گیا ہے۔

ناول ''گوشۂ عافیت'' کا مرکزی کردار گائتری اعلیٰ طبقہ کی مالدار بیوہ ہے اس مظلوم بیوہ کو گائتری کی چھوٹی بہن کا شوہر گیان شنکر بھگتی کے مصنوعی ڈھونگ میں پھنسا لیتا ہے پریم چند گائتری کی شکل میں ایک بیوہ کی لاچاری اور معصومیت کے استحصال کو بیان کیا ہے جو دوسروں کی عیاری اور مکاری کا کتنی آسانی سے شکار ہو جاتی ہے۔

اس ناول کی دوسری نسوانی کردار ودریاتی ہے۔ ودیارتی کے ذریعہ پریم چند نے ہندو سماج کی خدمت گذار وفا شعار بیوی کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ ودیارتی گیان شنکر کے ظلم وستم برداشت کرتی ہے وہ بیوہ بہن گائتری کو اپنے جال میں پھنساتا ہے اور اس کے باپ کی دولت کے لالچ میں زہر دے کر مارنے کی بھی کوشش کرتا ہے ودیارتی یہ سب جان کر بھی اپنے شوہر کی فرمانبرداری کرتی ہے جب ایک رات اس کی مرضی کے خلاف اس کا بیٹا گائتری کو گود لینے دے دیا جاتا ہے تو وہ برداشت نہیں کر پاتی اور خود کو ہی زہر دے کر خاموش کر لیتی ہے پریم چند نے ان دونوں نسوانی کرداروں کے ذریعہ بیوہ کی لاچاری اور شوہر پرست بیوی کے مسئلے کو پیش کیا ہے۔

اس ناول میں پریم چند نے عورتوں میں تعلیم کی کمی سے پیدا ہونے والے تنگ نظری مسئلے کو بھی پیش کیا ہے شردھا ایک کم تعلیم یافتہ راسخ العقیدہ ہندو عورت ہے جس کا شوہر پریم شنکر امریکہ سے واپس آتا ہے تو شردھا اس سے ملنا نہیں چاہتی چونکہ اس کے ذہن میں مصنوعی روحانیت کا بھگت گیان شنکر کہتا ہے کہ سمندر پار جانے کی وجہ سے دھرم بھرشٹ ہو جاتا ہے وہ پریم شنکر سے محبت کرتی ہے اور اس کی پوری مدد کرتی ہے لیکن اس وقت تک ملنے کو تیار نہیں رہتی جب تک وہ پرائشچت نہ کرے۔ آخر میں پریم چند نے یہ دکھایا ہے کہ شردھا کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور وہ پریم شنکر سے مل جاتی ہے اور اس کے سماج سدھار کاموں میں اس کا ہاتھ بٹاتی ہے۔

پریم چند نے ناول ''نرملا'' میں نرملا اور اس کے خاندان کی تباہی کا سبب 'جہیز' کو بتایا ہے اس ناول

میں پریم چند نے درمیانی طبقہ کی ایک پندرہ برس کی لڑکی کو پیش کیا ہے جس کی شادی جہیز نہ ہونے کی وجہ سے چالیس سال کے ایک بوڑھے سے کر دی جاتی ہے۔نرملا کا باپ ایک کھاتا پیتا وکیل تھا،لیکن وہ اصول پرست ہونے کی وجہ سے دولت مند نہیں تھا۔ بھال چند اپنے بیٹے بھون جو کہ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کیا ہے کے لئے نرملا کا رشتہ لاتا ہے نرملا کے والد جب شادی تیاریوں میں بے تحاشہ پیسہ خرچ کرتے ہیں تو نرملا کی ماں کہتی ہے:

''جب سے برھما جی نے دنیا کو بنایا تب سے آج تک
کوئی براتیوں کو خوش نہیں کر سکا۔انہیں عیب نکالنے اور برائی
کرنے کا کوئی نہ کوئی موقع مل ہی جاتا ہے جسے اپنے گھر
سوکھی روٹیاں بھی نصیب نہیں وہ بھی بارات میں جا کر
تانا شاہ بن جاتا ہے''۔17

جہیز کی لعنت نے لڑکیوں کے تمام خوبیوں کو پس و پشت ڈال دیا ہے۔پریم چند ناول نرملا میں اسطرح واضح کرتے ہیں۔

بدنصیب کو اچھا گھر اور بھر کہاں ملتا ہے اب تو کسی طرح
سر کا بوجھ آتارنا تھا کسی طرح لڑکی کو پار لگانا تھا،اسے کنویں
میں ڈھکیلنا تھا۔وہ خوب صورت ہے خوش خو ہے ہوشیار ہے
معزز ہے تو ہوا کرے۔جہیز نہیں تو اس کے جملہ اوصاف
عیوب ہیں۔۔۔۔انسان کی کوئی قدر نہیں صرف جہیز کی
قدر ہے''۔18

نرملا کے باپ کا ایک رات قتل ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے نرملا کی ماں کلیانی جہیز کا مطالبہ پورا نہیں کر پاتی اور یہ رشتہ ٹوٹ جاتا ہے،مجبواً نرملا کی ماں کلیانی اس کی شادی ایک چالیس سالہ طوطا رام سے کر دیتی ہے

طوطا رام پیشے سے وکیل ہیں دولت کی ریل پیل ہے اور پہلی بیوی کے تین لڑکے ہیں جو نرملا کی عمر کے برابر ہیں۔عمر کے اس فرق کی وجہ سے طوطا رام اور نرملا کی زندگی میں شک وشبہات جنم لیتے ہیں اور نرملا کو پے در پے آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

نرملا اپنے سوتیلے بڑے بیٹے منسا رام کو لے کر شک کیا جاتا ہے طوطا رام اپنے بڑے لڑکے پر اتنا شک کرتا ہے کہ اُسے گھر سے دور بورڈنگ میں داخل کر دیتا ہے منسارام ان باتوں کو محسوس کرتے ہوئے گھر سے دور بورڈنگ میں اپنے آپ کو سزاء دیتا ہے اور آخر کار وہ بیمار پڑ جاتا ہے اس بیماری میں بھی طوطا رام اس کو اپنے گھر لانے کی بجائے اسپتال میں داخل کر دیتا ہے،نرملا کو ہسپتال جانے کی پابندی ہوتی ہے لیکن پھر بھی وہ ہمت کر کے منسادام سے ملنے اسپتال جاتی ہے تو طوطا رام کو احساس ہوتا ہے کہ اس کا شک غلط تھا لیکن وہ اپنی غلطی کو سدھار نہیں سکتا کیونکہ منسا رام کا انتقال ہو جاتا ہے اور دوسرا لڑکا بھی سادھوؤں کے ساتھ بھاگ جاتا ہے نرملا اپنی لڑکی اور چھوٹے لڑکے کی پرورش بہت کسمپرسی سے کرتی ہے طوطا رام ان تمام تباہیوں کا ذمہ دار خود کو ٹھہراتے ہوئے گھر سے نکل کر جوگی بن جاتا ہے۔

نرملا پورے ناول میں قدیم اقدار کی حامل کردار کی شکل میں سامنے آتی ہے وہ شوہر کو دیوتا سمجھتی ہے اپنے اوپر آئی مصیبتوں کو پچھلے جنم کے گناہ کا کفارہ سمجھتی ہے۔اس ناول کی دوسری عورتیں کرشنا ( چھوٹی بہن ) کلیانی ( ماں ) سدھا ( سہیلی ) رکنی ( نند ) خاص اہم کردار نہیں ہیں،رنگیلی بائی ضمی اپنے شوہر اور بیٹے کو نرملا کے رشتہ کو صرف جہیز کے نہ ملنے کی وجہ سے ٹھکرانے پر برا بھلا کہتی ہے لیکن جب اس کا لڑکا خود انکار کر دیتا ہے تو وہ مجبور ہو جاتی ہے۔

پریم چند کا یہ ناول جہیز،بے جوڑ شادی،کنواری لڑکیوں کی ایسی جگہ شادی جہاں برابر کی عمر کے سوتیلے بیٹے ہوں جیسے مسائل کو اجاگر کیا ہے،یہ مسائل ہندوستان کے سماج کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہے ہیں ان کے

آگے ایک نرملا کا مسئلہ نہیں تھا وہ سارے سماج کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اسی لیے انہوں نے ناول کے آخر میں جو الفاظ ادا کئے ہیں وہ خاص اہمیت رکھتے ہیں نرملا اپنی چھوٹی کی کہتی ہے۔

''چاہے کنواری رکھیئے گا۔ چاہے زہر دے کر مار ڈالئے گا، مگر نا اہل کے گلے نہ بنا دھیئے گا۔ اتنی ہی آپ سے میری بنتی ہے''۔19؎

نرملا کے بعد 1924ء میں پریم چند نے ''چوگان ہستی'' لکھا اس ناول میں اندو کا کردار ہمارے سامنے شوہر اور بیوی کی ذہنی نا اتفاقی اور نظریات کے اختلافات کے مسائل کو پیش کرتا ہے اندو ایک انقلابی اور حریت پسند ماں کی بیٹی ہے جس کی شادی ایک تنگ نظر قوم فروش راجہ سے ہو جاتی ہے وہ ذہنی طور پر اپنے شوہر مہندر سنگھ کی ہم نوا نہیں ہو پاتی۔ اور اسی لیے ان میں کشیدگی رہتی ہے۔ شوہر اپنی برتری کا اظہار کرتا ہے اور چاہتا ہے اندو اس کے احکام کی پابندی کرے۔ لیکن اندو ایسا نہیں کرتی وہ سوچتی ہے کہ:

''بیوی کا فرض ہے کہ وہ شوہر کی رفیق بنے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عورت کی مرد سے الگ کوئی ذاتی ہستی نہیں ہے اسے تو عقل سلیم قبول نہیں کرتی۔ دونوں اپنے اپنے اعمال کے موافق سزا و جزاء کے مستحق ہوتے ہیں''۔20؎

چوگان ہستی کی دوسری نسوانی کردار سوبھاگی نچلے طبقہ کے مسائل کو لے کر ابھرتی ہے وہ اپنے شوہر کے خلاف جا کر دوسروں کے گھر پناہ لیتی ہے سوبھاگی کے علاوہ چوگان ہستی میں زینب اور کلثوم کے کردار ہیں زینب میں سوتیلی ماں کی تمام برائیاں ہیں، اس ناول میں پریم چند نے معاشرے کے عام مسائل کو پیش کیا ہے۔

زیورات عورتوں کی زندگی میں بے انتہا اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے سماج میں کئی طرح کے گناہ کھڑے ہوئے اس کی ایک تصویر ہمیں پریم چند کے ناول ''غبن'' میں ملتی ہے۔ جالپا ناول کی ہیروئن ہے جسے

بچپن سے زیوروں کا بہت شوق ہے شادی کے بعد اپنے شوہر رما سے چندن ہار کی فرمائش کرتی ہے رما کو اپنی بیوی کی خواہش پوری کرنے کے لئے غبن کرنا پڑتا ہے اور اس غبن کی وجہ سے وہ مصیبتوں میں گرفتار ہوتا ہے پریم چند عورتوں میں زیور کے لئے دلچسپی کو اس طرح لکھا ہے:

''جالپا کو زیوروں سے جتنی الفت تھی اتنی شائد دنیا کی اور کسی چیز سے نہ تھی''۔21؎

رما اپنی بیوی کے زیور بنانے کے لئے روپئے کسی بھی حالت میں حاصل کرنا چاہتا ہے وہ سوچتا ہے:

''وہ کوئی ایسی تدبیر سوچ نکالنا چاہتا تھا جس سے وہ جلد از جلد بے حساب دولت کا مالک ہو جائے۔ کہیں اس کے نام کی لاٹری نکل آتی تو پھر وہ جالپا کو زیوروں سے مڈھ دیتا سب سے پہلے چندن ہار بنواتا۔ اس میں ہیرے جڑوا دیتا۔ اگر آج اسے جعلی نوٹ بنانا آجاتا تو جرور بنا کر چلا جاتا''۔22؎

گئودان پریم چند کے ناولوں میں آخری ناول ہے جو انہوں نے 1935ء میں لکھا ہے یہ ناول ہندوستان کے وسیع و عریض احاطے پر بسنے والے سماجی ڈھانچے کے معاشرتی نظام کی ترجمانی کرتا ہے ہندوستان ایک زرعی ملک ہے یہاں کی اسّی فیصد آبادی زراعت سے جڑی ہے لیکن کسانوں کے حالات بد سے بدتر ہیں۔ انہیں چند امیر لوگ لوٹتے رہتے تھے۔

ناول کی کہانی بلاری گاؤں کے ایک کسان ہوری کے گرد گھومتی ہے وہ ایک معمولی کسان ہے جس کا پانچ نفوس پر مشتمل چھوٹا سا کنبہ ہے جس میں ہوری کی بیوی دھنیا، اس کا لڑکا گوبر اور دو لڑکیاں روپا اور سونا ہیں جن کا گذر بسر چار بیگھا زمین پر ہے۔ جس کی کاشت کے ذریعہ اتنی بھی آمدنی نہیں ہے جس سے یہ چھوٹا سا

کنبہ دو وقت، پیٹ بھر کر کھانا کھا سکے ہوری کو کاشت کے بیج سے لے کر کٹائی کے تمام کاموں کے لئے قرض لینا پڑتا ہے۔

اس ناول میں شہری زندگی کو بھی اجاگر کیا گیا ہے مسٹر مہتا، اونکار ناتھ، مسٹر ٹنخا، رائے اگر پال، گوبندی، مالتی وغیرہ کے کردار کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ پریم چند نے ان کرداروں کے ذریعہ اعلیٰ اور متوسط طبقہ کے مسائل ان کی گھریلو زندگی کی کشمکش کو پیش کیا ہے۔

گئو دان کے زیادہ تر کردار ادنیٰ طبقہ کے دیہاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں عورتوں میں سب سے اہم کردار دھنیا کا ہے اس کے علاوہ سلیا، جھنیا، سونا، روپا، نہری، مہاراجن، جنگلی لڑکی، یہ سارے کردار گاؤں کی زندگی کی خراب حالت، عورت کا استحصال، سماجی نظام میں عورت کی پستی کی غمازی کرتے ہیں۔ ہوری کی بیوی دھنیا ایک وفا شعار بیوی اور ایک محبت کرنے والی ماں کے کردار میں نظر آتی ہے۔ پریم چند نے دھنیا کے کردار کے روپ میں ایک دیہاتی زمیندار ہندوستانی عورت کی بہترین تصویر کشی کی ہے مثلاً:

> '' ہوری لاٹھی کاندھے پر رکھ کر گھر سے نکلا تو دھنیا دروازے پر کھڑی ہوئی اسے دیر تک دیکھتی رہی، اس کے مایوسانہ الفاظ نے دھنیا کے چوٹ کھائے ہوئے دل میں ہلچل سی پیدا کر دی تھی وہ گویا استری دھرم کے پوری تپسیا کے ذریعہ اپنے شوہر کو بلاؤں سے بچائے رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے دل سے گو ایک گڑھ (حصار) سا نکل کر ہوری کو محصور کئے لیتا تھا۔ مصیبت کے اس اتاہ ساگر میں صرف سہاگ ہی وہ تنکا تھا جس کے سہارے وہ اسے پار کر رہی تھی''۔ 23

دھنیا دنیا کے معاملات کو باریکی سے سمجھ نہیں پاتی تھی وہ زمیندار اور اہلکاروں کی خوشامد کو غیر ضروری سمجھتی ہے جو کچھ بھی وہ اچھا یا برا دیکھتی ہے کھرا کھرا کہہ دیتی ہے وہ جھنیا کو اپنی بہو کے روپ اپنانے کے لئے سماج سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ وہ رشوت کے خلاف سارے گاؤں والوں کے سامنے داروغہ کو کس طرح کھری کھری سناتی ہے دیکھئے:

''میں سب جانتی ہوں، یہاں تو حصہ بانٹ ہونے والا تھا، سبھی کے منہ میٹھے ہوتے یہ ہتھیارے گاؤں کے مکھیا ہیں گریبوں کا کھون چوسنے والے، سود،۔ بیاج، ڈیڑھی سوائی، نجر بھینٹ گھوس رشوت، جیسے ہو گریبوں کو لوٹو، اس پر سوراج چاہئے جہل سے سوراج نہ ملے گا۔ سوراج ملے گا دھرم سے نیائے سے''۔24؎

پریم چند دھنیا کے ذریعہ تعلیم یافتہ لوگوں پر طنز کر رہے ہیں جو کسانوں کو بے وقوف بنا کر لوٹتے ہیں۔ اس ناول میں جھنیا ایک بیوہ عورت ہے جو ایک عام زندگی چاہتی ہے۔ جھنیا کے ذریعہ پریم چند نے بیوہ کی دوسری شادی کے مسئلے کے حل کی صورت میں دکھائی ہے۔ ہوری کے لڑکے گوبر کو جھنیا سے محبت ہو جاتی ہے اور وہ اسے اپنی بیوی بنانا چاہتا ہے، سماج اس کی اجازت نہیں دیتا۔ گوبر ان سب پریشانیوں کے خوف سے گاؤں سے بھاگ جاتا ہے۔ لیکن دھنیا گوبر کی ماں اس دوران جھنیا کو اپنے گھر میں پناہ دیتی ہے جس کی وجہ سے سارا گاؤں ان کا سماجی بائیکاٹ کرتا ہے اور پوری تیار فصل جرمانے کے طور پر ہڑپ لیتے ہیں اس کے باوجود دھنیا جھنیا کو بہو بنا کر گھر میں رکھتی ہے۔

سلیا چمارن کے کردار میں پریم چند گاؤں کی نوکر داشتہ کا مسئلہ پیش کیا ہے وہ ماتا دین کی داشتہ ہے جو

اس کے ساتھ مرنے اور جینے کا فیصلہ کر چکی ہے وہ دن رات اس کے گھر کا کام کرتی ہے پھر بھی اس کے گھر پر اس کا کوئی قانونی یا سماجی حق نہیں ہے گئو دان میں ان نسوانی کرداروں کے علاوہ ہنری، چویا، پنیا، روپا اور سونا کے کردار ہیں جو غریب طبقہ میں ہونے والی مشکلوں اور تکالیف سے گھرے ہیں۔

سردار جعفری نے گئو دان کے کرداروں کو لافانی کہا ہے:

''پریم چند نے ہوری، دھنیا، بلراج کی تخلیق کر کے ان گمناموں کو نام اور بے زبانوں کو زبان دیدی، موجودہ نسلیں ہوری، اور دھنیا اور بلراج کے ذریعہ سے اپنے عہد کی حقیقت کو سمجھیں گی اور اپنے سماج کی ناانصافیوں اور سماج کی اداروں کے خلاف احتجاج کریں گی''۔25ے

## کرشن چندر کے نسوانی کرداروں کے مسائل

کرشن چندر کی پہلی تحقیق 1932ء میں ''پروفیسر بلیکی'' کے عنوان سے ایک طنزیہ خاکے کی صورت میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس کے بعد 1943ء میں جب کہ ان کا پہلا ناول ''شکست'' شائع ہوا تو انہوں نے افسانہ نگاری میں اپنا ایک مقام بنا لیا تھا۔ کرشن چندر کی زندگی کا یہ عہد جب کہ ان کا ادبی شعور پختہ ہو رہا تھا ملک کی تاریخ کا ایک ایسا دور تھا جس میں تہذیبی اور سماجی قدریں تغیر و تبدل سے دوچار تھیں اور ان تبدیلیوں کا اثر ہندوستانی عورت کی زندگی پر بھی پڑ رہا تھا۔

ہندوستانی عورت کو ابھی مکمل طور پر سماجی آزادی نہیں ملی تھی۔ اس کے بے شمار سماجی مسائل ابھی جوں کے توں موجود تھے۔ پھر دیکھتے دیکھتے ان مسائل میں نئی نئی تبدیلیاں آ رہی تھیں عورت تعلیم حاصل کرنے اور روزی کمانے کی طرف قدم بڑھانے لگی اس کا یہ اقدام ایک بڑا کارنامہ تھا۔ اس کارنامے کے پیچھے بے شمار

فوائد تھے تو ساتھ ہی ساتھ اس سے کچھ نقصانات کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ بھی تھا۔

کرشن چندر کے کردار، چاہے مرد ہوں کہ عورت زندگی سے حد درجہ قریب ہوتے ہیں اور زندگی کے نشیب فراز سے مقابلہ کرتے ہیں۔ ان کی کردار نگاری کا یہ خصوصی وصف ہے کہ اس میں افراد کی نفسیاتی ذہنی اخلاقی معاشرتی اور طبقاتی تمام قدروں اور معیار کا احاطہ کیا جاتا ہے ان کے ناولوں میں نسوانی کردار چاہے کسی بھی طرز زندگی کے زیر سایہ ہوں بنیادی طور پر نسوانی جذبات میں گھرے ہوتے ہیں، کرشن چندر نے اپنے ناولوں میں عورت سے متعلق پائی جانے والی قدروں کی تلاش کرنے ان کی ہہ میں پائے جانے والے اسباب کو ڈھونڈ ھ نکالنے، ان پر تنقید کرنے اور کبھی کبھی ان کی اصلاح کی راہیں تلاش کرنے کی بھر پور کوشش کی ہے وقار عظیم کرشن چندر اور ان کے ہم عہد کے ناولوں میں کردار نگاری کی اہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس دور کے نمایاں ترین ناول ہیں ۔۔۔سجاد ظہیر کا مختصر ناول 'لندن کی ایک رات' کرشن چندر کا شکست، عزیز احمد کا، گریز، اور عصمت کا ٹیڑھی لکیر، ان سب ناولوں میں ناول نگاروں کے مزاج، انفرادی رنگ طبیعت اور مخصوص انداز فکر و نظر نے جو فرق پیدا کئے ہیں ان سے قطع نظر بعض باتیں مشترک ہیں۔ ان سب ناولوں میں لکھنے والے کی توجہ کا مرکز واقعات نہیں بلکہ کردار ہیں۔ یہ کردار ایک خاص عہد کے سیاسی اور معاشی انتشار اور اضطراری کے پیدا کئے ہوئے انتشار و اضطراب کا عکس ہیں''۔ 26؎

کرشن چندر نے معاشرتی بحران کے سبب انسان کی زندگی میں پیدا ہونے والی نفسیاتی پیچیدگیوں کو اپنے ناولوں میں بخوبی پیش کیا ہے۔

انہوں نے دیکھا کہ عورت اپنا ہی نہیں بلکہ مرد کی طرح پورے کنبے کا پیٹ بھر سکتی ہے مگر عورت کو محض کمائی کی دہلیز پر کھڑا ہونے کے قابل بنا دینا ہی اس کے تمام مسائل کا حل نہیں ہے۔ کرشن چندر کے خیال میں اس کے مسائل کا سب سے بڑا حل عورت کو سماج میں ایک ذمہ دار باعزت فرد کی حیثیت اور دلوانا، خود عورت کو اپنی اہمیت، انفرادیت اور اپنے مقام کو سمجھنے کے قابل بنانا اور اس کے بنیادی نسوانی جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کر دینا ہے۔ چنانچہ کرشن چندر نے اپنے ناولوں میں اس بات کی پوری پوری کوشش کی ہے کہ عورت کی اہمیت اور اس کی انفرادی حیثیت کا احساس مکمل طور پر دلایا جائے۔ حالانکہ یہ بات ان کے تمام ناولوں کے تعلق سے نہیں کہی جا سکتی لیکن کچھ ناول ایسے ہیں جن میں انہوں نے اس طرح توجہ دلائی ہے۔

کرشن چندر عورت کو اس کی حقیقی اور معقول قدروں کے ساتھ پہچاننا پسند کرتے ہیں اور ان کے دل میں اس کی نسوانیت اور نسائیت کا حد درجہ احترام ہے۔ انہوں نے ہندوستانی عورت کی پچھلی صدیوں کی تاریک ترین زندگی کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ ناول '' شکست'' میں انہوں نے شیام کے توسط سے عورت کی پسماندگی سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ دراصل ان کے دل میں پائے جانے والے غم و غصہ کا اظہار ہے:

> '' شیام کو احساس ہوا جیسے سیتا کنڈ میں صرف سیتا ہی
> نہیں بلکہ سارے ہندوستانی سماج کی عورتوں کے آنسو
> چھلک رہے ہیں جن کی زندگیاں صدیوں سے تاریک،
> خاموش اور اداس ہیں اور شیام کو اپنے احساس کی تلخی میں یہ
> بالکل مناسب معلوم ہوا کہ سیتا کنڈ سب سے نیچے بنایا گیا
> تھا نیلے آسمان کے مسرت بھرے نور سے دور ایک چٹان کی
> سنگلاخ چھاتی میں، چاروں پتھر کی، دیواروں کے بیچ ،

یہاں روشنی کسی دراز میں سے گزر کر بھی نہیں پہنچتی تھی
یہی ہندوستانی عورت کی صحیح جگہ ہے سب سے نیچے
قدموں میں پھر وہیں کھڑے کھڑے عالم خیال میں یا
حقیقت میں ایسے پتہ نہیں اسے احساس ہوا جیسے وہ
دھرتی کی بیٹی کی آہیں سن رہا ہے اس کی مدھم سسکیاں جو
دھرتی کا سینہ چیر کر اس ظالم چٹان کی چھاتی چیر کر فضا
میں چاروں طرف پھیلا رہی ہیں جیسے دھرتی کی بیٹی آہ و
بکا کر رہی ہو میرے رام، میرے رام''۔ 27

کرشن چندر ماں کی حیثیت سے عورت کو نہایت ہی اعلیٰ مقام دیتے ہیں۔ انہوں نے عورت کو محض مخلوق ہی نہیں بلکہ خالق کی حیثیت سے ایک اعلیٰ مقام دیا ہے۔ چنانچہ ناول ''شکست'' میں ان کا یہ نظریہ اس طرح سامنے آتا ہے:

''بے شک سیتا دیوی دھینہ ہے اس کی روح پر اس کی
زندگی پر ہزار بار لاکھوں بار سلام۔ سیتا دھرتی کی بیٹی ہی
نہیں وہ خود دھرتی ہے، عورت دھرتی وہ زندگی کا منبع ہے وہ
زندگی کی منزل ہے، اس کے اول اس کی آخر، نیچے اور اوپر،
اس کی سمت کا کوئی پتہ نہیں وہ خود تاریکی میں رہتی ہے لیکن
اس تاریکی سے وہ ان درخشاں موتیوں کو پیدا کرتی ہے۔
جنہیں لوگ رام اور لکشمن کہتے وہ خود اداس ہے لیکن اس
کی پلکوں پر ہمیشہ آنسو کانپتے رہتے ہیں وہ اپنے اداس
آنسوؤں کی گہرائیوں میں سے اس نورانی مسرت کے ابلتے

ہوئے کنڈ کو نکال لاتی ہے جس کا شفاف پانی اپنی معصومیت میں نیلے آسمانوں کو بھی شرماتا ہے۔ وہ خود خاموشی ہے لیکن اپنی گہری خاموشی کے سینے سے اس لازوال نغمے کی تخلیق کرتی ہے جس کی پنہائیوں میں انسانی زندگی کی ہر دھڑکن اپنی تمام تر صعوبتوں اور مسرتوں کے ساتھ سنائی دیتی ہے اس کی زندگی کے خالق کو ہزاروں بار، لاکھوں بار سلام''۔28؎

کرشن چندر نے عورت کے لیے اپنے دل میں پائے جانے والے احترام اور عقیدت کے باعث ہندوستان میں عورت کی سماجی بدحالی کی مختلف صورتوں پر نئے نئے زاویوں سے روشنی ڈالی ہے اور ان حقائق کو وضح کیا ہے تاکہ عوام میں عورت سے متعلق مسائل کو حل کرنے کا شعور پیدا ہو اور اس سلسلے میں کامیاب کوشش کی جائے، انہوں نے بمبئی آنے کے بعد فلمی دنیا کے کئی مسائل کو قریب سے دیکھا تھا اور اسکے علاوہ بھی ہندوستانی سماج میں جہاں کہیں کھوٹ نظر آیا انہوں نے اپنے ناولوں میں پیش کر کے اس کے اصلاح کی کوشش کی ہے ان کے ناولوں کے کرداروں سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ انہیں عورت کو ذلیل کرنے والوں سے نفرت ہے۔ کسی بنیادی ضرورت کے تحت مجبور ہو کر ذلت کی زندگی قبول کرنے والی عورتوں سے ہمدردی ہے اور محض مال و دولت یا شہرت کی خاطر ناکارہ اور غیر حقیقی قدروں کو اپنا لینے والی عورت سے شدید نفرت ہے ان کے ان نظریات کا ثبوت ان کے کئی نسوانی کرداروں کے جائزہ سے ملتا ہے۔

ناول ''ایک وائلن سمندر کے کنارے'' میں شوبھا جب طوائف بنادی جاتی ہے اور اس کا مالک اپنے قرض دہندہ کو اپنا فلیٹ دے دینے کے بعد شوبھا کو یہ سمجھاتا ہے کہ وہ بھی اس قرضے کی ادائیگی میں شامل ہے تو شوبھا حیران و پریشان یہ سوچتی رہ جاتی ہے کہ:

''کس طرح یہ مرد ہوتے ہیں جو عورت کے جسم پر اپنے

نام کی تختی لگا دیتے ہیں اور اسے شادی کہتے ہیں یا محبت کہتے ہیں یا طوائف کہتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ کچھ نہیں بدلا، عورت کیا ایک فلیٹ ہے کہ وہ لکڑی کی ایک تختی ہے کہ گرم گوشت کا ایک لوتھڑا ہے کہ وہ ایک قرض ہے جو کہ آنے پائیوں کے ساتھ چکایا جاتا ہے کہ محض ایک جسم ہے جسے سماج کے قصائی کاٹ کاٹ کر مختلف گاہکوں کے ہاتھ فروخت کرتے رہتے ہیں؟ کیا وہ نہیں جانتے ہیں کہ عورت کے جسم کے اندر ایک روح رہتی ہے، کچھ آرزوئیں، کچھ تمنائیں کچھ یادیں کچھ تصویریں جن کے نام کی تختی کبھی نہیں بدلتی، پھر یہ مرد کیوں اس طرح کا سلوک ہم سے کرتے ہیں۔ کیوں ہماری آرزوؤں کو کچلتے ہیں، ہماری یادوں کو پاؤں سے روندتے ہیں، ہماری تصویروں کو اپنی ہوس رانیوں کا شکار بنا کر داغدار کرتے ہیں اور ہماری تمناؤں کے گلے پر چھری رکھ کر کہتے ہیں کہ کچھ نہیں بدلتا!''۔29

اس طرح ناول ''پانچ لوفر'' میں انہوں نے ایک غریب طوائف ''جمنا'' کا ذکر کرتے ہوئے اس ترقی یافتہ زمانے میں جمنا کی یہ بدحالی سماج سدھار تحریکوں کی نااہلی پر یوں طنز کیا ہے:

''اس عہد میں انسان نے کتنی ترقی کی ہے، کپڑے پر سیسٹرائزڈ ہوگئے ہیں، کھانا پر پریشرائزڈ ہوگیا ہے، محبت پر سیسٹرائزڈ ہوگئی ہے، اور جمنا سولہویں سڑک کو جاری ہے''۔30

اس کے علاوہ اس ناول میں ایک بوڑھی بھکارن کو اپنے بھیک مانگنے کے آبائی پیشے پر فخر کرتے

ہوئے دکھا کر کرشن چندر لکھتے ہیں:

’’بھیک مانگنا اس کا آبائی پیشہ ہے اور ہندوستان بھی غریب
ملک ہے چنانچہ کوئی اس بوڑھی بھکارن کو اس طرف توجہ دلانے
والا نہیں ہے کہ دنیا نے آج بڑی ترقی کر لی ہے، اور انسان چاند
پر پہنچنے کے بعد مریخ پر جانے کی کوشش کر رہا ہے‘‘۔31

ناول ’’پانچ لوفر‘‘ کے ایک نسوانی کردار شانتا کول جو کہ تخریبی صلاحیتوں کا مالک ہے ایک موقع پر ’’لام‘‘ یعنی لعنت ہند کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور اس طرح کے بے شمار مقامات اور کردار ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کرشن چندر کو گھٹیا جذبات اور خواہشات کی تسکین کے لئے عورت کا خود کو ذلیل بنا لینا یا سماج کا کسی مظلوم عورت کو سہارا دینے کے بجائے اس کی تذلیل کرنا نہ صرف ناپسند رہا ہے بلکہ وہ اسے انتہائی غلط اقدام سمجھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کرشن چندر کی نگاہ ہمیشہ ہی سماج کی اصلاح اور انسانیت کے فروغ کی طرف رہی ہے اس لئے ان کی نظر سماج کے ہر طبقے پر پڑتی ہے اور چونکہ انہیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ اعلیٰ طبقوں کے افراد کی بہ نسبت پسماندہ طبقوں کی زندگیا مسائل سے بھرپور اور بے شمار الجھنو سے دوچار ہوتی ہے اس لئے وہ سماج کو ترقی دینے اور ترقی یافتہ بنانے کے لئے ان کی طرف زیادہ توجہ دینا اور ان کی اصلاح کا سامان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ چنانچہ کرشن چندر اپنے ناولوں میں اکثر ایسی عورتوں کے کردار پیش کرتے ہیں جن کا ذکر بھی ہمارے مہذب اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔

کرشن چندر ’’ہزار دیوانے‘‘ کے دیباچے میں لکھتے ہیں’’
میں عوام کے لئے لکھتا ہوں، صرف چند مخصوص بے حد
پڑھے لکھے انٹیلکچول لوگوں کے لئے جو ایک بات کہتے

وقت سو بار اپنے ہونٹوں کو خمیدہ کرتے ہیں جن کی بات کو سمجھنے کے لئے سو بار ڈکشنری دیکھنی پڑتی ہے جو عوام سے دور اپنی ذات کے مرمریں گنبد میں الگ زندگی بسر کرتے ہیں جنہیں عوام کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں جن کی زندگی میں کوئی جذبہ نہیں کوئی عزم پکار نہیں نہ اپنے ملک کی بہتری کے لئے نہ قوم کی بہبودی کے لئے'' جو نہ کسی سے محبت کریں، نہ کسی سے نفرت نہ کسی کے مرنے پر روئیں نہ کسی کے خوش ہونے پر بلکہ زندگی کے ہر مسئلہ کو مونٹ ایورسٹ کی بلندی پر چڑھ کر دیکھا کریں اور کبھی کبھار حقارت سے ہونٹ سکیڑ کر ایسے خشک ، بے رس فلسفیانہ فقرے کس دیں جن سے سوکھے ہوئے آلوؤں کی سی بو آتی ہے میرا اعتقاد، زندگی سے کٹے ہوئے ایسے تمام دانشور سے اُٹھ چکا ہے''۔32؎

کرشن چندر ایک عوامی ادیب ہیں عوامی ادیب عوام کے مسائل کو محض گنواتا نہیں بلکہ خود اپنے مسئلہ کی طرح واقعی سلجھا سکتا ہے مزید الجھ نہیں جاتا عوام کے مسائل میں عورت کے بھی بے شمار مسائل شامل ہیں۔ان مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بناتے ہوئے کرشن چندر پر مخلص اور حقیقت پسند بن جاتے ہیں حالانکہ ان کی رومانیت ہر جگہ ان کے ساتھ رہتی ہے۔

کرشن چندر عورت کی پاکیزگی، نرمی اور اس کی حیاداری کے اس قدم متعرف ہیں کہ انہیں عورتوں کا جدید فیشن کے نام پر بے ڈھنگے طور طریقوں کو اپنا لینا چست لباس زیب تن کرنا یا بے باک طرز زندگی کا اختیار

کرنا اچھا نہیں لگتا۔ چنانچہ ایک مل مالک کے ہاں منعقد ہونے والی شراب اور بوفے پارٹی کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عورتوں کے مغربی لباس جیسے ان کے جسم کی کھال
سے منڈھے ہوئے تھے ان کے سیدھے تلوؤں کے جوتے
۔۔۔ چھوٹے چھوٹے چہرے اور تقریباً گھٹے ہوئے سر یا
خچر دم بال دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ جانی پہچانی
عورتیں نہیں ہیں کسی سنیاسی کی چڑیلیں ہیں''۔33؎

اسی ناول کے ایک اور نسوانی کردار کیری کی رفتار و گفتار کی بے باکی پر ایک دوسرا کردار کہتا ہے:

''ہمارے زمانے میں عورتیں نہ تو اس طرح چلتی پھرتی
تھیں، نہ ایسے کپڑے پہنتی تھیں نہ اس طرح مردوں کی
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی تھیں ہائے وہ بادامی
آنکھوں والی عورتیں، ان کی نگاہ لجائی ہوئی ہوتی تھی، ان
کے بولنے کا لہجہ نازک اور شیریں ہوتا تھا وہ مرد کو دیکھتے ہی
یوں کانپ جاتی تھیں جیسے نرم و نازک اور نوخیز پودے ہوا
کے جھونکوں سے جھک جاتے ہیں۔ یہ کیسی
عورت ہے''۔34؎

ہندو سماج میں عورت جب تک سہاگن ہوتی ہے اسی وقت تک عورت ہے اور ایک انسان ہے وہ جس گھڑی بیوہ بن جاتی ہے اسی وقت اس سے تمام حقوق و مراعات چھین لیئے جاتے ہیں اور اسے اپنے مقام سے گرادیا جاتا ہے،۔اس کے ساتھ گندی نالی کے حقیر کیڑے کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے، ہندو سماج کے اس گھناونے

طریق کار پر قلم اٹھاتے ہوئے کرشن چندر لکھتے ہیں:

''بیوہ سماج کی لعنت نہیں ہے بلکہ سماج کے وہ افراد ہی
سماج کی لعنت ہیں جو عورت کو بیوہ ہو جانے کے بعد انسان
کا مرتبہ دینے سے کتراتے ہیں۔ جو اپنی نظریں صرف اس کی
جائیداد پر رکھتے ہیں اور اس کے جذبات واحساسات کو سمجھنے کی
بجائے اسے ایک منحوس اور حقیر شئے سمجھتے ہیں''۔35ؔ

ناولٹ ''میری یادوں کے چنار'' میں شانتی کو جو بیوہ ہوتی ہے مشورہ دیتے ہیں کہ وہ زندگی کی خوشیوں سے محروم ہو جانے کی بجائے آگے بڑھ کر خود ہی انہیں حاصل کرے وہ لکھتے ہیں:

''مگر یہ کس طرح کا ڈاکٹر تھا جو اسے بتا رہا تھا کہ زندگی
ہر انسان کی مقدس ہوتی ہے چاہے وہ بیوہ ہو یا شادی شدہ
امیر ہو یا غریب، دھرتی کی لعنت وہ لوگ ہیں پندرہ برس کی
کنواری بیواؤں کو شادی کرنے سے روکتے ہیں سماج کی
گندگی وہ انسان ہیں جو غریب عورتوں کا حق مارتے ہیں اور
وہی لوگ اس زندگی پر بوجھ ہیں جو کسی دوسرے کو خوش نہیں
دیکھ سکتے''۔36ؔ

کرشن چندر کے ناولوں کے نسوانی کردار ایک ایسے دور کے کردار ہیں جس میں نئی اور پرانی قدریں متصادم ہیں۔ وہ اپنے مختلف نسوانی کرداروں کے ذریعہ کئی کام لیتے ہیں، وہ ایک معمولی ذہن رکھنے والی عام عورت کو چونکا کر زمانہ شناس بننے کی طرف راغب کرتے ہیں جدید تعلیم یافتہ اور جدید تہذیب وتمدن کی کمزور قدروں کو اپنا کر گمراہ ہونے والی لڑکیوں میں عملی مشکلات کا جائزہ لینے، مستقبل کے بارے میں سوچنے اور اپنے

فطری تقاضوں کو سمجھ کر صحت مند راستوں پر آگے بڑھنے کا شعور اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بدکردار عورتوں کی بد اعمالیوں کا نفسیاتی جائزہ لیتے ہوئے ان عوامل کو کسی سابق نسلی یا معاشرتی یا اقتصادی بدحالی کا نتیجہ ثابت کرتے ہیں اور انقلابی ذہنیت رکھنے والی لڑکیوں کے ذریعہ بوسیدہ تہذیبی قدروں کو متزلزل کر دیتے اور اس طرح سماجی عدل وانصاف اور سماجی ترقی کے راستے دکھاتے ہیں۔

کرشن چندر کے ناولوں کے مطالعے سے ہم بخوبی محسوس کر سکتے ہیں کہ کرشن چندر کے ہاں ہر انسان کی زندگی مقدس ہے چاہے وہ مرد ہو کہ عورت بالخصوص عورت کی زندگی تقدس ان کی نظر میں مقدم ہے اس لئے کہ عورت چاہے ماں ہو کہ بہن بیٹی ہو کہ محبوبہ اپنے ہر روپ میں مجسم زندگی ہوتی ہے اسی لئے ان کے ناولوں کے نسوانی کردار ہر آن تغیر پذیر زندگی کے داعی اور نقیب ہوتے ہیں۔ کئی جگہ ان کے کرداروں کے درمیان قدیم اور جدید قدروں کے تصادم ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں انہیں روشنی ملتی ہے اور اس روشنی سے قاری متاثر ہو پاتے ہیں چنانچہ اردو ادب میں نذیر احمد اور پریم چندر نے جس کام کی ابتداء کی تھی اس کو آگے بڑھانے اور آئندہ نسلوں کو راستہ دکھانے میں کرشن چندر نے نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔

## نذر سجاد حیدر کے نسوانی کرداروں کے مسائل

اردو ناول نگاروں میں نذر سجاد حیدر خصوصی اہمیت رکھتی ہیں انہوں نے کئی ناول لکھے۔ جن میں اختر النساء بیگم، جانباز، آہ مظلوماں، ثریا، نجمہ اور حرماں نصیب خاص طور پا قابل ذکر ہیں۔ نذر سجاد حیدر نے حرماں نصیب اپنے معاشرے کے خانگی زندگی میں پنپنے والے مسائل اور سماجی روایات کو جس خوبی سے اجاگر کیا ہے وہ یقیناً اس معاشرتی زندگی کی آئینہ دار ہیں قرأۃ العین حیدر نے ان کے متعلق لکھا ہے:

> ''امی نے چودہ سال کی عمر میں ایک نہایت ترقی پسند اور
> اصلاحی ناول لکھا جس کی ہیروئن'' اختر النساء بیگم'' نے

مردوں کے معاشرے کے مظالم کا نہایت عقل مندی سے
مقابلہ کیا اور آخر میں فتح مند ہوئی۔۔۔ان کے یہ سارے
ناول ان کے طبقے کے اس پس منظر کی بہت عمدہ عکاسی
کرتے ہیں، جس نے پچھلی صدی کے آخر میں اور صدی
کے شروع میں یورپین تہذیب اختیار کرنی شروع کردی
تھی۔لڑکیاں پردے میں تھیں لیکن یوروپیئن نرسیس انہیں
انگریزی پڑھائی اور پیانو بجانا سکھاتی تھیں‘‘۔37

’’اختر النساء بیگم‘‘ ان کا پہلا ناول ہے۔اس میں مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کی تصویریں سامنے آتی ہیں۔توہم پرستی، جہالت اور بے بنیاد رسم و رواج جیسے کے غلط نظریوں کو پیش کیا گیا ہے۔ساتھ ہی عورتوں کی تعلیم و تربیت کی افادیت اور ضرورت کو واضح کیا گیا ہے۔اس ناول کا مرکزی کردار ’’اختر النساء بیگم‘‘ ہے جو تعلیم یافتہ، شریف، باحیا، دور اندیش اور قوم پرست ہونے کے علاوہ وہ تعلیم نسواں کے فروغ میں نہ صرف حصہ لیتی ہے بلکہ ملک و قوم کی خدمت بھی انجام دیتی ہیں اور اسے زندگی کی پرخار وادی میں ظلم و ستم اور مخالفتوں سے نبرد آزمائی بھی کرنی پڑتی ہے۔جب وہ گھر سے نکال دی جاتی ہے تو اپنی مرضی کی زندگی بسر کرنے کے لیے جدوجہد شروع کردیتی ہے۔اپنی دنیا خود بناتی ہے۔اس کا اسکول انسپکٹر کی حیثیت سے ملازمت کرنا اس عہد کے لیے ایک نئی بات تھی اس اعتبار سے اختر النساء ترقی پسند اور روشن خیال ہونے کا پورا ثبوت دیتی ہے۔

’’آہ مظلوماں‘‘ نذر سجاد حیدر کا مشہور ناول ہے اس ناول میں دو طبقوں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرنے پر جس طرح قسم غلط نتائج برآمد ہوتے ہیں نذر سجاد حیدر نے اس کی طرف نشان دہی کی ہے۔اس طرح کی شادیاں نہ صرف نچلے طبقے کے لیے وبال جان ثابت ہوتی ہیں بلکہ اعلیٰ طبقے میں بھی یہ بیماری عام تھی۔سماج میں اس طرح کی برائیوں کو رواج دینے میں صرف مرد آگے نہیں تھے بلکہ

عورتیں بھی اس میں برابر کی شریک ہوتی ہیں۔مصنفہ نے ان سماجی برائیوں اور غلط رسوم کے خلاف اس ناول میں صدائے احتجاج بلند کیا ہے۔

اس طرح نذر سجاد حیدر کے ناولوں کے موضوعات ایک عام زندگی کے مسائل کو پیش کرنے ہیں۔ان کے ناولوں میں رومانوی عناصر بھرپور انداز میں ملتے ہیں۔چوں کہ رومانوی فضاء اور ماحول اس عہد کا مزاج بن گئے تھے۔جہاں انہوں نے ایک خالص مشرقی اقدار کے مستحکم عناصر کو تلاش کرنے کی سعی کی ہے تو دوسری طرف مغربی تہذیب اور تعلیم کی خوبیوں کا برملا اظہار بھی کیا ہے اور اپنے بیشتر ناولوں میں ہندوستان کی سماجی فضا میں سانس لینے والی عورتوں کی مظلومیت اور بے چارگی کو واضح انداز میں پیش کیا ہے۔مولانا رازق الخیری نے نذر سجاد حیدر کے متعلق لکھا ہے:

> ''اگر یہ بحث چھڑے کہ خود عورتوں میں کس نے سب سے پہلے اپنی جنس کی مظلومیت اور بے چارگی پر آنسو بہائے اور ان کے شرعی حقوق کے حصول کی انتھک کوشش کیں،عظیم المرتبت بلند پایہ لکھنے والیوں میں اردو کی کون سی مصنفہ ہے۔جس کی ساٹھ برس کی تحریروں میں کتنا ہی تلاش کی جائے مشرقی شرافت کے خلاف کوئی ایسا لفظ نکلے گا جس سے نسوانی وقار مجروح ہو تو ان سوالوں کے جواب میں صرف ایک نام لیا جائے گا''۔38؎

عورتوں کی مجبوری، لاچاری اور بے بسی کو دیکھ کر خود خواتین میں بیداری شعور اور اصلاح پسندی کے جذبات ابھرنے لگے تھے۔یہ مغربی تعلیم کا بھی اثر تھا کہ عورتیں اپنی انجمادی، کیفیات کو متحرک بنانے کے تئیں سنجیدہ ہوگئیں اور اپنی روایتی زندگی سے ہٹ کر نئی چیزوں کو اپنانے میں غور وفکر سے کام لیا اور اپنی پسند کی زندگی

گذارنے کے لیے میدان میں آئیں۔ جلسوں، سیاسی کاموں اورتحریک کا آغاز کر کے جد جہد کی بھیڑ میں شامل ہوگئیں۔اس کے علاوہ خواتین کے ناولوں میں مشرق اورمغرب کےتہذیبی اورتعلیمی ٹکراؤ سے ایک نئے نظام زندگی کی تصویریں نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔ دوسری طرف ان کے بیشتر ناولوں کا پس منظر مسلمانوں کی وہ معاشرتی زندگی ہے۔ جہاں جاگیرداری نظام کی گرفت رفتہ رفتہ ڈھیلی پڑنے لگی ہے باوجود دولت مند طبقہ نہ صرف جاگیرداری نظام کو برقرار رکھنے کا خواہش مند ہے بلکہ اپنی تہذیبی وراثت کی بےشمار غلط رسموں کا حمایتی اورنگہبان بھی نظر آتا ہے۔نوابوں، رئیسوں اورامیروں کی زندگی کی شکست وریخت کےتمام واقعات اور طبقاتی نظام کامکمل عکس اس عہد کی خواتین کے ناولوں میں ظاہر ہوا ہے۔اس معاملے میں خواتین ناول نگار مردوں سے بہر حال ممتاز نظر آتی ہیں کیونکہ انھیں خواتین کے مسائل کوقریب سے مشاہدہ کرنے کا اچھا موقع بھی ملتاہےاس اعتبار سے انہوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اس زمانے کاعکس اپنے ناولوں میں اتارا ہے۔ نذرسجادحیدرتعلیم نسواں کی کٹر حامی تھیں۔وہ عورتوں کے سماجی ومعاشرتی مسائل جیسے بیوگی،شوہر کی بے وفائی، معاشی بدحالی، نامساوی حالات میں علم حاصل کرنے اور ملازمت اختیارکرنے کی صلاح دیتی ہیں ان کے پہلے ناول ''اخترالنساءبیگم'' کےاختتام پروہ لکھتی ہیں:

''اخترالنساءصرف نام ہی کواخترالنساء نہ تھی بلکہ دراصل اختر نسوانی ہند ثابت ہوئی۔ یہ ہےتعلیم نسواں کا نتیجہ۔اختر النساء نے کیا کیا دقتیں برداشت کیں۔کیسی کیسی مصیبتیں اٹھائیں اورکس بےبس وبےکس حالت میں ہندوستانی رسم ورواج کا لحاظ رکھ کرکس کوشش ومحنت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اوراس سےخود فائدہ بھی اٹھایا۔معزز سرکاری ملازمت ترک کرکےقومی خدمات کے لئے اپنی زندگی وقف کردی

اورنہایت قدر ومنزلت کی حالت میں عمر بیوگی بسر کی'' ۔39

## عصمت چغتائی کے نسوانی کرداروں کے مسائل

عصمت چغتائی ترقی پسند مصنفین میں اہم مقام رکھتی ہیں ۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز غیر منقسم ہندوستان کے انقلابی دور سے ہوتا ہے عصمت چغتائی نے ادب برائے زندگی کے علمبردار ترقی پسند برائے تحریک کے زیر اثر اپنے فن پاروں کو تخلیق کیا۔

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر حقیقت نگاری کو فروغ حاصل ہوا اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ بے جا پابندیوں اور رسم ورواج کی اندھی تقلید سے روکا گیا۔ علم نفسیات کی طرف ادیبوں کی توجہ مرکوز ہوئی جس سے کرداروں کے باطنی راز تک پہنچ کر اس کے احساسات کو گرفت میں لے کر اس کی اصلاح کی جانے لگی۔

عصمت چغتائی نے مسلم طبقہ کی پردہ نشین خواتین اور لڑکیوں کی نفسیاتی الجھنوں اور ان سے پیدا ہونے والے بیشتر مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا عصمت چغتائی مسلم معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں ، کمزوریوں اور خامیوں کو بے نقاب کرنا چاہتی تھیں انہوں نے اپنے ناولوں کے کرداروں کو حقیقی صورت میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

عصمت چغتائی کی پیشتر تخلیقات کا موضوع جنس رہا ہے۔ جس کو انہوں نے بڑی بے باکی اور جرأت مندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جنسی زندگی کی پیش کش میں اگر ایک طرف انہوں نے نفسیات سے فائدہ اٹھایا تو دوسری طرف متوسط طبقے کی جنسی بے راہ روی کا گہرا مطالعہ اور عمیق مشاہدہ بھی کیا ہے۔ عصمت چغتائی ایک انٹرویو میں کہتی ہیں:

''دوپہر کو محلے بھر کی عورتیں جمع ہو کر بیٹھ جاتی تھیں اور

ہم لڑکیوں سے کہا جاتا تھا ''چلو بھاگو تم لوگ'' میں چھپ
کے پلنگ کے نیچے گھس کے کہیں سے ان کی باتیں سن لیا
کرتی تھی، جنس کا موضوع گھٹے ہوئے ماحول اور پردے
میں رہنے والی بیویوں کے لئے بہت اہم ہیں۔ وہ اس پر
بہت بات چیت کیا کرتی ہیں''۔40؎

عصمت چغتائی نے اپنے ذاتی مشاہدات کو فنی چابکدستی کے ساتھ اپنی تخلیقات کو پیش کیا انہوں نے جنس کو اپنی تخلیقات کا موضوع صرف سماج کی اصلاح کی خاطر بنایا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ خواتین کی گھٹن و پریشانی کو محسوس کیا جا سکے اور ایک صحت مند خوشحال معاشرہ کی بنیاد رکھی جا سکے۔

عصمت چغتائی نے افسانوں کی بہ نسبت ناول بہت کم لکھے لیکن جتنے بھی ناول انہوں نے تحریر کئے ان میں عصر حاضر کے سماجی و معاشرتی مسائل کو پیش کیا۔ عصمت چغتائی کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے پنڈت کشن پرساد کول نے اپنی کتاب ''نیا ادب'' میں لکھا ہے:

''انہوں نے زندگی کی حقیقتوں کو باہر کی کتابوں میں نہیں
پڑھا بلکہ اپنے گھروں اور سوسائٹی میں بہت قریب سے
دیکھا ہے صرف دیکھا ہی نہیں بلکہ نفس کی گہرائیوں میں
محسوس کیا ہے غور وفکر سے اسے جز و دماغ بنالیا ہے جو کچھ
دیکھا اور سمجھا نہیں اس پر انہیں یقین ہے اور جو کچھ یقین
کرتی ہیں اس کو بے ساختہ کہہ دیتی ہیں تکلف نہیں اس لئے
وہ اپنی بصیرت کی بے باک اور صداقت شعار ترجمان ہیں
اور اس ترجمانی کا ان کو کمال کا سلیقہ ہے ہماری گھریلو زندگی

کی جہاں جہاں انہوں نے تصویریں کھینچی ہیں پڑھنے والے کومعلوم ہوتا ہے کہ نقاش ماڈل سامنے رکھے ہوئے چربہ اتار رہا ہے۔شاید وہ وہی لکھ رہی ہیں جوانہوں نے گھر میں دیکھا ہے یاان پر جوخود بیتی ہے زندگی کی یہ حقیقتیں خواہ کیسی ہی مکروہ اور دل دکھانے والی ہوں چونکہ سچی ہیں۔ تصویریں جیتی جاگتی اور دیدہ زیب ہوتی ہیں۔قدرتی طور سے دیکھنے اور پڑھنے والا اثر قبول کرتا ہے۔مختصراً وہ آرٹسٹ ہیں۔ نہ صرف حسن کار ہیں بلکہ مبصر بھی اور نئی زندگی اور نئے ادب کی ترجمان بھی''۔41

ان کے ناولوں میں ''ضدی''، ''ٹیڑی لکیر''، ''معصومہ''، ''سودائی''، ''عجیب آدمی''، ''دل کی دنیا'' اور''ایک قطرہ خون'' شامل ہیں۔ان کے تمام ناول سوائے ایک قطرہ خون کے معاشرتی ناول ہیں۔''ایک قطرہ خون'' ناول تاریخی سانحہ کربلا کے واقعات پرمبنی ہے۔

ناول ضدی عصمت چغتائی کا پہلا ناولٹ ہے یہ معاشرتی ناولٹ ہے جوکہ ایک نوکرانی آشااور جاگیر دار گھرانے کے لڑکے پورن کی محبت کی کہانی ہے۔آشا گاؤں کی غریب لڑکی ہے جس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے، اسی طرح کی دوسری لڑکی چمکی ہے لیکن مصنفہ نے دونوں کوایک ہی طبقہ سے لے کر دونوں کے اخلاقی کردار کا فرق بیان کیا ہے چمکی شوخ وچنچل لڑکی ہے لیکن آشا معصوم بھولی بھالی با اخلاق ہے اس ناول میں پورن کی بھابھی اور پورن کی بیوی شانتا کا کردار گھریلو شوہر پرست عورت کا ہے۔کردار نگاری کے اعتبار سے یہ ایک بہترین ناولٹ ہے لیکن عصمت چغتائی پر نقادوں کی یہ تنقید ہے کہ یہ ناول ترکی ناولٹ کی کہانی ہے۔اس ناولٹ کے بعد عصمت چغتائی نے ایک ضخیم ناول ''ٹیڑھی لکیر'' لکھ کرادبی حلقہ کو چونکا دیا۔ یہ ناول نفسیاتی انداز

کا حامل ہے۔اس ناول کے نفسیاتی رجحان کے متعلق وقار عظیم نے اس طرح محاکمہ کیا ہے:

''ٹیڑھی لکیر کی بنیاد اس نفسیاتی حقیقت پر ہے کہ انسان کا ماحول اس کی سیرت اور شخصیت کی تشکیل میں سب سے بڑا حصہ لیتا ہے اور سیرت کی تعمیر اس کے ظاہر و باطن کا دوسرا نام ہے''۔42

ناول ''ٹیڑھی لکیر'' میں ایک لڑکی کی پیدائش سے لے کر ماں بننے تک کے اُتار چڑھاؤ اور نئی نسل میں پیدا شدہ الجھنوں کو بے نقاب کیا ہے ناول کا مرکزی کردار شمن ہے باقی تمام کردار شمن کی شخصیت کی تکمیل کی خاطر لائے گئے ہیں۔اس کے ماں باپ بھائی بہن، انا، استانیاں، اسکول کی لڑکیاں، کالج کے ساتھی اور اس کی عزیز سہیلیاں سب اس کی فطرت کے کسی نہ کسی پہلو کو ابھارتے ہیں۔شمن بڑے خاندان یعنی کئی بچوں والے خاندان میں پیدا ہونے کی وجہ سے والدین کی عدم توجہی کا شکار ہوتی ہے جذبۂ محبت کی عدم تسکین جہاں اس میں احساس کمتری پیدا کرتی ہے وہیں وہ گوشۂ عاطفت کی متلاشی بھی ہے ماں کی محبت کو وہ انا میں ڈھونڈھتی ہے لیکن اس محبت کو انا اور اس کے معاشقے کے نفسیاتی نکتہ نظر سے پیچیدہ بنا دیتے ہیں انا سے جب وہ محروم ہو جاتی ہے تو وہ دوسرا سہارا ڈھونڈتی ہے۔منجھو بی شمن کی منجھلی بہن شمن کو انا کی صورت میں ملتی ہے شمن منجھو کو ہی اپنی ماں سمجھتی اور انا کی طرح منجھو پر وہ صرف اسی کا حق سمجھتی ہے کیونکہ شمن کی ماں گھر کے دوسرے کاموں میں اتنی مصروف رہتی تھیں کہ وہ شمن کو پہلے انا کے حوالے اور اب منجو کے پاس دیکھ کر مطمئن تھیں۔عصمت چغتائی نے کئی بچوں کے خاندان میں عمر کے فرق اور اس کی نفسیات کو اس ناول میں شمن کی ماں اور بڑی بہن کی صورت میں لکھا ہے شمن کی ماں کو ایک طرف بیٹوں کے سسرال اور شادی بیاہ کے رسوم نبھانے ہیں تو دوسری طرف نسل بڑھانے کا ذریعہ۔اسی لیے وہ اپنے بچوں کی ڈھنگ سے پرورش نہیں کر پاتی۔شمن اپنی ماں

کے متعلق کہتی ہے:

''وہ خودتو اماں کی بچی تھی نہیں، اس کی بدمعاش انا کے

جانے کے بعد سے منجھو ہی اس کی ماں تھی''۔43

منجھو کے سہارے شمن ماں کی ممتا ڈھونڈھتی ہے۔لیکن یہ سہارا بھی زیادہ دنوں تک ساتھ نہ دے سکا منجھو بیاہ کر سسرال چلی جاتی ہے اس حادثہ کے بعد شمن کے اندر محبت سے محرومی اور تنہائی کا احساس شدید ہوجاتا ہے اس کی نفسیات میں تخریبی عناصر سر اُبھارنے لگتے ہیں اسی درمیان اس کی بڑی بہن بیوہ ہوکر اپنی بچی نوری کے ساتھ میکے آجاتی ہے بڑی آپا اپنی بیٹی نوری کے لئے شمن کو درس وعبرت کے طور پا استعمال کرتی ہے اس طرح ناول کا ہر کردار شمن کے ذریعہ قاری کو ایک الگ پہچان دکھاتے ہیں ناول ٹیڑی لکیر میں نسوانی کرداروں کی ایک بڑی دنیا آباد ہے ان میں شمن کے والدین اور بہنوں کے علاوہ انا، نوری، مس چرن، رسول فاطمہ، سعادت نجمہ بلقیس، پریما، ایلیما اور افتخار کی بیوی شامل ہیں۔

شمن کی ابتدائی تعلیم کے بعد مسلم گرلز اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں داخل کروادیا جاتا ہے اسکول میں پہنچ کر شمن کی ملاقات اسکول ٹیچر مس چرن سے ہوتی ہے پہلے تو وہ مس چرن کو پریشان کرتی ہے پھر جب مس چرن شمن پر مہربان ہوتی ہے تو وہ ہر وقت مس چرن کا نام لینے لگتی ہے۔مس چرن سیاہ فام تھیں لیکن شمن کو وہ دنیا کی حسین عورت لگتی وہ رات میں نیند سے اُٹھ کر مس چرن کے کمرہ تک پہنچ جاتی۔جس کی وجہ سے مس چرن کو لڑکیوں کے اخلاق خراب کرنے کے جرم میں اسکول سے نکال دیا جاتا ہے شمن اس اسکول میں فیل ہو جاتی ہے، اس کے بعد پہلے تو اس کو مشن اسکول میں داخلہ دلایا جاتا ہےپھر جلد ہی مسلم درسگاہ میں داخلہ دلا جاتا ہے یہاں پر وہ رسول فاطمہ، سعادت اور نجمہ سے سابقہ پڑتا ہے۔مصنفہ نے ان لڑکیوں کے ذریعہ دور جدید میں سر ابھارنے والے فتنہ ہم جنسی رومان کو تحریر کیا ہے، لیکن مصنفہ نے شمن کو جلد ہی، بلقیس کے ذریعہ صحیح راہ

دکھائی، شمن کی زندگی میں رشید اعجاز افتخار پریما کے والد رائے صاحب آتے ہیں لیکن شمن ان میں سے کسی کو بھی اپنا نہیں سکتی۔ زندگی کے اس تشکیلی دور میں کئی لوگ اس کی زندگی میں داخل ہوتے ہیں جن کی طرف وہ محبت کی خاطر قدم تو بڑھاتی ہے لیکن اس کے احساس کے آئینے پر دھندلی تصویریں چھوڑ کر گم ہو جاتے ہیں اور شمن پھر تنہا رہ جاتی ہے اس تنہائی کو دور کرنے کے لئے وہ کئی بچوں کو گود لیتی ہے لیکن پھر بھی وہ مطمئن نہیں رہتی اسی دوران اس کی ملاقات ایما سے ہوتی ہے۔ ایما نئی تہذیب نئے ماحول کی پروردہ ایک باغی لڑکی ہے، ایلما کے ذریعہ اس کی ملاقات آئرش نوجوان روفی ٹیلر سے ہوتی ہے روفی ٹیلر سے دوستی آخر شادی کی صورت اختیار کرتی ہے لیکن ہندوستانیوں کی انگریزوں سے نفرت اور تنگ نظری ان دونوں کی ازدواجی زندگی میں تلخیاں پیدا کردیتی ہیں بالآخر تلخی اس قدر بڑھتی ہے کہ ٹیلر شمن کو تنہا چھوڑ کر محاذ جنگ پر چلا جاتا ہے شمن کو پھر ایک بار تنہائی ڈسنے لگتی ہے۔ انہیں دنوں اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ ماں بننے والی ہے تب اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی تنہائی ختم ہوگئی اور سارے جہاں کی دولت محبت اس کے دامن میں سمٹ آئی۔

الغرض مصنفہ نے ایک لڑکی کی پیدائش سے اس کے ماں بننے تک جن محرومیوں کا ذکر کیا اسی موڑ پر لاکر اس کے مرض کا مداوا بھی کیا۔

عصمت چغتائی کا ناول 'معصومہ' بھی 'ٹیڑھی لکیر' کی طرح ایک لڑکی پر مرکوز ناول ہے۔ اس ناول میں 'معصومہ' کے کردار کو لے کر ناول نگار نے ممبئی کی اعلیٰ سوسائٹی فلم انڈسٹری، امیروں کے کاروبار، سیاست کے انداز و طریقہ کار کی تصویر پیش کی ہے، وہ خود ایک انٹرویو میں کہتی ہیں:

''یہاں (ممبئی) آنے کے بعد کمیونسٹ پارٹی سے میرا
واسطہ پڑا اور مجھے سیاست اور اکونومکس کا بھی تجربہ ہوا۔ پتہ
چلا کہ سیکس اور اس کی گھٹن ہی اتنا اہم موضوع نہیں ہے بلکہ

بہت سے اور موضوع ہیں ۔ پھر میں نے ان موضوعات کو

چھونے کی کوشش کی ممبئی کے ماحول کو پیش کیا میری ایک

ناول 'معصومہ' ممبئی کے ماحول پر لکھی گئی ہے'' ۔44

ناول معصومہ میں چند ہی نسوانی کردار ملتے ہیں ان میں معصومہ کی والدہ دونوں چھوٹی بہنیں زبیدہ ، حلیمہ ہیں ۔مصنفہ نے ممبئی کے حالات پیش کرنے کے لئے معصومہ کے کردار کا سہارا لیا ہے۔

معصومہ ایک سیدھی سادھی فوجی کی بیٹی ہے جو حیدرآباد میں رئیسانہ زندگی گزارتی ہے۔حیدرآباد میں پولس ایکشن کے وقت معصومہ کے والد اس کے تین بڑے لڑکوں کو لے کر پاکستان چلے جاتے ہیں تاکہ وہاں پر جم جائیں تو بچوں اور بیگم کو بلا لیں ۔لیکن وہ انہیں بے یارو مددگار چھوڑ کر اپنی دنیا میں مگن ہو جاتے ہیں ۔معصومہ کی ماں رئیسانہ زندگی کی عادی تھیں وہ محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کے گزر بسر کا انتظام نہیں کر سکیں اور ممبئی چلی جاتی ہیں یہاں انہیں ایک شناسا احسان صاحب اپنے گھر میں پناہ دیتے ہیں لیکن جب ان کی بیوی ناک بھوں چڑھاتی ہے تو وہ ایک کرائے کے گھر میں منتقل ہو جاتے ہیں ۔ بڑھتے ہوئے خرچ اور نوابی مزاج کے تقاضے نے معصومہ کی ماں کو حالات سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے اور وہ اپنی بیٹی کو احمد بھائی کے ہاتھوں میں دیتی ہے۔معصومہ آخر کار نیلوفر کے نام سے سیٹھوں سرمایہ داروں کے ہاتھوں کھلونا بن جاتی ہے۔

معصومہ فطری طور پر معصوم ہے اس کو رہ رہ کر اپنا ماضی یاد آتا ہے وہ ہمیشہ اپنے آپ کو عام لڑکیوں والے خواب جیسے سہیلیوں کی خوش گپیاں ، بہن کی ہمدردی شوہر کی ناز برادری بیوی کا تصور، باعزت زندگی گزارنے کا خواب دیکھتی ہے جو خواب ہی رہتا ہے وہ اکیلی گھر کی پالنہار ہے وہ سماج کی رکن ہے لیکن وہ اپنی زندگی کو سنوار نہیں سکتی ۔ وہ نشے کی عادی ہو جاتی ہے اور اپنا تمام دکھ درد نشے کے ذریعہ ختم کرنا چاہتی ہے۔ معصومہ ایک وقت معصومہ سے نیلوفر اور پھر معصوم بانو بن گئی اور آخر کار ممبئی کے سرمایہ داروں کئے ہاتھوں کٹھ پتلی

بن جاتی ہے۔

سودائی (1964) عصمت چغتائی کا ناول ہے اس ناول میں عصمت چغتائی نے سورج کو یتیم یسیر مظلوم لڑکے کے طور پر پیش کیا ہے سورج کو گھر میں دیوتا کا درجہ دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ فطری تقاضوں کو بچپن سے ہی پورا نہیں کر پاتا مصنفہ نے سورج کے ساتھ ساتھ عورتوں کے درمیان رقابت کو چاندنی اور اوشا کے ذریعہ دکھایا ہے۔

ناول عجیب آدمی میں عصمت چغتائی نے فلمی دنیا کے اسٹار کی زندگی کو پیش کیا ہے اس ناول میں دھرم دیو کی بیوی منگلا، ہیروئین زرینہ اور طوائف پدما کی زندگی کے حالات و واقعات فلم انڈسٹری کا اتار چڑھاؤ خاندانی رنجشوں کو تحریر کیا۔

''دل کی دنیا''عصمت چغتائی کا سماجی ناولٹ ہے اس ناول میں عصمت چغتائی نے شوہر کی بے وفائی کی شکار قدسیہ کے ذریعہ سماج میں پھیلے بے جا رسومات روایت پرستی کو آشکار کیا ہے قدسیہ کی شادی پندرہ سال میں کر دی گئی شادی کے بعد میاں انگلینڈ گئے اور ایک میم کو ساتھ لے آئے قدسیہ صرف نام کی بیوی رہ گئی ۔لیکن وہ شبیر حسین کے ساتھ نئی زندگی گزارنے کی ٹھان لیتی ہے وہ ساری بندشوں کو توڑ کر اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کی ٹھان لیتی ہے۔

عصمت چغتائی کے ناولوں کے نسوانی کردار حقیقی زندگی میں چیدہ چیدہ پائے جانے والے کردار ہیں۔انہوں نے اردو ادب کو اس گوشہ سے روشناس کیا جہاں پر کسی کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔انہوں نے دمکتے چہروں تلے سلگتے نفسیاتی رجحانات کو کھولا ہے ان کے ناولوں پر نسوانی کردار فطرت سے ہم آہنگ ہونا چاہتا ہے۔

## قرۃالعین حیدر کے نسوانی کرداروں کے مسائل

خواتین ناول نگاروں میں قرأۃ العین حیدر نے کردار نگاری کی سطح پر روایت سے انحراف کرتے ہوئے نئے تجربے کیے اور جدید تکنیک کو بروئے کار لا کر اردو ادب میں کردار نگاری کو نئی سمت عطا کی۔ انہوں نے اپنے اکثر ناولوں میں لاشعور کی رو او فلیش بیک کی تکنیک کو استعمال کیا۔ اس سے ان کے کردار بھی اس جدید تکنیک کے سانچے میں ڈھل کر ابھرتے ہیں اور اپنی سوچ وفکر کے ذریعہ اپنی ساخت قائم کرتے ہیں۔ قرأۃ العین حیدر کے کردار جس ماحول اور معاشرے میں سانس لیتے ہیں اس سے اس عہد کی روح، اس عہد کے انسان کا دکھ سکھ، آرزو، تمنا، شادمانی اور محرومی سبھی کا عکس ان کے ناولوں کے کرداروں میں موجود ہے۔

''میرے بھی صنم خانے'' ان کا پہلا ناول ہے۔ جس میں ناول نگار نے اپنے کرداروں کے اندرون ذات میں جھانکنے کی کوشش کی ہے اور واقعات بیانیہ اور محاکمات کے بجائے کرداروں پر زیادہ توجہ دیا ہے۔ یہ ناول اودھ کے زوال پذیر جاگیردارانہ معاشرت کی نمائندگی کرتا ہے اور جس میں اس معاشرت کی نئی نسل سے تعلق رکھنے والے کرداروں کی ایک وسیع دنیا آباد ہے۔

وقار عظیم نے قرأۃ العین حیدر کی ناول نگاری کا تجزیہ کچھ اس طرح کیا ہے:

> '' قرأۃ العین حیدر کے ناول رومانی تخیل، نفسیاتی اور فلسفیانہ فکر، پرخلوص مشاہدے اور فن کے نئے تجربات کا ایسا امتزاج ہیں جس میں ناول اپنی جدید ترین فنی ہیئت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہاں حقیقت پسندی آہستہ آہستہ ماورائے حقیقت کی طرف قدم بڑھائی نظر آتی ہے''۔45

ناول کا مرکزی نسوانی کردار 'رخشندہ' اپنے سماج کی نئی نسل کی ترجمان بن کر ابھرتی ہے۔ وہ روشن خیال ترقی پسند اور باشعور کردار ہے۔ رخشندہ کے عزیز و اقارب اور اس طبقے سے تعلق رکھتے والے اس کے

دوست واحباب پی پوکنتی، کرسٹابل، سلیم، قمر آراء، انور اعظم زینت، ڈائمنڈ اور شہلا وغیرہ کے کرداروں سے ناول کا پلاٹ تیار کیا گیا ہے۔ ناول کے یہ سبھی کردار مختلف فکروں میں گھرے ہوئے نظر آتے ہیں ان خیالات کی تصویر کشی قرۃ العین حیدر گہرے انداز میں کرتی ہیں اور کم وبیش سبھی کے خیالات ونظریات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ جس کو با آسانی ایک ہی سوچ قرار دے سکتے ہیں یہ کردار اپنے عہد کے مسائل سے الجھتے ہیں اور اس مسائل کے نتیجے میں ذہنی کرب اور نفساتی زندگی خوش آئندہ تبدیلیاں لانے کی رومانی امنگ ہے۔ اور عہد شباب کا لا ابالی پن بھی۔ تقسیم وطن کا واقعہ ان کی زندگی میں ایک تباہ کن حادثہ بن کر آتا ہے۔ جس سے ان کی دنیا ان کے خواب ان کی آرزوئیں سب ریت کی دیوار کی طرح گر جاتی ہیں۔ سارے کردار بکھر جاتے ء ہیں۔ ان کی محفلیں، کلب، رقص گاہیں ریڈیو اسٹیشن، ڈرامے اور تفریح گاہیں سب کچھ ویرانی کی نذر ہو جاتی ہیں۔ اور تقریباً سارے کردار مایوسی کی فضاء میں ڈوب جاتے ہیں۔

رخشندہ اس ناول کا مرکزی کردار ہے جس کے گرد پوری کہانی گھومتی ہے اس کے ذہن کی تنہائیاں مایوسیاں، محرومیاں بعض جگہ بے حد متاثر کرتی ہیں۔ ناول نگار نے اس اہم نسوانی کردار کے ذریعہ تقسیم ہند کے المیے کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ جسے وہ عظیم انسانی ٹریجڈی کے نام سے یاد کرتی ہیں۔ رخشندہ بے حد جذباتی اور تعلیم یافتہ خاتون ہے۔ جب ملک تقسیم کے عمل سے دوچار ہوتا ہے اور چاروں طرف فسادات پھوٹ پڑتے ہیں تو وہ ان تمام حالات سے حدر درجہ متاثر ہوتی ہے اور یہیں سے ناول میں ٹریجڈی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ فسادات اور قتل و غارت گری کے خونی ماحول سے سارے کردار بکھر جاتے ہیں۔ رخشندہ بھی اکیلی ہو جاتی ہے۔ جہاں اس کا کوئی رفیق نہیں، کوئی مونس وغم خوار نہیں چند دنوں کے حالات نے اسے یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔ جہاں کبھی زندگی کی توانائیاں اور حرارت تھی۔ وہاں اب صرف ویرانی ہی ویرانی ہے۔ وہ خود اجنبیت کے احساس سے دوچار ہے۔ بے بسی، محرومی اور بدلتے ہوئے حالات کا المیہ رخشندہ کے کردار کی صورت میں ابھر

کر سامنے آتا ہے۔قرۃ العین حیدر نے ایک آدرش زندگی کو پروان چڑھتے اور پھر اسے دردناک انداز میں مٹتے ہوئے دکھایا ہے۔جس کی وجہ سے اس ناول کی پوری کہانی داستان غم بن گئی ہے:

''ممتاز شیریں نے رخشندہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیوں کیا ہے۔وہ ایک بت معلوم ہوتی ہے۔ جسے قرۃ العین حیدر نے تراشا ہے۔ پرستش کی ہے اور پھر توڑ دیا ہے۔46ؔ

ان تمام باتوں کے باوجود قرۃ العین حیدر نے اس کردار کے ذریعہ ذہنی جلاوطن کی مختلف کیفیات کو نہ صرف مؤثر ڈھنگ سے نمایاں کیا ہے بلکہ انہوں نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو وہ کہنا چاہتی ہیں۔

مقبول حسن خاں نے رخشندہ کی ان کے تمام کرداروں میں کلیدی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے وہ کہتے ہیں:

رخشندہ قرالعین حیدر کے ناولوں میں بار بار آنے والا کردار ہے اور ہمیشہ ایک مبہم لیکن واقعی نفسیاتی وقار کا حامل''۔47ؔ

اس ناول میں کردارنگاری زیادہ تر ترقی پسندانہ انداز میں کی گئی ہے،جس سے کرداروں کی اپنی اپنی شناخت قائم ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے نقوش سماج پر گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں اوران کے خدوخال بھی نمایاں ہوکر سامنے آتے ہیں:

''سفینۂ غم دل'' قرۃ العین حیدر کا دوسرا ناول ہے جو 1953ء میں شائع ہوا۔موضوع کے اعتبار سے ''میرے بھی صنم خانے'' اور'' سفینۂ غم دل'' دونوں ناول یکساں کردار رکھتے ہیں اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ ناول پہلے ناول کی توسیع ہے۔زبان و بیان ، کردار اور واقعات کے لحاظ سے دونوں ناولوں میں فرق کرنا قدرے مشکل ہوجاتا ہے۔البتہ انہوں نے ''سفینۂ غم دل'' جگہ جگہ سوانحی مواد کا آزادانہ استعمال کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اپنے والد سجاد حیدر یلدرم کو کمال خوبی سے افسانوی کردار بنا کر پیش کیا ہے۔ جس سے باپ بیٹی کا رشتہ نہ صرف جذباتی انداز میں نمایاں ہوا ہے بلکہ قرۃ العین حیدر کا لہجہ بھی رقت انگیز حد تک جذباتی ہو گیا ہے۔ یلدرم کی وفات کو انھوں نے نہایت ہی مؤثر طریقے سے پیش کیا ہے، اس سلسلے میں بخاری کہتے ہیں:

> ''فعل دوم کے آخر دو بابوں میں مصنفہ نے اپنے ابا
> جان کا جو نثری مرثیہ لکھا ہے، وہ نہایت مؤثر اور نہایت
> معلومات افزا ہے''۔48

کردار نگاری کی سطح پر ''سفینۂ غم دل'' بہت ہی کامیاب اور اچھوتا ناول نہیں ہے اس ناول کے نسوانی کرداروں میں میرا، سئینلا، نادرہ، لیلیٰ اور پدما وغیرہ سبھی ایک ہی وضع قطع کی خواتین معلوم ہوتی ہیں۔ جن میں کوئی خاص انفرادیت نظر نہیں آتی۔ ان کے دوسرے کرداروں کا بھی یہی حال ہے۔ کرداروں کے خیالات میں نہ کوئی انوکھا پن ہے اور نہ ہی ان کی داخلی خود کلامی کے اجزا میں کوئی خاص دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے۔ بلکہ سائے کی طرح قصے میں نظر آتے ہیں ایلمہ ایسٹن، فواد علی، میرانلنی، عالیہ ارون راج ونش اور ریاض الدین کردار اپنے مزاج اور طرز گفتگو علمیت اور نرم روی کے اعتبار سے ایک دوسرے کا چربہ نظر آتے ہیں، باطنی سطح پر ان کی زندگی بے جان اور غیر دلچسپ ہے۔ چونکہ خوشحالی نے ان کی زندگی کے تقریباً ہر مسئلے کو حل کر دیا ہے۔ تقسیم سے قبل ہندو مسلم ایک دوسرے کے تہواروں میں شریک ہوتے تھے، خوشیاں اور دکھ درد بانٹتے تھے اور اپنے آپ کو یہ لوگ ہندوستان کی پرانی مشترکہ تہذین کے نمائندہ مانتے تھے۔ لیکن تقسیم ہند کےء بعد زندگی اچانک تبدیلی ہو جاتی ہے، جاگیرداری نظام کا زوال، ہندو مسلم بھائی چارے کا انقطاع ہے سروسامانی کا سانحہ اور ذرائع آمدنی کا خاتمہ، یہ تمام عوامل ایسے تھے جو ان کی زندگی کا اہم حصہ بن چکے تھے اور حالات کا مقابلہ نہ کر

پانے کی صورت میں وہ لوگ اپنی زمین چھوڑ کر پاکستان جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اور اس طرح سفینۂ غم ،دل' کے سارے کردار ناول نگار کے ذہن کے ائیڈیل معلوم ہوتے ہیں، جن میں ذہانت کے عناصر موجود ناول کے منظر نامے پر ان کی ذہانت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ بیش تر مقامات پر خود مصنفہ کی ذہانت کا احساس ہوتا ہے۔ بقول ممتاز شیریں:

''قرأۃ العین حیدر کے یہاں عموماً ہلکے پھلکے تاثرات، تلازمہ خیالات اور آڑے آڑے فضائی جائزے کے مرکب ہوتے ہیں قرأۃ العین حیدر کے فنی ویژن کی کمزوری یہ ہے کہ خود بھی زندگی کے میک بلیوں کے عین تصور میں کھو جاتی ہیں اور اس رومانی گلیمورائزڈ (Glamourized) پر یقین رکھتی ہیں۔ وہ جس ویژن کی تخلیق کرتی ہیں اور ہم سے یہ توقع رکھتی ہیں کہ ان کے ویژن کو حقیقت مان لیں اس گلیمورائزڈ ویژن میں خواہ وہ طرز زندگی کا ہو یا کرداروں کا ان کے مجموعی عین تصور میں وہ خود بھی شدت سے یقین دلانے کی کوشش کرتی ہیں اور حقیقت میں ہمیں اس سے مختلف نظر آتی ہیں''۔49

بقول کے۔ کے کُھلّر کے:

''سفینۂ غم دل'' اردو میں اپنی طرز کا ایک منفرد ناول ہے ، جس میں کرداروں کے عمل اور زمانے کے تیزی سے بدلتے ہوئے رنگ و انداز میں ہر جگہ وقت کی کارفرمائی

دکھائی دیتی ہے''۔50؎

''آگ کا دریا'' اردو کا مقبول ترین ناولوں میں ایک ہے۔ یہ ناول ڈھائی ہزار برسوں پر محیط اور انتہائی الجھی ہوئی ہندوستانی تاریخ کے چار مختلف ادوار کو سمیٹتا ہے اور ہر دور سے متعلق چار مختلف کہانیوں کو ایک لڑی میں پرو کر اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی پوری تہذیب و ثقافت اپنے ارتقائی عمل سے گذر کر ایک مشترکہ تہذیبی اقدار کی تشکیل ہوتی ہیں اور تقسیم کے نتیجے میں عظیم انسانی ٹریجڈی سے گذر کر ان تہذیبی قدروں کو اپنے پیروں تلے روند کر تاریخ کے سفر پر آگے بڑھتی نظر آتی ہے۔ بقول وقار عظیم:

''رسمی مفہوم میں کہانی نہیں بلکہ کہانی سے زیادہ مزے دار ہے، وہ فلسفہ نہیں، لیکن فکر کی گہرائیوں سے بھر پور ہے وہ تاریخ نہیں لیکن اس کا ہر صفحہ تاریخی صداقت کے نور سے معمور ہے''۔51؎

آگ کا دریا کے کرداروں میں قرۃ العین حیدر کے سابقہ دونوں ناولوں کے مقابلے میں زیادہ وسعت اور تنوع موجود ہے۔ اس ناول میں انہوں نے کردار نگاری کی نئی تکنیک کا تجربہ بھی کیا ہے۔ اس کے زیادہ تر کردار علامتی حیثیت رکھتے ہیں اور نمائندہ و مرکزی کردار ہندوستانی تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف روپ لے کر آتے ہیں۔ لیکن کرداروں کی شخصی حیثیت میں کوئی نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوتی وہ جس دور میں جنم لیتے ہیں اس دور میں خود کو ڈھال لیتے ہیں اور اپنے عہد کی بھر پور ترجمانی کرتے ہیں ''چمپا'' اس ناول کا اہم نسوانی کردار ہے۔ اس کردار کے متعلق مصنفہ اس طرح تعارف کراتی ہیں:

چھایا پتھ پر اسپرائین ناچ رہی ہیں۔ مرگھٹ پر کالی رقصاں ہے۔ دل کے سنہرے ایوانوں میں شیو ناچتا ہے اور گوکل میں نٹور گرداری کیلاش پر اوما ناچتی ہے اور یہاں

راپتی کے کنارے مہوٹ کے جھرمٹ میں خزاں کے چاند
تلے وہ جاچ رہی ہے جسے کوئی چمپک کہتا ہے کوئی چمپا رانی
کوئی چمپاوت اس کے ہزاروں نام ہو سکتے ہیں کیونکہ اس
کے ان گنت روپ ہیں''۔52

چمپا کا کردار ناول کے ہر دور میں موجود ہے اور یہ چمپا نہ صرف علامتی پیکر ہے بلکہ ہر دور میں ہندوستانی عورت کی نمائندہ ہے جو ازلی اور ادبی پیاسی ہونے کے ساتھ ساتھ تیاگ اور قربانی اس کا مقدر بن چکی ہے۔ چمپک سے لے کر چمپا احمد تک وہ مختلف روپ اختیار کرتی ہے۔ کبھی ہندو کبھی مسلمان، کبھی شریف اور کبھی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے کبھی طوئف اور بھکارن کا روپ دھارن کر لیتی ہے۔ لیکن ان تغیرات کے باوجود اس کی قسمت یکساں رہتی ہے۔ وہ دھرتی کی بیٹی ہے اور تمام تر بلند پروازی اور نشیب وفراز کا سفر طئے کرنے کے بعد بالآخر اپنی دھرتی کے تعلق سے ہی اپنی شناخت قائم کرتی ہے اور یہی اس کی زندگی کا المیہ بھی ہے اور طربیہ بھی۔ وہ کہتی ہیں:

''میں ایک عام اوسط درجے کی لڑکی ہوں۔ چمپا کہتی
رہی۔ اگر میں خدا کا خاص الخاص بندہ ہوتی، میرا امکتا بائی'
سینٹ صوفیہ' تو میرے جسم پر زخموں کی نشان نظر آئے میرا
لبادہ میرے مقدس خون سے سرخ ہوتا میرے ہاتھوں
میں میخیں گڑی ہوتین۔ میرے زخم کسی کو نظر نہیں آسکتے،
کیونکہ میرے تماشائی بھی میری طرح زخمی ہیں۔ وہ کمزور اور
فانی انسان ہیں چشم بینا نہیں رکھتے۔ لوگ ممکن ہے مجھ پر ہنستے
بھی ہوں جب کہ سینٹ صوفیہ کی پرستش کی جاتی ہے''۔53

قدیم زمانے سے ہی چمپک ایودھیا کے راج گرو کی بیٹی ہوتی ہے۔عزت وشہرت کے ساتھ دولت کی فراوانی اس کے قدم چومتی ہے۔ وہ ذہین اور نہ صرف حساس قسم کی لڑکی ہے بلکہ ایک کامیاب رقاصہ بھی ہے۔ وہ گوتم نیلمبر سے محبت کرتی ہے۔زندگی اور تیاگ کے فلسفے پر اس سے گھنٹوں بحث بھی کرنا چاہے تو کر سکتی ہے۔ لیکن ان سبھی باتوں کے باوجود وقت اور تاریخ کے سامنے بے بس اور مجبور ہو جاتی ہے۔ وہ ایک تاریخی حادثے کے نتیجے میں گھر سے بے گھر ہو جاتی ہے اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف پچاس سالہ برہمن سے ہوتی ہے، اور وہ خود کو ایک وفا پرست ہندوستانی بیوی کی طرح زندگی کی دور میں شامل کر لیتی ہے:

''اسے وہی کرنا پڑا جو عورت کی حیثیت سے اس کے بھاگ میں لکھا تھا اور جو غالباً اس کا فرض تھا۔۔۔ چمپک کا دھرم تھا کہ اس کی پرستش اور اس کی خدمت کرتی تھی، جیسے پاٹلی پتر کی اور ہزاروں گرو پتنیاں تھیں ان میں سے ایک وہ بھی تھی اس کی کوئی خاص بات نہ تھی اور اس کی گود میں اس کا بچہ تھا اور وہ اپنی سہیلی سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ فلسفوں کے تذکرے کا وقت نکل چکا تھا''۔54

دوسرا دور جو ہند اسلامی تہذیب کے امتزاج کا دور ہے۔اس دور کی برہمن زادی چمپاوتی عرب سے آئے ہوئے ابوالمنصور کمال الدین سے محبت کرتی ہے۔اور اس کو اپنا شوہر تصور کرتی ہے۔کمال الدین عربی اور اسلامی تہذیب کا نمائندہ ہے جب کہ چمپا خالص ہندوستانی معاشرت کی نمائندگی کرتی ہے، دونوں کے درمیان گفتگو کا منظر ملاحظہ ہو۔کمال الدین چمپا سے کہتا ہے:

''تم بھی برہمن ہو اور تمہاری ذات اور اونچی ہو جائے گی۔سیدانی کہلاؤ گی مجھ سے بیاہ کر لو نا بھئی۔مگر ہم تو تم کو

یوں ہی اپنا پتی مانتے ہیں۔ یہ سن کر وہ چکرا گیا۔ وہ کیسے، میرا تم سے بیاہ کہاں ہوا۔یعنی کہ میں تم سے۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔اس سے کیا ہوتا ہے، وہ ہنستی رہی۔ ہم تو تم کو اپنا مالک خیال کرتے ہیں، یہ بات تم نہیں سمجھ سکتے۔ وہ اس طرح بےفکری سے ہنسا۔

ہم تو صرف ایک آدمی کو اپنا پتی سمجھیں گے اور وہ آدمی تم ہو۔ ہمارا تمہارا تو جنم کا ساتھ ہے۔

جنم جنم کا ساتھ کیا خرافات ہے کمال نے بھنا کر کہا۔ پھر تم جادوگری کی باتیں شروع کیں۔

اس میں جادو کیا ہے؟ چمپا نے جرأت سے پوچھا۔ کیا کوئی لڑکی کسی آدمی کو خود پسند نہیں کر سکتی۔ ہم نے تمہیں چنا ہے اور ہم تمہارے آگے جھکے ہیں۔ کیا کفر بکتی ہو۔ میں نعوذ باللہ خدا ہوں۔

ہو تو بھی۔ دل ہی تو خدا کو جنم دیتا ہے۔ وہ پھر زور سے ہنسی''۔ 55؎

اس اقتباس میں مذہب کے دو نظریہ حیات اور دو تہذیبی ماحول کی وضاحت بھرپور طریقہ سے کی گئی ہے۔ ناول نگار نے بڑی خوبصورت کے ساتھ دونوں کی جذباتی کیفیات اور ذہنی تصورات کی نشان دہی کی ہے۔ کمال کے لیے چمپا کی باتیں اور اس کے حرکات وسکنات بالکل نئے تھے۔ پھر کچھ زمانے کے بعد جب کمال الدین جنگوں اور فتوحات میں گھر جانے کے سبب چمپاوتی کو تقریباً بھول جاتا ہیں اور چمپا اسے نہروں

اور ویرانوں میں تلاش کرتی پھرتی ہے ایک دن ایک جوگی کمال الدین کو بتاتا ہے:

'' جب تم گوڑ کے دربار میں رنگ رلیاں منا رہے

تھے، وہ جنگلوں میں تمہارے انتظار میں روتی پھرتی تھی۔

لیکن کوئی راج ہنس اس کا پیغام تم تک نہ پہنچا سکا'' 56

اس طرح یہاں بھی مجبوری اور تنہائی چمپاوتی کا مقدر بنتی ہے۔ تیسرے دور میں چمپا بائی لکھنو کی ایک طوائف کی شکل میں نمودار ہوئی ہے اور ان طوائفوں کے معاشرے میں عورت اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود مجبور محض ہے۔ وہ اپنی مرضی سے اپنی زندگی نہیں گزار سکتی ہے اور نہ ہی اپنا تشخص قائم کر سکتی ہے۔ وہ اس فیوڈل نظام میں اسی وقت اپنی انفرادیت برقرار رکھ سکتی ہے۔ جب وہ طوائف بن جائے۔

تیسرے عہد کی چمپا بائی دراصل لکھنو کی معاشرتی اور تہذیبی زوال کی علامت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ چوتھے دور کی چمپا احمد کا کردار نہایت اہمیت کے حامل ہے۔ یہاں پر وہ ایک متوسط طبقے کی حیثیت سے ابھرتی ہے۔ جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لکھنو اور وہاں سے انگلینڈ چلی جاتی ہے۔ ناول میں چمپا احمد کے کردار کی پیش کش کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ یہ کردار اپنے دور کے دوسرے کرداروں کے ساتھ مل کر جدید نسل کی ذہنی اور جذباتی کشمکش کی علامت بن جاتی ہے۔ اس دور میں پائے جانے والے تقریباً سارے کردار عامر رضاء، تہمینہ، طلعت، نرملا، گوتم، ہری شنکر، کمال الدین اور خاص طور سے چمپا احمد سبھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ترسیل کے مسئلے سے دوچار ہوتے ہیں یہ اپنے جذبات کا اظہار ایک دوسرے کے سامنے نہیں کر سکتے۔ چمپا عمر سے سے محبت کرنے کے باوجود نہیں کہہ سکتی کہ وہ محبت کرتی ہے۔ ترسیل کی یہ ناکامی آخر کار چمپا پر ختم ہوتی ہے۔ چمپا گمنام اور تنہائی کی زندگی، گذارنے کے سلسلے میں سوچتی ہے:

'' گرو کی سنگت بے کار ہے تنہائی اصل حقیقت ہے'' ۔57

''آخرِ شب کے ہم سفر'' میں قراۃ العین حیدر نے بنگال کی دہشت پسند اور انقلابی تحریک، 1942 کا آندولن اور مطالبہ پاکستان کو بنگال کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ یہ ناول پچاس برسوں کے پر آشوب دور کے واقعات کا احاطہ کرتا ہے۔ قرأۃ العین حیدر نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان لاکھ ترقی کرے لیکن مجموعی طور پر اسے اپنے تہذیبی گہوارے ہی عاقبت محسوس ہوتی ہے اور وہ اپنی بڑوں سے کٹ کر مسلسل بھٹکتا ہی رہتا ہے۔ اس ناول میں ڈھاکہ کے چار مختلف مکانوں میں رہنے والے گھرانوں کے مختلف کرداروں کے آپسی تعلقات کو تاریخی پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ نسوانی کرداروں میں دیپالی کا کردار مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ روزی واؤ مارائے، یاسمین اور ناصرہ نجم السحر کے کردار بھی اپنی اپنی جگہ پر اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ بھی کردار باغیانہ اور انقلابی خیالات کے حامل ہیں۔ وہ سب انقلابی سرگرمیں میں شریک ہوتے ہیں۔ لیکن ذہنی طور پر خود کو ہم آہنگ نہیں کر پاتے اور نامساعد حالات سے دیر تک نبرد آزما رہتے اور اپنے انقلابی رویوں کو برقرار رکھ پانے کی ان میں سکت نہیں رہتی۔ آخر کار وہ حالات سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ اس لیے قرأۃ العین حیدر انہیں آخرِ شب کے ہمسفر کے معنی خیز نام سے یاد کرتی ہیں۔ یہ ہم سفر کردار تاریکی سے لڑنے کا عزم لے کر نکلے تھے۔ لیکن تاریکی سے لڑتے لڑتے وہ خود اس کے سامنے اپنی شکست تسلیم کر لیتے ہیں۔ یہ سبھی کردار اس عہد کے نوجوانوں کے فکری تضادات، تصادم، ذہنی کشمکش کا پیکر ہیں۔ ساتھ ہی اس عہد کا المیہ اور اس نسل کی پہچان بن کر ابھرتے ہیں۔

دیپالی سرکار اس ناول کا نہ صرف اہم کردار ہے بلکہ ناول کے منظرنامے پر ہر جگہ موجود رہتا ہے۔ وہ بنگال کے توسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ نوعمری میں ہی دہشت پسند تحریک میں شامل ہوجاتی ہے۔ وہیں اس کی ملاقات ریحان الدین احمد سے ہوتی ہے۔ وہ پارٹی کے اصولوں کی طرح اسے اپنا آئیڈیل مانتی ہے۔ لیکن جب وہ ریحان کو حاصل کرنے میں ناکام ہوجاتی ہیں۔ تو اس کے سارے خواب بکھرتے ہوئے نظر آتے

ہیں۔ بلکہ اس کی پارٹی بھی بکھر جاتی ہے۔اس سفر کے سارے ساتھی ایک ایک کر کے اپنے مقصد سے منہ موڑ لیتے ہیں۔1947ء کی تقسیم کے نتیجے میں دیپالی وطن سے بے وطن ہوجاتی ہے اور کلکتہ میں جلاوطنی کے دن گزارتی ہے۔اس کے بعد وہ اپنے والد کے ساتھ ویسٹ انڈیز کے ایک شہر میں سکونت اختیار کر لیتی ہے۔ وہیں پراس کی شادی للت موہن سین سے ہوجاتی ہے اوراس پرسکون دنیا میں وہ زمین اور روحانی خلا کا احساس کرتی ہیں۔

دوسرے نسوانی کرداروں میں اومارائے کا کردار بھی اہم ہے وہ تعلیم یافتہ اور دولت مند ہونے کے ساتھ بائیں بازو کی حیثیت پسند تحریک سے نہ صرف ہمدردی رکھتی ہے بلکہ اس تحریک میں شامل بھی ہوجاتی ہے۔لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سیاسی اور انقلابی تحریک سے اس کا تعلق صرف ذہنی تفریح کے لیے ہے۔ بلکہ اس کی دلچسپی تحریک بلکہ سے کہیں زیادہ ریحان میں ہوتی ہیں جب اسے دیپالی اور ریحان کے تعلق کا علم ہوتا ہے تو اسے نہ صرف ناگوار معلوم ہوتا ہے بلکہ اپنی کوششوں سے دونوں کوایک دوسرے سے الگ کر دینے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔

روزی بھی ایک اہم کردار ہے جو دیپالی سرکار کی کلاس فیلو ہےاوراس کے ساتھ انقلاب گروپ شامل ہوجاتی ہے۔سیاسی سرگرمی جاری رکھنے کی خاطر گھر سے ایک دن فرار ہوجاتی ہے۔لیکن بدقسمتی ،قید کر لی جاتی ہے۔ بسنت کمار سانیال ضمانت پر رہا کرا کر اسے اپنے گھر لے آتا ہے اوراس سے شادی کر لیتا ہے۔اس طرح سے روزی کے تمام سیاسی خیالات ختم ہوجاتے ہیں۔اس کے علاوہ یاسمین کا کردار اگر چہ زیادہ اہم نہیں ہے۔پھر بھی جوں جوں ناول آگے بڑھتا ہے۔اس کی معنویت اوراہمیت میں اضافہ ہوجاتا ہیں۔پھرایک نئے انقلاب کی حیثیت سے ناصرہ نجم السحر کا کردار سامنے جوان نام نہاد انقلابیوں کا مذاق اڑائی ہے تو دیپالی سرکار اسے سمجھاتی ہے:

''کل کے باغی آج کے اسٹبلشمنٹ میں شامل ہو چکے
ہیں۔تم آج کی باغی ہوممکن ہے تم کل کے اسٹبلشمنٹ میں
شامل ہو جاؤ۔58''

اس طرح سے آخر شب کے ہم سفر کے نسوانی کرداروں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ خواتین بڑی پر خطر اور پر اسرار زندگی گزارتی ہے۔اس میں شبہ نہیں کہ وہ بڑے ایثار سے کام لیتی ہے۔ان کے دلوں میں ایک آگ سی لگی ہوتی ہے۔ جو تا عمر انھیں گرم اور مضطرب رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ حالات سے سمجھوتہ کر کے اپنی اپنی ذاتی دنیا بسانے کی کوشش کرتی ہیں تو ان میں کچھ کامیاب بھی ہوتی ہیں۔

قرۃالعین حیدر کا ناول ''گردش رنگ چمن'' 1988ء میں منظر عام پر آیا۔اس ناول میں انھوں نے وقت و حالات کے تند سیلاب میں انسانوں کی پسپائی تہذیبی تبدیلیوں کی کشمکش کے نتیجہ میں افراد مختلف قسم کے تعصّبات میں اسیر ذہنی انتشار اور انسانی ارادوں کی ہزیمت کو نمایاں کیا ہے۔اس ناول کے نسوانی کرداروں میں دلنواز بانو بیگم، مہرو، نواب فاطمہ، عندلیب بیگ، عنبرین بیگ، نگار خانم اور شہوار خانم کے کردار سامنے آتے ہیں کسی ایک ناول کا مرکزی کردار نہیں دیا جا سکتا۔چوں کہ ان کرداروں کی زندگی کے کئی نشیب و فراز سامنے آتے ہیں۔

دل نواز بانو بیگم، مہرو اور نواب فاطمہ یہ تینوں کردار ایک طرف تباہ شدہ مغلیہ تہذیبی اقدار کی نمائندگی کرتے ہیں تو دوسری طرف انفرادی کردار کی حیثیت سے بھی اپنا تشخص قائم کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔دل راز بانو بیگم اور نواب فاطمہ دونوں اس طوائفانہ زندگی کو کبھی بھی قبول نہیں کر پاتی ہیں جو حالات کے نتیجہ میں ان کا مقدر بنتی ہے اور تمام عمر ذہنی اور جزباتی کشمکش کا شکار رہتی ہیں۔ایک مدت گذر جانے کے بعد بھی ان کے احساسات و عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے ماضی کو فراموش نہیں کیا ہے بلکہ ان میں گردش کرتے ہوئے مغل خون کی اہمیت کا احساس باقی ہے چودھری فتح محمد نے دل نواز بانو کی ایک زمانے تک بیٹی کی طرح

پرورش کیا اور دنیا اسے دل نواز کا سگا ماموں سمجھتی رہی۔ دل نواز بانو کا ایک نواب سے نکاح کا ارادہ کرنے پر نواب کا یہ شرط لگانا کہ عقد کے بعد وہ صرف اپنی بہن اور ماموں سے ہی مل سکتی ہے تب دلنواز بانو انھیں یہ باور کراتی ہے کہ چودھری فتح محمد اس کے ماموں نہیں ہیں اور نہ ہی وہ خاندانی طوائف ہے لیکن جس خط میں حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے وہ خط نواب صاحب کو ملنے سے پہلے ہی ان کا انتقال ہوجاتا ہے۔ دلنواز بانوں جو بعد میں جگن بی کہلاتی ہے اپنے ماضی کے خاندانی وقار کو یاد کرتی ہے جسے وہ غدر میں کھو چکی تھی۔ وہ اپنے ماضی کے سہارے زندگی رہنا چاہتی ہے کیوں کہ وہ خود نئی زندگی نہیں کر پاتی اور انھیں باقی ماندہ زندگی کرب و پریشانی میں گزارتی ہے اور اپنی چھوٹی بہن مہرو کو طوائف کے پیشے سے بار بار تائب ہوجانے کے لیے آمادہ کرتی ہے۔

لیکن حالات اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ وہ یاس وحسرت اور حکم والم کی زندگی گزارتے ہوئے اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔ اس کا ماضی اس کے لیے کوئی سہارا، کوئی شناخت نہیں بنتا۔ احساس کی یہ شدت اور جدوجہد نے اس کی پوری زندگی کو المیہ بنا دیا ہے۔

نواب فاطمہ کا کردار بھی جگن بی کی طرح المیہ بن کر ابھرتا ہے۔ نواب فاطمہ اپنی انتخاب کردہ زندگی میں پوری طرح رچ بس چکی تھی لیکن اس کے اندرون ذات میں یہ احساس بھی جاگتا رہا کہ وہ ایک گنہ گار کی زندگی گذار رہی ہے۔ یہ احساس اس کی زندگی کے آخری لمحوں میں شدت کے ساتھ اس کا تعاقب کرتا ہے۔ مہرو میں احساس کی وہ شدت نہیں ہے جو دلنواز بانو اور نواب فاطمہ میں ہے مہرو موجودہ صورت حال سے نہ صرف مطمئن ہے بلکہ پرسکون اور آرام دہ زندگی گذارتی ہے وہ اپنی بڑی بہن دلنواز بانو سے ڈھکے چھپے لہجے میں زمانے کی سنگ دلی کا تذکرہ کرتی ہے اور خواہش کرتی ہے دلنواز بانو اپنی مشکل زندگی چھوڑ کر واپس اس کے پاس آجائے۔

عندلیب بیگ کی زندگی ایک مسلسل جدوجہد کی داستان سامنے آتی ہے جس کی شخصیت میں زندگی کی

مصیبتیں سموئی ہوئی ہے۔ وہ اس زندگی کو اپنے وجود کے اندر سمٹے ہوئے بظاہر پر سکون اور خاموش نظر آتی ہے لیکن اس کی تہہ میں ہزاروں بے چینی اور اضطراب پوشیدہ ہیں۔ اضطراب کیفیت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے وہ شراب کا سہارا لیتی ہے اور خود کو مختلف مشاغل میں مصروف رکھ کر تمام بے چینیوں کو بھلانے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ اپنی بیٹی عنبریں بیگ کے لیے ایک بہتر مستقبل کی خواہش مند اپنی ہے لیکن اس کا ماضی اس کی بیٹی کے بہتر مستقبل کی راہ میں رکاوٹ کا سبب بنتا ہے۔

عنبریں بیگ خود کو شکور حسین کی بیٹی جانتی تھی لیکن جب انکشاف ہوتا ہے کہ وہ شکور حسین ہیں بلکہ امبا پرشاد کی بیٹی ہے۔ اس تلخ حقیقت کو برداشت نہیں کر پاتی ہے۔ اس جھٹکے سے اس کا ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے۔ اس پر جنون کے دورے پڑتے ہیں۔ اس صورتحال پر قابو پانے کے لیے ڈاکٹر منصور کاشغری اسے علاج کے سلسلہ میں لندن لے جاتا ہے جہاں سے وہ بالکل صحت مند ہو کر واپس لوٹتی ہے۔ اس ذہنی صدمے کے بعد عنبرین بیگ سنبھلنے کی بھرپور کوشش کرتی ہے اور ماضی کو ایک حقیقت تسلیم کر کے اسکو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ اس طرح سے اس کی زندگی کا یہ المیہ اس کے ماضی کی مرہون منت ہے۔ چونکہ مستقل اور حال میں ایک خوشگوار زندگی کے تعین کے لیے ماضی کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔

''گردش رنگ چمن'' میں عندلیب بیگ عنبریں بیگ اور منصور کاشغری کے کردار تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ایک کردار نگار خانم کا بھی ہے جو تقریباً تیس (30) ناولوں کی مصنفہ ہوتی ہے۔ نگار خانم کے دولت مند متوسط گھرانے کا مسئلہ بھی عنبریں بیگ اور عندلیب سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں کا ماضی کمزور ہے اور دونوں ہی اپنے ماضی کی کمزوری سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن تباہی اور ذلت کی زندگی دونوں کو برباد کرتی ہوئی نکل جاتی ہیں اس طرح عندلیب بیگ اپنی حق بیانی اور دیانت داری سے کام لینے کے باوجود منصور کاشغری کی ہمدردی حاصل نہ کر سکی اور نگار خانم اپنی دولت مندی ار چالا کی کے باوجود ماضی کے حصہ کو توڑ

کر جا گیرداروں کی صف میں داخل نہ ہوسکی بلکہ طوائف کی اولاد ہی قرار پائی۔ دراصل مختلف تاریخی ادوار میں انسان کے خارجی حالات اور ماحول مین تبدیلی ہونے کے باوجود عورت کی دائمی بے چارگی، مردارنہ تحکم والے سماج میں اس کی ہزیمت اور غیر رقی یافتہ خطوں میں اس کے وجود کی تزلیل، سارے ناول کی فضا پر حاوی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سبھی نسوانی کردار حال سے ناآسوادگی کا شکوہ کرنے کے ساتھ ان میں مستقل مایوسی اور اضحلال کی کیفیت پائی جاتی ہے اور یہ کردار ہندوستانی کی بدلتی ہوئی تاریخ اور حالات کے جبر کی نمائندگی کرتے ہیں، چمن پر ان کا کوئی اختیار نہیں ہوتا ہے۔ جس کے سامنے وہ بےبس اور مجبور ہونے کے ساتھ مختص تماشائی ہوتے ہیں۔

''چاندنی بیگم'' میں قرۃالعین حیدر نے ہندوستان کے جدید معاشرے کے تغیر پذیر حقائق اور مسائل کی طرف نہ صرف نشان دہی کی ہے بلکہ متوسط طبقے کے گھرانوں کی تقسیم اور پاکستان و بنگلہ دیش میں آباد ہونے والی عوام کے نئے مسائل کی عکاسی بھی کی ہے اس ناول میں کرداروں ایک وسیع دنیا آباد ہے۔ مرد کردار ہی اس ناول کی مرکزیت کو قائم رکھنے میں مددگار ثابت ہوئے ہیں لیکن نسوانی کرداروں کی اہمیت اور اس کی معنویت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ نسوانی کرداروں میں چاند بیگم، بیلا، صفیہ سلطانہ، لیل شروش، فیروز علیمہ بانو زرینہ سلطانہ اور پروین سلطانہ کے علاوہ اور بھی کئی کردار حلات کے تحت ابھارے گئے ہیں۔ ناول کے عنوان سے پتہ چلتا ہے چاندنی بیگم اس ناول کا مرکزی کردار ہے لیکن اس کو اس کو بہت جلد غیر روایتی اور انوکھے انداز میں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

چاندنی بیگم جاگیرداروں کی اس نسل سے تعلق رکھتی ہے جو اپنی بیویوں اور اولادوں کو بے سہارا چھوڑ کر پاکستان چلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ے کہ چاندنی بیگم، نہایت عسرت کی زندگی گزارتے ہوئے تعلیم حاصل کرتی ہے اور اسکول ٹیچر کی معمولی نوکری کرتی ہے۔ ایک دن ہندوستان کی نیک بیویوں کی طرح روایتی

انداز میں ختم ہو جاتی ہے۔ چاندنی بیگم کی زندگی میں کوئی رنگینی یا حیرت ناک واقعہ درپیش نہیں ہوتا کیوں کہ حصول معاش کی سخت جدو جہد نے اسے کچل کر رکھ دیا ہے۔

علیمہ بانو بٹو باجی کی بچپن کی سہیلی تھیں بڑی ہی آفت
زہ، ان کی بھی وہی کہانی، شوہر پاکستان فرار ہوئے وہاں
سے طلاق لکھ بھیجی۔59؎

موگرے بھانڈ کی بیٹی ''بیلا'' جس کا ماضی انتہائی کمزور ہونے کے ساتھ نچلے خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور راتوں رات قنبر علی کے طبقے کی نہ صرف رکن بن جاتی ہے بلکہ ڈرامائی انداز اختیار کر کے اس سے شادی بھی کر لیتی ہے۔ بیلا بیوی بن جانے کے بعد اپنے شوہر کے مکان اور باقی ماندہ جائیداد کو مختلف بہانوں سے اپنے قبضے میں لینا چاہتی ہے اور اس چالاکی میں وہ کامیاب بھی ہو جاتی ہے۔ ملبوسات اور فرنیچر کے علاوہ فیشن کی نئی چیزیں خریدنا اس کا معمول بن جاتا ہے۔ اپنی کوٹھی کو ماڈرن انداز میں آراستہ کرتی ہے۔ اس کا شوہر بیلا کی خواہش کے آگے خود کو بے بس پاتا ہے یہی وجہ ہے کہ بیلا کی ہر ضد اسے پوری کرنی پڑتی ہے۔ بیلا اپنے مہر میں کوٹھی لکھوا لیتی ہے اور پشتینی باغ بھی حاسل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ بیلا اپنے والدین اور آوارہ گرد بھائی کے ساتھ تن ڈھکنے آئے دربدر کی اتنی ٹھوکریں کھاتی ہے کہ زندگی کے زیادہ سے زیادہ خوشگوار لمحوں کو سمیٹ کر عدم تحفظ کے احساس کو مٹانا اس کی فطرت بن چکی ہے۔

دوسری طرف فیروزہ، شروش اور پنکی وغیرہ ہندوستان کے پرانے جاگیردار شرفا کی جدید نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ پنکی کے والد تقسیم وطن کے بعد پاکستان چلے جاتے ہیں اور وہاں سے بیوی کے نام طلاق نامہ بھیج دیتے ہیں۔

والد اس کے رویہ سے پنکی گھبراتی تو ضرور ہے لیکن ہمت وحوصلہ کو بے قابو ہونے نہیں دیتی اور نئے

عزم واستقبلال کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔اگر چہ ہندوستان میں معاشی جدوجہد پنکی کو کرنی پڑتی ہےلیکن یہی جدوجہد اسے وزیروں سے تعلقات قائم کرنے اور ریڈ روز کا ٹھیکہ حاصل کرنے پر مائل کرتی ہے۔لیلیٰ سروش باپ کے کاروبار اور جائیداد کی تنہا وارث ہے جونہایت آزادخیال اور جدید طرز کی لڑکی ہے۔فیروز بھی جدید خیالات کی لڑکی تو ہےلیکن وہ پرانی کلچرل سرگرمیوں سے بے حد دلچسپی نہیں ہےاس کے علاوہ برصغیر میں دولت پرمبنی تو شناخت کی تگ ودو پرانے جاگیردار شرفا کی شناخت کا کم ہونا،اور پس ماندہ اقوام کانئے حوصلے اور قوت کے اقتصادی حالات فتح کے جھنڈے گاڑنا ایسے عوامل ہیں جن سے پنکی اور اس کے ہم عمروں پر واضح ہوجاتا ہے کہ وہ سب نئی تہذیب کے پروردہ ہیں۔اس ناول میں قرۃ العین حیدر نے پہلی باران جاگیرداروں کی نئی نسل پنکی،لیلیٰ سروش اور فیروزہ وغیرہ کو جدید زندگی کے شعبہ حیات،خاص طور پر سے تجارت میں نئے اعتماد اور حوصلے کے ساتھ شرکت کرتے ہوئے دکھایا ہے۔

تقسیم وطن کے نتیجے میں ریاست تین کٹوری کی بڑی بیٹی زرینہ سلطانہ اپنے شوہر کو کھو چکی ہے اس کا شوہر پاکستان جاکر دوسری شادی کر لیتا ہے۔زرینہ سلطان معاش حقیقت سے فارغ البال ہونے کی وجہ سے اپنی اور اپنی اولاد کی بخوبی کفالت اور پرورش کر لیتی ہے۔بظاہر خواہش حال اور مطمئن تو رہتی ہےلیکن اس کے دل میں شوہر کی بے رخی اور بچوں کے عدم تحفظ کا احساس شدید طور پر ہوتا ہے۔زرینہ سلطانہ کی چھوٹی بہن پروین سلطانہ تقسیم کے بعد پاکستان چلی جاتی ہے۔پروین سلطانہ وہاں جاکر متمول ہوجاتی ہے۔مادی آسائش اور دولت کی فراوانی نے اس کو اس قدر مغرور اور ذہنی طور پر مفلوج کر دیا ہے کہ اس کی زندگی شروع سے آخر تک تصنع اور تکلیف کا نمونہ بن جاتی ہے۔اس طرح چاندنی بیگم، کے نسوانی کردار ہمت وقوت لے کر نئے امنگ کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ان میں حصول معاش کی وجدوجہد کرنے کی قوت ہے تو عدم تحفظ کا احساس بھی انھیں رہ رہ ستاتا رہتا ہے۔وہ خوش حال بھی اور بدحال بھی لیکن ان کی زندگی حالات کے زیروبم سے متاثر

ہونے کے باوجود نئے اعتماد کے ستاھ زندگی کے دوڑ میں شامل رہتے ہیں۔قرۃ العین حیدر کے نسوانی کرداروں کے سلسلہ میں ڈاکٹر قمر رئیس نے یوں محاکمہ کیا ہے

> قرۃ العین حیدر کے ناولوں کی ہیروئن ان کے اپنے خیالات اور تصورا کا عکس Refelction بھی ہوتی ہیں اورس لیے ان کی بہت سی خصوصیات مشترک ہوتی ہے۔وہ اپنی تنہائی، محرومی اور کرب واذیت کے لمحوں میں تقریباً ایک جیسی ہوتی ہے۔وقت کی سفا کی ان سب کو ایک طرح سے اپنا نشانہ بناتی ہے۔مرد کے جابرانہ ساج میں وہ سب ہی دکھوں اور محرومیں کی آگ میں جلتی ہیں۔وہ رفشی ہو چمپا ہو یا ستیا پخندانی سب کا مقدر کم وبیش ایک ہے۔60

## خدیجہ مستور کے نسوانی کرداروں کے مسائل

برصغیر کی انگریزوں کے خلاف لڑی گئی لڑائی میں مکمل ہندوستان یعنی موجودہ بنگلہ دیش ہندوستان اور پاکستان کی تمام عوام نے حصہ لیا اور جن امیدوں کے ساتھ یہ جنگ لڑی گئی اس کا خاتمہ 1947ء میں ہوا لیکن آزادی کے آخری ایام میں کانگریس اور مسلم لیگ کے منشور کے اختلافات نے برصغیر کو منقسم کر دیا۔جب وطن تقسیم ہوا تو سارا ملک فسادات کی لپیٹ میں آ گیا جس سے انسان کا وجود بے معنی ہو کر رہ گیا جس انسانی اخوت ومحبت کے جھنڈے تلے ملک عزیز کی انگریزوں کے ظلم سے آزادی کی جدوجہد کی گئی تھی آزادی کے بعد اخوت اور بھائی چارگی کی جڑیں متزلزل ہوگئیں۔قتل و غارت اور انسانیت سوز واقعات کے اثرات صرف ہندوستانیوں پر ہی نہیں بلکہ پاکستانیوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔اس دور میں برصغیر کئی مسائل اور بحران

سے دوچار تھا جبکہ معاشی مدبرین سیاسی مفکرین سماجی جہد کار اپنے اپنے طور سے معاشی، سیاسی سماجی مسائل کے حل تلاش کرر ہے تھے۔ایسے پرآشوب دور میں سماج کا حساس طبقہ جو قلمکار طبقہ ہوتا ہے ان حالات کو محسوس کیا اور بڑی فن کاری کے ساتھ اپنے فن پاروں میں پیش کیا۔

جنگ آزادی اور تقسیم ہند کے سلسلے میں جتنے بھی فن پارے قلمبند ہوئے ہیں ان میں خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن'' کے کافی مشہور ہے۔

خدیجہ مستور، خواتین ناول نگاروں میں منفرد حیثیت اور نمایاں مقام کی حامل مصنفہ ہیں۔ان کا اسلوب سادہ سلیس اور صاف وشفاف ہے۔انھوں نے سماجی ومعاشی بحران پر حقیقت پسندانہ نگاہ ڈالی ہے۔ ناول ''آنگن''، میں ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے آخری دور کی پرزور کانگریسی تحریک اور مسلم لیگ کے مابین ٹکراؤ سے شروع ہوتا ہے اور آزادی کے بعد ملک کی تقسیم کی وجہ سے دونوں جانب کے عوام کی کشمکش اور نفسیاتی ردعمل پر خاتمہ ہوتا ہے۔کے کے کھلر نے ناول آنگن کے متعلق اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

خدیجہ مستور کا''آنگن''ایک معیاری ناول ہے جو تقسیم
کی بربریت کو بے نقاب کرتا ہے۔61؎

اس ناول میں پہلے ماضی کے ذیلی عنوان سے اتر پردیش کے ایک روبہ زوال زمیندار گھرانے کی کہانی بیان کی گئی ہے۔اس ناول کا ایک اورمرکزی کردار عالیہ ہے جو ماضی میں جھانک جھانک کرقاری کو در پرداواقعات اور روایات سے پردااٹھاتی ہے۔عالیہ ایک ایسا کردار ہے جو آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کے حالات میں پورے خاندان کے ساتھ نامنقسم اور تقسیم زدہ ملک میں زندگی کے ارتقائی مراحل طئے کرتی ہے۔

ڈاکٹر غلام محی الدین انصاری سالک نے ناول ''آنگن'' کے متعلق لکھا ہے

''اس ناول میں اتر پردیش کے ایک ایسے خاندان کی

کہانی بیان کی گئی ہے جو سارے ملک کے آنگن کی

سرگذشت معلوم ہوتی ہے۔62؎

ناول ''آنگن'' جاگیردارانہ گھرانے کی کہانی ہے جہاں پر مردوں کی بالادستی رہتی ہےاورعورتیں بے بس لاچارومجبور ہوتی ہیں۔اسکی مثال سلمیٰ پھوپھو ہے۔سلمیٰ عالیہ کے والد کی بہن تھیں جنھیں زمیندار گھرانے کےایک غریب کسان سے عشق ہوگیا۔سلمیٰ کسی طرح بھاگ کرشادی کرلی۔لیکن زمانے کےظلم وستم سہتے سہتے مہلک بیماری تپ دق میں مبتلا ہوکرمرگئیں اور پیچھےایک لڑکےکوچھوڑگئیں۔سلمیٰ کےانتقال کے بعد عالیہ کے والداس لڑکےکوگھرلےآتے ہین جس کا نام صفدر ہے۔ یہ ہی ایسا فرد ہے جوناول کی کڑی کو ماضی سے حال کو جوڑتی ہے۔

صفدراپنے والد کے تاریخ دہراتا ہےاورتہمینہ سےمحبت کرنے لگتا ہےاس رشتہ سےتہمینہ کے والد رضامند ہوجاتے ہیں لیکن والدہ ناراض رہتی ہے جب تہمینہ کا رشتہ اس کی مرضی کے خلاف تہمینہ کے چچازاد بھائی سے طے پاتا ہےجس کے خلاف تہمینہ صفدر کی محبت میں خودکشی پرمجبور ہوجاتی ہے۔تہمینہ کی خودکشی اس معاشرے میں عورتوں کی بےبسی اورلاچاری ظاہرکرتی ہےمعاشرے کی سخت گیری خاندانی وقارنےسلمیٰ اور تہمینہ کوبےوقت کی موت کےمنہ میں ڈھکیل دیا۔

خدیجہ مستور کےاس ناول میں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی بھرپورعکاسی کی گئی ہے کسم کے کردارکی صورت میں ہندوستانی عورت کی مکمل تصویرکشی کی گئی ہے۔ ہندوسماج میں کم سنی میں شادی کارواج تھا وہ کسم کے ذریعہ بتایا گیاہے۔اس کےعلاوہ بیوہ کومنحوس ماننااس سے ناروا سلوک برتنااور بیوہ کی دوسری شادی کی ممانعت جیسےروایتی اصولوں کوکسم نے برداشت کیا۔ناول کےاس اقتباس کےذریعہ خدیجہ مستورسماج سے اس طرح سوال کرتی ہیں:

''میں تو اس وقت چودہ پندرہ سال کی تھی شادی کو صرف
تین مہینے ہوئے تھے۔ وہ ہنستے ہوئے چلے گئے اور کبھی نہ
مڑے میں ان کی راہ تک تک کر تھک گئی۔ مجھے بیوہ جان کر
سب میرے سائے سے بچتے ہیں پر جانے کیا بات ہے کہ میں
آج تک اپنے کو بیوہ نہیں سمجھتی۔ میں بیوہ ہوں موسی؟۔63

کسم سماجی روایتوں کو توڑنے کی ہمت کرتی ہے بیوگی میں ایک مرد سے شادی کرتی ہے جس کی خاطر وہ رسوائی کا سامنا کرتی ہے لیکن وہ مرد بے وفا ثابت ہوتا ہے جس سے دل برداشتہ ہو کر کسم خودکشی کر لیتی ہے۔ سلمیٰ کسم، تہمینہ کے کرداروں کے ذریعہ ناول نگار نے اس معاشرے میں عورتوں کی بے بسی اور لاچاری کی نشاندہی کی ہے۔

عالیہ کے کردار میں ناول نگار نے ایک بلند اور روشن خیال تعلیم یافتہ باشعور عورت کو پیش کیا ہے۔ جو جدید دور کے روایتی زمیندار گھرانے کی دوسری نسل ہے وہ خاندان کے ماضی کے حالات اور حال میں رونما ہونے والے معاشرتی اور نفسیاتی ردعمل کا باریکی سے جائزہ لیتی ہے وہ ایک حساس لڑکی ہے وہ ہر فرد کی مدد کرنا چاہتی ہے جو مظلوم ہے جیسا کہ وہ اسرار میاں کے لیے ہے اسرار میاں ایک نہایت ہی مظلوم کردار ہے جو عالیہ کا چاچا ہے لیکن کسی داشتہ کے بطن ہے اسی لیے اس کو ذلیل کیا جاتا ہے لیکن عالیہ چاہتی کہ وہ انسانیت کے ناطے ان کی مدد کرے۔

ہے اسرار میاں اگر میرا بس چلے تو سب سے پہلے
تمہاری کشتی سجا کر لے آؤں۔ اس نے دل ہی دل میں کہا
اور کھانا ختم کر کے جلد اوپر چلی گئی۔64

عالیہ تعلیم یافتہ باشعور جیتا جاگتا کردار ہے اور اپنے علم و دانش کی بناء پر حالات کا مقابلہ کرتی ہے۔

بچپن میں ہمدردی غمگساری کا جو جذبہ اس کے دل میں پنپ رہا تھا وہ آخر تک قائم رہا ناول نگار نے اس جذبہ ہمدردی کو شکیل کی مدد کے ذریعہ اظہار کیا ہے۔ شکیل عالیہ کا چچازاد بھائی ہے وہ بچپن سے ہی نامرادی کا شکار رہا اور ملک کے سیاسی اور اقتصادی حالات نے اسے سماج سے متنفر کر دیا اور وہ بری عادتوں کا شکار ہو گیا تقسیم ھند کے بعد پاکستان میں عالیہ کی ملاقات شکیل سے ہوتی ہے جو کہ پولیس سے بچتے چھپتے پھر رہا ہے۔ عالیہ ماں کے خلاف جا کر شکیل کو راہ راست پر لانے کی ٹھان لیتی ہے وہ کہتی ہے:

اگر تم بڑی چچی کے پاس نہیں جاتے تو پھر میرے پاس
رہنا ہوگا۔ میں تم کو اب کہیں نہ جانے دوں گی، اب ملازم
ہوگئی ہوں، میں تم کو بھی اسکول میں داخل کرادوں گی، تم
آرام سے پڑھو، اسی طرح زندگی بن جائے گی''۔
............اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب کسی بھی صورت
میں شکیل کو نہ جانے دے گی چاہے اس سلسلے میں اماں سے
کتنی ہی دشمنی مول لینی پڑے''۔65

عالیہ وہی کرتی ہے جو اس کا شعور مطالبہ کرتا ہے عالیہ کی زندگی میں والد کے جیل جانے کے بعد نیا موڑ آتا ہے۔ والد کی گرفتاری کے بعد اسے ماں کے ساتھ بڑے چچا کے یہاں رہنا پڑتا ہے جہاں چھمی اور جمیل ملتے ہیں جمیل اس کی طرف ملتفت نظروں سے دیکھتا ہے اس کے قریب آنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اسے یہ روشنی شب گزیدہ سحر جیسی لگتی ہے کیوں کہ اس کے دل میں ماضی کی یادوں کے اندھیرے بسے ہیں۔ جمیل کی چاہت میں عالیہ نسوانی جذبات و کیفایت سے دوچار رہتی ہے کشمکش کے کئی مراحل آتے اور چلے جاتے ہیں۔ عالیہ جمیل کے لے اپنے دل میں کسک محسوس کرتی ہے لیکن اظہار نہیں کرتی عالیہ کی زندگی میں جمیل کے بعد ڈاکٹر اور صفدر آتے ہیں لیکن وہ ان رشتوں کو کچے دھاگے سمجھتی ہے اور تنہائی کو ترجیح دیتی ہے۔

عالیہ کے نسوانی جذبات و کیفیات پر سماجی و معاشراتی اثرات کو عبدالحق حسرت نے بڑی نفاستسے اس طرح لکھا ہے:

عالیہ کسی مرد کی محبت کا اعتبار اس لیے نہیں کرتی ہے کہ جس ماحول میں اس نے آنکھ کھولی تھی اس میں عورت کا وجود منجملہ سامان تعش تھا یا پھر ایک کنیز یا بچہ جننے والی جورو کے۔ اس معاشرے میں عورت کا وجود مقصود بالذات نہ تھا وہ ایک شئے تھے جسے خریدا بدلا اور پھینکا جا سکتا تھا۔ اس معاشرے میں اس کی شخصیت صاحب اختیار اور ارادہ نہ تھی۔ نہ تو اپنے شوہر کے انتخاب میں آزاد تھی اور نہ اس کی بات میں کہ وہ کسی مرد سے محبت کرے یا نہ کرے، اسے تنہا رہنے کی مکمل آزادی نہ تھی۔ اس ماحول میں مرد کی بے وفائی کے قصے عام تھے۔ اس نے کسم دیدی کا حشر خود اپنی آنکوں سے دیکھا تھا۔ کس طرح اس کا عاشق اغوا کرنے کے بعد اسے تنہا مرنے کے لیے چوڑ دیا تھا۔ اس ماحول میں عالیہ کا رویہ جمیل کی طرف بھی اور صفدر کی طرف بھی سمجھ میں آتا ہے''۔66

اس طرح عالیہ باشعور تعلیم یافتہ جدید دور کی عورت کی نمائندہ کردار ادا کرتی ہے وہ تمام سماجی بندشوں کے باوجود اپنے اندر اتنی ہمت و حوصلہ رکھتی ہے کہ اپنی پسند نہ پسند سے کسی بھی رشتہ کو قبول یا ٹھکرا سکتی ہے۔

ناول ''آنگن'' میں خدیجہ مستور نے چھمی کے ذریعہ ایک بے باک من موجی خوش مزاج کردار کو پیش

کیا ہے۔ چھمی اپنی ذہانت، دانشمندی اور بے باکی کے سبب کسی بڑی الجھن کا شکار نہیں ہوتی وہ تمام بے توجہی بے اعتنائی کے باوجود زندگی گزارنے کے لیے خوشگوار ماحول ہموار کر لیتی ہے۔ عالیہ جمیل سے محبت کرتی ہے لیکن جب جمیل چھمی کو نظر انداز کر کے عالیہ میں دلچسپی لینے لگتا ہے تو جمیل سے کنارہ کشی ہو جاتی ہے بلکہ وہ کہتی ہے:

بھئی جو ہم سے محبت کرے گا ہم اس سے محبت کریں گے۔

یہ تو بدلہ ہے اس ہاتھ سے اس ہاتھ لے۔67؎

چھمی اپنی محرومیوں کی وجہ سے زندگی سے بیزار نہیں ہوتی بلکہ زندگی کو اپنے نئے سرے سے جینا چاہتی ہے۔ جیسا کہ اس اقتباس سے ظاہر ہے

بارات آنے میں اب تھوڑی دیر رہ گئی تھی۔ اس نے
چھمی کو غور سے دیکھا وہ شرمائی ہوئی بیٹھی تھی۔ چھمی کے
چہرے سے اسے کسی قسم کا خطرہ نہ نظر آ رہا تھا۔68؎

آنگن میں مخصوص دور مین اس عہد کے دو بڑے سیاسی گروہ کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش اور ملک کی تقسیم میں کارفرما عناصر کی نشاندہی کی ہے۔ وہ تقسیم وطن کے نظریے کو قبول نہیں کرتیں وہ جگہ جگہ ہندو۔ مسلم اتحاد کی مثالیں بیان کرتی ہیں اور آزادی کی جنگ میں مسلمانوں کی قرانیوں کا ذکر کیا ہے۔

زمانے زمانے کی بات ہے وہ بھی زمانہ تھا جب ہندو
اپنے گاؤں کے مسلمانوں پر آنچ آنے دیکھتے تو سر دھڑ کی
بازی لگا دیتے اور مسلمان ہندو کی عزت بچانے کے لیے
اپنی جانیں نچھاور کر دیتا۔ ایسا بھائی چارہ تھا کہ لگتا ایک ماں
کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہوں۔ پر اب کیا رہ گیا تھا دونوں

کے ہاتھوں میں خنجر آ گیا۔69

خدیجہ مستور نے نسوانی کرداروں کے جذبات واحساسات کی عکاسی میں پوری توجہ مرکوز کی ہے عالیہ کی ماں ہوں یا بڑی چچی ، نجمہ پھوپھو ہوں یا کریمن بوا ،معصوم ،تہمینہ ہو یا مجبور چھمی ان کی نفسیاتی کشمکش اور جذباتی ہیجان کی ترجمان ناول نگار نے اپنی ماہرانہ صلاحیت کا اظہار کیا ہے۔ عالیہ کا مرکز کردار اپنے اطراف کے کرداروں سے بہتر طور پر ہم آہنگ ہے ۔ مجموعی طور پر خدیجہ مستور کا یہ ناول فکشن کی تاریخ میں ایک مکمل شاہکار ہے۔

ڈاکٹر محمد حامد علی خاں لکھتے ہیں

''مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدیجہ مستور نے ''آنگن''، میں نفسیاتی حقیقت نگاری کا ایک جاندار نمونہ پیش کیا ہے اور بطور خاص نسوانی نفسیات کی گرہ کشائی میں کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے''۔70

خدیجہ مستور کا دوسرا ناول ''زمین'' ، ناول آنگن کی توسیع معلوم ہوتا ہے۔اس ناول میں انھوں نے پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد نئ معاشرت میں پہنچی ہوئی مذہبی تنگ نظری لوٹ کھسوٹ کی تصویر پیش کی ہے۔ پاکستان کے بننے کے بعد پہلے سے مقیم پاکستانیوں اور ہندوستانی سے آنے والے مہاجرین میں رسہ کشی اوراخلاق کی گراوٹ کوموضوع بنایا ہے۔اس ناول میں انہوں مہاجر خاندان کی لڑکی ساجدہ کے حوالے سے مہاجرین کے کیمپ کی خستہ حالت ،مہاجرین کی بے بسی اور لاچاری کا دردناک نقشہ کھینچا ہے۔

ناول زمین میں ساجدہ ایک حساس لڑکی ہے جوصلاح الدین سے بے لوث محبت کرتی ہے۔صلاح الدین کے بچھڑنے کے بعد بھی اسکی محبت کو اپنے سینے میں دبائے رکھتی ہے حالانکہ اسکی شادی ایک نیک محبت

کرنے والے شخص ناظم سے ہوتی ہے۔ساجدہ ناظم کو پا کر مطمئن ہے لیکن وہ اپنی پہلی محبت کو نہیں بھول پائی جب ایک موڑ پر جب صلاح الدین سے ساجدہ کی ملاقات ہوتی ہے تو ساجدہ حیرت زدہ رہ جاتی ہے چونکہ صلاح الدین دولت شہرت اور اقتدار پا کر مادہ پرست بن گیا ہے۔خدیجہ مستور نے صلاح الدین کے کردار میں خود غرض مفاد پرست نئی نسل کی تصویر اس طرح پیش کیا ہے:

وہاں میری بہت زمینیں ہیں۔دس مربعوں میں تو صرف
باغ ہیں۔بڑے اچھے مالٹے ہیں۔میرے باغ کے خالص
ریڈ بلڈ، میری بیوی کو بھی پچیس مربعے ملے ہیں۔ہم دونوں
اپنے علاقے کے سب سے بڑے زمیندار ہیں۔سارے
افسر ہمارے یہاں آ کر ٹھہرتے ہیں۔71ؕ

ناول ''زمین'' میں تاجی کا کردار نہایت مظلوم داشتہ کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے پناہ گزیں لڑکی تاجی جو مالک صاحب کے گھر میں بحیثیت نوکرانی ہے۔مردانہ ہوس کا شکار ہو کر موت سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔

اس ناول کی ایک اور اہم کردار سلیمہ ہے وہ تعلیم یافتہ خود مختار ہے۔کالج میں ملازمت کرتی ہے۔اپنی ماں کی دقیانوسی خیالات سے بدظن ہو کر ہاسٹل میں رہتی ہے اور اپنی زندگی میں کسی مرد کا تصور نہیں کرتی۔وہ مرد وعورت کے رشتہ کی قائل نہیں تھی اس کا خیال تھا کہ

''مرد اور عورت کی محبت محض بھوک کا دوسرا نام ہے
اور یہ اتنی خود غرض بھوک ہوتی ہے جو سارے رشتوں
ناطوں کی محبتوں کو چاٹ جاتی ہے۔کال پڑ جاتا ہے مگر اس
محبت کا پیٹ پھر بھی نہیں بھرتا''۔72ؕ

خدیجہ مستور نے دونوں ناولوں میں تقسیم ہند کی وجہ سے وقوع پذیر معاشی معاشرتی بحران کو موضوع

بنایا ہے۔اسی لیے خدیجہ مستور کے دوسرے ناول ''زمین'' کو ''آنگن'' کی توسیع کہتے ہیں۔ڈاکٹر غلام محی الدین انصاری سالک لکھتے ہیں

> ''زمین کے کردار کسی نہ کسی طرح 'آنگن' کے کردار سے
> مشابہت رکھتے ہیں بلکہ زمین کے کردار آنگن کے کردار کا
> سایہ معلوم ہوتے ہیں اوران دونوں ناولوں کے موضوعات
> میں بھی بہت حد تک مطابقت پائی جاتی ہے اس لحاظ سے
> زمین کو آنگن کا دوسرا جزو کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔73

## جیلانی بانو کے نسوانی کرداروں کے مسائل

جیلانی بانو کے ناول ''ایوان غزل'' میں بھی کرداروں کی ایک دنیا آباد ہے۔یہ ناول حیدرآباد کے زوال آمادہ جاگیردارانہ نظام سے تعلق رکھنے والے خاندان اورحیدرآبادی افراد پر مشتمل ہے۔بقول کے کے کھلر

> جیلانی بانو کی ''ایوان غزل'' (1976ء) حیدرآباد کی ایک ناقابل فراموش ڈاکومنٹری
> ہے جس میں نہایت الف لیلوی انداز میں نئی اور پرانی زندگی کا ٹکراؤ ہے۔ایک پورے عہد کا
> المیہ ہے جس میں جام اور ساقی، جاگیردارانہ عیاشیاں غزل و مئے کی محفلیں حیدرآباد کا خلوص۔
> نہایت نازک انداز میں پیش کیا گیا ہے۔74

ناول کے کردار جدید اور قدیم دونوں اقدار کی ترجمانی کرتے ہیں۔اس طرز معاشرت میں ''ایوان غزل'' کے تمام نسوانی کردار کا استحصال زوال پذیر جاگیردارانہ نظام کے دور میں ہوتا ہے۔ان کرداروں کی ایک حیثیت ایسی بھی ہے۔جو انھیں منفرد کردار کی حیثیت سے سامنے لاتی ہے۔ان نسوانی کرداروں میں غزل، چاند، قیصر اور کرانتی اہم ہیں۔

غزل ناول میں مرکزی کردار کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔اس کی پیدائش سے لے کر موت تک ایک ایک لمحے کی تصویر اور خدوخال ابھارے گئے ہیں۔اس کی شخصیت کی تشکیل جس انداز سے لی گئی ہے اس سے تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔بچپن سے ہی غزل اپنے عزیزوں کی بے حسی اور ان کی شفقت و محبت سے محروم رہتی ہے۔ ماں کی اچانک موت اور باپ کی خواہ مخواہ ڈانٹ پھنکار اور ایوان غزل کے لوگوں کا توہین آمیز رویہ، گویا غزل کو ہر جگہ بے بسی اور بے چارگی نصیب ہوتی ہے لیکن جب وہ اپنے ماموں زاد بھائی بہنوں کی قدم اور لاڈو پیار دیکھتی ہے تو اس کے اندر عدم تحفظ اور کمزور ہونے کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے۔ وہ محبت ہمدردی کی شدید طور پر بھوکی ہے جو بھی اسے ذرا محبت اور پیار سے دیکھ لیتا ہے۔اس لیے اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔

غزل ایک سیدھی سادی، جذباتی اور معصوم قسم کی لڑکی ناول کے منظر نامے پر دیکھائی دیتی ہے۔جو حالات کے نشیب و فراز کو دیکھنے کے باوجود اس کے اندر دانش مندانہ ہنر مندی اور چالاکی پیدا نہیں ہوتی۔ نصیر اسے محبت کا سبز باغ دکھا کر بے وفائی کر جاتا ہے لیکن وہ حرف شکایت لب پر نہیں لاتی۔ بلکہ اس کی دی ہوئی انگشتری کو جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ پھر شاہین سے شادی ہونے کے بعد اس کو ماں بننے کی ازلی خواہش ہوتی ہے لیکن یہ خواہش اس کی پوری نہیں ہوتی۔جس سے اس کی ذہنی الجھنیں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ پھر دونوں کے درمیان ایک کھائی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔اس کے بعد وہ پھر اپنی سابقہ محبت کی دنیا میں واپس آتی ہے اور نصیر کے خواب دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔مگر ایک عرصہ بعد جب نصیر اپنے اہل و عیال کے ساتھ ہندوستان واپس لوٹتا ہے اور جب اسکی ملاقات غزل سے ہوتی ہے تو نصیر اس کی انگلی سے وہ انگشتری اتار لیتا ہے جو اس نے غزل کو بطور نشانی دیا تھا۔نصیر کی ایسی حرکت پر غزل کے جذبات کی چٹکاری خاک میں تبدیل ہوتی ہے اور وہ برداشت نہیں کر پاتی اور آخر کار اس صدمے سے دوچار ہو کر موت کی آغوش میں پہنچ

جاتی ہے۔

چاند کی حالت بھی غزل کی طرح سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔غزل جن حالات سے نبرد آزما ہوتی ہے ان حالات کو پیدا کرنے میں اس کا باب ہمایوں ذمہ دار ہےلیکن چاند کواس کے ماموں راشد نے دانشمندی کی اور چالا کی سے اپنے مقصد کے حوصل کا ذریعہ بنایا ہےاوراس کے ہرممکن طور پر فائدہ اٹھاتا ہے۔

> ''راشد ترقی پسند نہ تھا مگر مصلحت پسند ضرور تھا۔اس نے انجینئری کے علاوہ بزنس بھی شروع کررکھا تھا۔مٹی، چونے اور پتھر کا بیوپار، وہ بزنس کے اصول بڑھا رہا تھااور جانتا تھا کہ چاندی جیسی تہذیب یافتہ خوبصورت اور فیشن ایبل لڑکیوں کا بھاؤ کتنا بڑھا ہوا ہے۔اتنا کی لوگ چاہیں تو ان کے سہارے لاکھوں کا کنٹرا یکٹ لے لیں۔75؎

بھارت کلامندر کا بداخلاق سیکریٹری چاند پر مہربان ہوا،تو راشد اپنے بزنس اور وفائدے کے لیے کوئی اعتراض نہیں کیا لیکن جب چاند،سنجیوا کے عشق میں گرفتار ہوجاتی ہےتو غزل کو چھوڑ کر سارا گھر چاند سے متنفر رہنے لگتا ہے چوں کہ چاند کے مزاج میں ضدی پن بھی شامل تھا۔

وہ سنجیوا کے ساتھ خودسری سے کام لیتی ہےاور سنجیوا چاند کواپنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔چوں کہ اس کے نصب العین چاند کی محبت سے زیادہ اہم ہیں۔اس طرح چانداس کی محبت نہ پا کر تپ دق کا شکار ہوجاتی ہےاور آخرکاراس کا انجام بھی موت پرواقع ہوتا ہے۔البتہ قیصر کا کردار مندرجہ بالا دونوں کرداروں کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہے چوں کہ اس کا کردار ایک باغی لڑکی کا ہے قیصر غزل اور چاند کی طرح گھٹ گھٹ کر سرد آہ لینے اور شکست کی صورت میں دم توڑنے کی حامی نہیں ہے بلکہ وہ اپنے باغیانہ عمل اور ردمل کے ذریعہ اس نظام

زندگی سے انتقام لینا چاہتی ہے۔ قیصرنئ اور زندہ نسل کی روشنی بن کر معاشرے کی رہنمائی کرنے کا عزم اور ارادہ رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تلنگانہ تحریک کے مجاہدوں کے ساتھ مل کر فرسودہ نظام کو اکھاڑ پھینکتی ہے اور ایک نئے نظام کی تعمیر کے لیے اپنے مشن میں لگ جاتی ہے۔اس طرح قیصر کا کردار زندگی کی توانائی اور حرکت و عمل سے لبریز ہوتا ہے ناول کے منتظر نامے پر بہت دیر تک قائم نہیں رہتا ہیں۔

کرانتی کا کردار بھی حرکت وعمل نہ صرف پر ہے بلکہ اس کے اندر توانائی اور پوری قوت موجود ہوتی ہیں۔ وہ اندھیرے دور کی نئ نسل کے نئے انقلاب عزائم کا غماز ہے۔ کرانتی روایات کا امین بن کر غزل اور راشد کی طرح مصیبت بھری زندگی بسر کرنا نہیں چاہتی۔ وہ حق گوئی سے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کے لے عوامی طاقتوں اور انقلابی دستوں کے ساتھ اپنا رشتہ منسلک کر لیتی ہے۔ وہ اپنا حق چھیننے اور ظلم وظالم دونوں کے خلاف جہاد کرنے کے لئے پوری طاقت کے ساتھ لڑنے کا عزم رکھتی ہے۔ کرانتی کے خیالات اور اس کے انقلابی رویے کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتی ہے۔

> ''میں لڑنے جارہی ہوں...... آج آپ نے نیوز
> پڑھی؟ ورنگل میں سات آدمیوں کو پھانسی دے دی گئ۔
> کہا آدمی کا خون اتنا سستا ہے۔ آنٹی؟ وہ کمرے میں ادھر
> ادھر گھوم کر کچھ چیزیں اپنی جیبوں میں بھر رہی تھی۔ کیا اپنے
> لیے حق اور انصاف مانگنے کی سزا ختم نہ ہوگی''۔76

''بارش سنگ'' ریاست حیدرآباد کے ایک گاؤں جیکٹ پلی، میں رہنے والے غیرب کسانوں اور مزدوروں کے حالات و مسائل کی داستان ہے۔ اس ناول کے کردار اس عہد کی دیہی زندگی کی سیاسی و سماجی صورتحال کی حقیقی عکاسی کرتے ہیں جس سے عصری دیہی زندگی اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اجاگر

ہوتی ہیں۔

احمد بی، بسم اللہ بی، پوشا، نرسیا، وینکٹ ریڈی، صابرمیا، نواب دلاور علی خان، غرض کہ ہر کردار ناول کی کہانی کو آگے بڑھاتا ہے اور اس عہد کی دیہی زندگی سے وابستہ واقعات وحالات کی ترجمانی کرتا ہے جس کی وجہ سے ریاست حیدرآباد کے اطراف واکناف دیہی زندگی کی حقیقی تصویر اجاگر ہوتی ہے۔

خواجہ بی مستان کی لڑکی ہے اور سب سے موثر نسوانی کردار ہے۔ وہ گاؤں کی ایک الہڑ دوشیزہ ہے۔ اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ کھیت میں مزدوری کرتی ہے اور وینکٹ ریڈی کے گھر کا بھی کام کرتی ہے۔ ایک روز وینکٹ ریڈی کی وحشی نظر اس پر پڑ جاتی ہے اور وہ زبردستی اس سے اپنی جنسی ہوس پوری کرتا ہے۔ اس کا باپ مستان اس کی حالت دیکھ کر سمجھ جاتا ہے لیکن وہ اسے نصیحت کرتا ہے کہ اپنے لٹ جانے کا تذکرہ کسی سے نہ کرے لیکن جب وہ اپنے بھائیوں کو دیکھتی ہے تو بے اختیار اس کا دل پکار اٹھتا ہے

''بھائی جلد اٹھ۔ یہ درانتی لے کر وینکٹ کا گلا کاٹ دے''۔ 77

لیکن وہ بات کہہ نہیں پاتی کیوں کہ وہ جانتی ہے کہ اس کے بھائیوں نے ریڈی کے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی تو دوسرے روز ان کی لاش ہی ملے گی اور گھر کے دیگر افراد کو بھی سزا بھگتی پڑے گی۔ وہ اس حادثے کے بعد ہمیشہ گم سم رہتی ہے۔ کیوں کہ وہ ریڈی کے ناجائز بچے کی ماں بننے والی ہے لیکن کسی طرح اس کی ماں اس کی شادی کر دیتی ہے۔ شادی کے بعد چھ ماہ کے اندر ہی وہ ماں بن جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کے سسرال میں پنچایت بیٹھتی ہے گو کہ اس کا راز فاش ہونے سے بچ جاتا ہے لیکن وہ ساس اور شوہر کی بے اعتنائی اور ظلم کا شکار رہتی ہے۔ شوہر اسے مارتا ہے۔ ساس اسے گالیاں دیتی ہے۔ کھانے کے لیے پڑوسیوں سے بھیک مانگنی پڑتی ہے۔ اس سے بدتر زندگی اور کیا ہوسکتی ہے۔ آخر کار وہ ایذا رسانیوں سے تنگ آ کر اپنے دو بچوں سمیت کنویں میں کود کر خودکشی کر لیتی ہے۔ وہ صرف حساس ہی نہیں بلکہ خوددار بھی ہے خواجہ بی کے متعلق

اس کے بھائی سلیم کی سوچ اس کے قد کو قاری کے سامنے بلند کرتی ہے

اس کی وہ خوبصورت نازک سی بہن جو تیز دھوپ میں
کام کرتے وقت سر پر ہاتھ رکھ لیتی ہے۔ ہمشیہ پھٹے کپڑے
پہنے رہتی ہے۔ سب بھائیوں کا حکم مان لیتی ہے۔ اس نے
کبھی کسی بات پر احتجاج نہیں کیا۔ اپنے حصے کا کھانا بھائیوں
کو کھلاتی تھی۔ وینکٹ چاری کو اس نے کا کبھی گالی نہیں
دی۔ اپنے شوہر اور ساس کی مار کھا کر سر جھکا لیتی تھی۔
چھوٹے سے بچے کو کمر میں باندھے دن بھر کام کرتی اور
رات کو بھوکی سو جاتی مگر اب اس میں اتنی جرأت کیسے آ گئی
کہ وہ بچوں سمیت باولی میں گر گئی''۔78؎

یہ جرات تو شاید ظلم وستم سے پریشان ہر کردار میں ہے لیکن عملی اقدام سے ہر کوئی بھاگتا ہے۔ خواجہ بی کے کردار کے ذریعہ جاگیردارانہ سماجی ڈھانچے میں عورتوں کی سماجی حیثیت ان کے حالات مسائل، جذبات واحساسات اور ذہنی اور رومانی گھٹن کی حقیقی تصویر پیش کی گئی ہے۔

رتنا جاگیردار طبقے کی عوتوں کی زندگی اور ان کے حالات و مسائل کی نمائندگی کرتی ہے۔ وہ ایک غیرب گھرانے کی لڑکی ہے۔ جو شہر میں ایک پروفیسر صاحب کے یہاں کام کر لیتی ہے۔ وینکٹ ریڈی اس کی موہنی شکل وصورت پر فدا ہو کر اس سے شادی کر لیتا ہے۔ دونوں کی عمر میں طویل فاصلے کے باوجود رتنا کے والدین غربت اور افلاس کی وجہ سے انکار نہیں کر پاتے۔ شادی کے بعد وہ وینکٹ ریڈی کے ساتھ گاؤں آتی ہے اور دھیرے دھیرے ساہوکاروں کے یہاں کے رسم ورواج سیکھ جاتی ہے۔ وہ اپنے ہم عمر سلیم کی جانب کشش محسوس کرتی ہے جو اس کے یہاں محنت ومزدوری کرتا ہے لیکن سماجی بندھن کی وجہ سے وہ اس جذبے کا

اظہار نہیں کر پاتی مستان جب وینکٹ ریڈی کا قتل کر دیتا ہے تو وہ بھری جوانی میں بیوی ہو جاتی ہے۔ وینکٹ ریڈی کا چھوٹا بھائی ملیشم ریڈی اسکی موت کے بعد شہر سے آ کر جائیداد کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ وہ رتنا پر بری نظر بھی رکھتا ہے اور آخر کار اسے جنسی ہوس کا شکار بنالیتا ہے۔ وہ شہر میں رتنا کو اپنی ترقی کے لیے بھی استعمال کرتا ہے اور اسے کوٹھے کی طوائف سے بھی بدتر بنا دیتا ہے۔

میں نے اپنے بچوں کو بھی بھلا دیا ہے وہ دہلی کے ایک
اسکول میں پڑتے ہیں۔ اسکول کے فارم پر لکھا ہوا ہے کہ ان
کے ماں باپ مر چکے ہیں۔ میں اپنے سارے بندھن توڑ چکی
ہوں۔ میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے لکڑی کی کٹھ پتلی کی ڈوری کھینچوں تو
ناچنے لگتی ہے۔ چھوڑ دو تو اوندھے منہ گر پڑتی ہے۔79

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہے کہ رتنا اپنے اوپر ہونے والے ظلم و ستم کو اپنا مقدر سمجھ کر حالات سے مجھوتہ کر لیتی ہے۔ اسے ہر رات ایک غیر مرد کے ساتھ ہم بستر ہونے میں جس ذہنی جسمانی کرب سے گذرنا پڑتا ہوگا اسے پیش کرنے کی گنجائش تھی لیکن مصنفہ نے اسے نظر انداز کر دیا۔ رتنا کبھی ظلم و ستم کے خلاف احتجاج نہیں کرتی۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کے اندر جرأت اور کود اعتمادی نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ رتنا کا کردار اعلیٰ طبقے کے ان گھناؤنے پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے جو پس پردہ ہیں۔

ملیش ریڈی گاؤں کے ساہوکاروں اور مہاجنوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ وینکٹ ریڈی کا چھوٹا بھائی ہے اور شہر میں وکالت کرتا ہے لیکن وینکٹ ریڈی کے قتل کے بعد وہ گاؤں آ جاتا ہے اور زمین و جائیداد کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ وہ اپنے بھائی سے زیادہ ظالم اور عیش پرست ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی بیوہ بھابھی رتنا پر بھی بری نظر رکھتا ہے اور زبردستی اس سے اپنی جنسی ہوس پوری کرتا ہے۔ تلنگانہ کے چھاپہ مار دستوں کے

ڈر سے وہ اپنے پورے خاندان کے ساتھ شہر چلا جاتا ہے اور کبھی کبھار گاؤں آ کر زمینوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد وہ وقت کی نبض کو پہنچانتے ہوئے کانگریس میں شامل ہو جاتا ہے اور حکومت میں وزیر بھی بن جاتا ہے۔ اس طرح آزاد ہندوستان میں بھی وہ غریب کسانوں اور مزدوروں کا استحصال جاری رکھتا ہے۔

> ''اب ملیشم گاؤں والوں کو خوب ستائے گا۔ وہ تو کمیونسٹوں کے ڈر سے شہر آ گیا تھا۔ پولیس والے تو اس کے دوست ہیں، ایک مرغی، گاؤں کی ایک لڑکی بس دو چیزیں حوالے کردو کسی پولیس والے کو۔ ملیش تو ان کاموں میں خوب استاد ہے'' ۔80

شہر میں وہ رتنا کو اپنی بیوی بتاتا ہے اور راج لکشمی جو کہ حقیقتاً اس کی بیوی ہے اس کو پاگل مشہور کر دیتا ہے یہی نہیں بلکہ وہ رتنا کو زبردستی اپنی کامیابی، دولت اور عیش وعشرت کے لیے ہر رات کسی غیر مرد کے بستر کی زینت بناتا ہے۔ ملیش ریڈی کے کردار کے ذریعہ جاگیرداروں اور ساہوکاروں کے ظلم وستم، معاشی استحصال اور عورتوں کی جنسی استحصال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس سے جاگیردارانہ ماحول ومعاشرت کا مکروہ پیرہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔

جیلانی بانو نے حیدرآباد کے اطراف واکناف پھیلے دیہاتیوں کی زندگی فرسودہ رسم ورواج توہمات، گاؤں کا مخصوص قانون سیٹھ ساہوکاروں کا ظلموستم غریب کسانوں کا ستحصال کو حقیقی معنوں میں پیش کیا ہے۔ ناول نگار نے ناول ایوان غزل کی ہی طرح بارش سنگ میں عورتوں پر ہونے والے جبر وزیادہ کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

## بانو قدسیہ کے نسوانی کرداروں کے مسائل

راجہ گدھ، بانو قدسیہ کا ایک فکر انگیز عصر حاضر کے موضوع پر لکھا گیا قابل قدر ناول ہے۔ جس میں

ایک محبت میں بے وفائی کے غم کی ذہنی اور باطنی کرب کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ناول کا اہم کردار سیمی شاہ ہے جو ماڈرن تعلیم یافتہ اور ذہین لڑکی ہے۔ ساتھ ہی نہایت حساس اور جذباتی بھی۔ گھر میں والدین کی بے توجہی اور لاپرواہی نے اس کے اندر انتہائی، محرومی اور عدم تحفظ کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ وہ ان ہی وجوہات کی بناء پر کسی نہ کسی سے جذباتی لگاؤں کی متلاشی رہتی ہے جو اسے دلی تسکین پہنچا سکے۔ ذہنی سکون کی خاطر وہ ہاسٹل میں پناہ ڈھونڈتی ہے جہاں نہ کسی رشتے کا دباؤ ہوگا اور نہ ہی جذباتی ذہنی تھکن محسوس کرنی پڑے گی لیکن جذباتی محبت کی تشنگی سے ہر جگہ پریشان کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ہم جماعت آفتاب کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے رشتے میں پائیداری نہیں ہونے کے سبب جلد ہی دونوں الگ ہو جاتے ہین۔ سیمی شاہ آفتاب کی بے وفائی کے بعد شدید قسم کے جذباتی بحران میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اور ایک ایسے ہمدرد مشفق کی فراق میں رہتی ہے جو اس کے زخمی جذبات پر مرہم رکھ سکے۔ اس درمیان ان تمام جذباتی تناؤ سے نجات پانے کے لیے آفتاب کے دوست قیوم کی رفاقت کو اس لیے قبول کر لیتی ہے کہ آفتاب کے ساتھ گذرے ہوئے ایک ایک لمحے کو تازہ کر سکے کیوں کہ آفتاب کی بے وفائی کے بعد سیمی شاہ کے لیے اپنے وجود کی معنویت باقی نہیں رہی۔ نہ اب اسے اپنے جسم کی پرواہ ہوتی ہے اور نہ ہی جان کی وہ کود کو اس قدر فراموش کر دتی ہے کہ قیوم کے جنسی مطالبے کے سامنے خاموشی سے خود کو اس کے سپرد کر دیتی ہے۔

> آفتاب نے یہ غزال شہر شکار کیا تھا۔ مجھے اس مردہ لاش
> کے کھانے کا حکم تھا وہ مریل نڈھال کافور کے درخت کے تلے
> نیم مردہ پڑی تھی۔ جب آفتاب کو اس کے جسم کی ضرورت نہ تھی تو
> اس کا جسم کوڑے کا ڈھیر تھا۔ اب اسے فکر نہ تھی کہ اسکوڑے کے
> ڈھیر پر کون اپنی غلاظت پھینکتا ہے۔ 81

ناول کا سب سے اہم کردار افضل ہے جو اپنے تشخص کی شناخت کے لیے بے قرار ہے بلکہ بدنصب طوائف کی زندگی گذارنے کے باوجود اس کے دل میں ہمیشہ ایک بہتر زندگی جینے کی خواہش زندہ رہتی ہے وہ اپنی وراثتی مجبوریوں کے باوجود اس ماحول سے رہائی چاہتی ہے وہ ایک گھائل مجروح شخصیت ہے جسے ہم عورت کے استحصال سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسے اپنی مظلومی ومحرومی کا پورا احساس ہے لیکن اس مظلومیت اور دردناک اذیت کے باوجود اپنے وجود اور اپنے تشخص کو قائم ودائم رکھنے اور اس کی حفاظت پر مصر ہے اب تک وہ جس ماحول کی زینت بنی ہوئی تھی اور اس سے نجات چاہتی ہے وہ شادی شدہ ہے اور ایک بچے کی ماں بھی لیکن اپنے حالات سے نا آسودہ اور بے اطمینانی محسوس کرتی ہے۔

افضل کی پوری زندگی کی جدوجہد اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ اس نے بہتر زندگی گذارنے کے لیے کوششیں بھی کی لیکن ناکامی ونامرادی ہاتھ آئی کیوں کہ اس کا شوہر اس کی زندگی کو اپنے طور طریقوں سے گزارنے پر مجبور کرتا تھا۔ وہ افضل کی زندگی کے ایک ایک پل کو اپنی خواہش کے مطابق استعمال کرنا چاہتا تھا لیکن افضل نے اپنی زندگی کی آزادی، دلی خواہشات اور اپنی سوچ وفکر کا سودا نہیں کیا اور اس کے عوض میں زندگی کی پرخار راہوں پر تن تنہا چلنے کو ترجیح دی۔ ناول کا ہیرو قیوم افضل کو اپنا سمجھنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہتا ہے:

> ''افضل کو اپنا سمجھنے کی طرف یہ وجہ تھی کہ شہر میں وہ اور
> میں بالکل تنہا تھے میں ذہنی اور جسمانی طور پر بیمار تھا۔ وہ
> میری ماں کی عمر کی تھی پھر میرا اور اس کا مسلک گدھ جاتی کا
> تھا۔ ہم دونوں مردار آرزوؤں پر پلے تھے۔'' 82

لیکن حالات اور سماج کے اس برتاؤ کے باوجود افضل کے اندر عورت زندہ رہتی ہے اور وہ قیوم کو ایک

شادی شدہ خوشحال زندگی گذارنے کا مشورہ دیتی ہے۔ اس ناول میں مرکزی کردار قیوم کے گرد کئی عورتوں کا دائرہ بنایا گیا ہے اوران عورتوں کی نفسیات زندگی کے تہہ درتہہ چھپے رازوں کوسماج کے آگے پیش کیا گیا ہے۔

☆☆☆

# حوالے


1۔ وقارعظیم، ''داستاں سے افسانے تک'' پرویز بک ڈپو دلّی،ص:76

2۔ بحوالہ، شمیم نکہت ڈاکٹر' پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار' نصرت پبلشرز لکھنو،1975ء،ص:84

3۔ بحوالہ، پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار' ص 86-85

4۔ ایضاً ص 86-87

5۔ ڈپٹی نذیر احمد دیباچہ' مراۃ العروس' کتابی دنیا، دہلی 2003ء، ص 3-4

6۔ ڈپٹی نذیر احمد' توبۃ النصوح' کتابی دنیا دہلی 2003ء' ص 24

7۔ سید عبداللہ ،سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء، چمن بکڈ پو، دہلی 1960ء' ص 270

8۔ بحوالہ: شمیم نکہت' پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار' 1975ء' ص 129

9۔ کے۔ کے کھلر' اردو ناول کا نگار خانہ' سیمانت پرکاشن نئی دہلی 1983ء' ص 39-40

10۔ بحوالہ ڈاکٹر شمیم نکہت' پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار' ص 137

11۔ پریم چند' ہم خرد و ہم ثواب' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی' 2001ء ص 146

12۔ پریم چند، بیوہ، قومی کونسل برائے قومی اردو زبان، نئی دہلی، 1923 -2001ء ص 67

13۔ پریم چند، بیوہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، 1923 تا 2001 ص 67

14۔ پریم چند، بیوہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 1903ء، ص 106

15۔ پریم چند، بازار حسن، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی 1923 -2001ء، ص 40

16۔ پریم چند، بازار حسن، ص: 87

17۔ پریم چند، نرملا، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، 2001ء، ص 7

18۔ پریم چند، نرملا، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، 2001ء، ص 30

19۔ پریم چند، نرملا، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، 2001ء، ص 171

20۔ پریم چند، چوگان ہستی، کلیات پریم چند، ص 246

21۔ پریم چند، غبن، کلیات پریم چند، ص 193

22۔ پریم چند، غبن، کلیات پریم چند، ص 195

23۔ منشی پریم چند، گئو دان، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1983ء، ص 7

24۔ پریم چند، گئو دان، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی 1983ء، ص 184

25۔ بحوالہ شمیم نکہت ، پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار 1975ء، ص 262

26۔ وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، پرویز بک ڈپو، دہلی، ص 100

27۔ کرشن چندر، شکست ، پہلا ایڈیشن ص 155

28۔ کرشن چندر، شکست ،ص155

29۔ کرشن چندر، ایک وائیلن سمندر کے کنارے، ص299

30۔ کرشن چند، پانچ لوفر،ص

31۔ کرشن چند، پانچ لوفر،ص51

32۔ کرشن چندر، ایک عورت ہزار دیوانے، دیباچہ

33۔ کرشن چندر، ایک وائیلن سمندر کے کنارے، ص166

34۔ کرشن چندر، ایک وائیلن سمندر کے کنارے، ص48

35۔ بحوالہ مہ نور زمانی بیگم، کرشن چندر کے ناولوں کے نسوانی کردار، ص81

36۔ بحوالہ مہ نور زمانی بیگم، کرشن چندر کے ناولوں کے نسوانی کردار، ص81-82

37۔ قرۃ العین حیدر، سفینۂ غم دل، ص40

38۔ بحوالہ ڈاکٹر محی الدین انصاری سالکؔ، ہندو پاک کی خواتین ناول نگار، 2008ء، ص66

39۔ نذر سجاد حیدر، ہوائے چمن میں خیمۂ گل، مرتبہ قرۃ العین حیدر، 2004ء، ص226

40۔ عصمت چغتائی سے ایک ملاقات۔ ماہنامہ شاعر، جلد47 شمارہ نمبر3، 1976ء

41۔ بحوالہ کے کے کھلر، اردو ناول کا نگارخانہ، سیمانت پرکاشن نئی دہلی، 1983ء، ص68

42۔ وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، دہلی، ص102

43۔ عصمت چغتائی ٹیڑھی لکیر۔ کلیات عصمت چغتائی مرتب آصف نواز، دہلی2002ء، ص 16

44۔ عصمت چغتائی مرتبہ آصف نواز، کلیات عصمت چغتائی ناول تحقیق و ترتیب کتابی دنیا، دہلی۔2002ء، دیباچہ

45۔ وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، ص151

46۔ بحوالہ غلام محی الدین انصاری سالک، ہندو پاک کی خواتین ناول نگار، دہلی2008ء، ص227

47۔ بحوالہ غلام محی الدین انصاری سالک، ہندو پاک کی خواتین ناول نگار، دہلی2008ء، ص227

48۔ بحوالہ غلام محی الدین انصاری سالک، ہندو پاک کی خواتین ناول نگار، دہلی2008ء، ص228

49۔ بحوالہ غلام محی الدین انصاری سالک، ہندو پاک کی خواتین ناول نگار، دہلی2008ء، ص229

50۔ کے کے کھلر، اردو ناول کا نگارخانہ، نئی دہلی، 1983ء، ص72

51۔ بحوالہ کے۔ کے کھلر اردو ناول کا نگارخانہ، نئی دہلی، 1983ء، ص73

52۔ قرأۃالعین حیدر،آگ کادریا،دہلی1984ء،ص 99

53۔ قرأۃالعین حیدر،آگ کادریا،دہلی1984ء،ص773

54۔ قرأۃالعین حیدر،آگ کادریا،دہلی1984ء،ص128

55۔ قرأۃالعین حیدر،آگ کادریا،دہلی1984ء،ص168

56۔ قرأۃالعین حیدر،آگ کادریا،دہلی1984ء،ص171

57۔ قرأۃالعین حیدر،آگ کادریا،دہلی1984ء،ص454

58۔ قرۃالعین حیدر،آخرشب کے ہم سفر،علی گڑھ1984ء،ص290

59۔ قرۃالعین حیدر،چاندنی بیگم،دہلی1999ء ص 17

60۔ بحوالہ غلام محی الدین انصاری سالک، ہندو پاک کی خواتین ناول نگار،نئی دہلی2008،ص242

61۔ کے کے کھلر،اردوناول کا نگارخانہ،نئی دہلی1983ء، ص 88

62۔ غلام محی الدین انصاری سالک، ہندو پاک کی خواتین ناول نگار، دہلی2008ء،ص228

63۔ خدیجہ مستور،آنگن،ایجوکیشن بک ہاؤس،علی گڑھ1983ء،ص29-29

64۔ خدیجہ مستور،آنگن،،علی گڑھ1983ء،ص14o

65۔ خدیجہ مستور،آنگن،،علی گڑھ1983ء،ص337

66۔ بحوالہ شبنم آرا،تانیثیت کے مباحث اوراردوناول،دہلی2008ء،ص229

67۔ خدیجہ مستور،آنگن،،علی گڑھ1983ء،ص125

68۔ خدیجہ مستور،آنگن،،علی گڑھ1983ء،ص236

69۔ خدیجہ مستور،آنگن،،علی گڑھ1983ء،ص304

70۔ محمد حامد علی خان،اردو کے اٹھارہ ناول،دہلی2008ء،ص76

71۔ خدیجہ مستور،زمین،علی گڑھ1983ء،ص236

72۔ خدیجہ مستور،زمین،علی گڑھ1983ء،ص238

73۔ غلام محی الدین انصاری سالکؔ،ڈاکٹر، ہندو پاک کی خواتین ناول نگار، دہلی2008ء،ص200-199

74۔ کے کے کھلر،اردوناول کا نگارخانہ، سیمانت پرکاشن،نئی دہلی1983ء،ص88

75۔ جیلانی بانو،ایوان غزل،ناولستان،نئی دہلی1976ء،ص85-86

76۔ جیلانی بانو، ایوان غزل، نئی دہلی 1976ء، ص 449

77۔ جیلانی بانو، ایوان غزل، نئی دہلی 1976ء، ص 27

78۔ جیلانی بانو، ایوان غزل، نئی دہلی 1976ء، ص 145

79۔ جیلانی بانو، بارش سنگ، اردو مرکز، حیدر آباد 1985ء، ص 245

80۔ جیلانی بانو، بارش سنگ، حیدر آباد 1985، ص 203

81۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ شان ہند پبلی کیشنز، نئی دہلی 1988، ص 137-138

82۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ شان ہند پبلی کیشنز، نئی دہلی 1988، ص 412

# باب پنجم

## اردو ناولوں میں ملازمت پیشہ خواتین کے مسائل

اردو ناولوں میں ملازمت پیشہ خواتین کے مسائل

اردو ناولوں میں ملازمت پیشہ خواتین کے مسائل جاننے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ملازمت کا مفہوم سمجھ لیں اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھ لیں کہ ہندوستانی معاشرے میں عورتوں کی معاشی صورتحال کیا رہی اور ملازمت کے حصول کے مقاصد کیا رہے۔

''ملازمت'' کی تعریف اردو لغت میں یوں ملتی ہے۔

''ملازم : پاس رہنے والا (مجازاً)،نوکر،خادم۔

ملازمت : (1) کسی کے پاس ہمیشہ رہنا،(2) خدمت،نوکری۔

ملازمت پیشہ : وہ شخص جس کا پیشہ نوکری ہو۔'' 1ے

یہی مفہوم فیروز الغت میں بھی درج ہے۔

انگریزی ڈکشنری Essential English Dictionary میں لفظ ملازمت کی وضاحت یوں ملتی ہے۔

Work : Works, working, worked:- people who work have a job which they are paid to do.

Edit by Gwyneth forے 2

ہندوستان کے جمہوری دستور کے مطابق عورتوں کو دفعہ ''15'' کے تحت ان کے تحفظ کے لئے خصوصی اختیارات دئے گئے ہیں۔جس سے وہ حکومت کے کسی بھی عہدے یا منصب کو حاصل کرنے کی اہل قرار پائیں۔دستور کی رو سے مرد اور عورت کو ملازمت اختیار کرنے کا حق دیا گیا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ تہذیب و تمدن کے ارتقائی دور میں مرد اور عورت دونوں نے جسمانی و دماغی صلاحیتوں کا استعمال کیا۔یہی وجہ ہے کہ جہاں مردوں نے بہت ساری چیزوں کی اختراع عمل میں لائی تو وہیں

بیشتر چیزوں کی ایجاد عورتوں نے کی۔کھانے پینے کا سامان مہیا کرنے کے لئے عورت نے ہی ذراعت کی بنیاد ڈالی اور جب مرد نے جانوروں کا شکار کیا تو اسے کھانے کے قابل بنانے میں عورت کی صلاحیتیں کام آئیں۔ پھران جانوروں کی کھالوں سے مختلف چیزوں کو کارآمد اور مفید بنانے کی کوشش بھی عورت نے ہی کی۔رہائش کے لئے خیمے جھونپڑیاں بنا کر انسان کو غاروں سے باہر نکالا وہیں درختوں کے ریشوں سے لباس بنا کر ایک اہم تہذیب کی بنیاد بھی رکھی، پیڑ پتوں سے علاج ومعالجہ کا نظام بھی اسی کی اختراع ہے۔دیگر یہ کہ اس نے ضرورت پر شکار بھی کیا اور پوری جسارت کے ساتھ میدان جنگ میں کارگذار رہیں۔اس طرح مرد کی جسمانی مشقت کے برابر خود بھی اس کے ہمراہ شامل رہیں۔

جیسا کہ پہلے ہیمذکورہ ہو چکا ہے کہ ہندوستان میں عورتوں کا تعلیم حاصل کرنا اور مردوں کے شانہ بہ شانہ ملازمت حاصل کرنا معیوب تصور کیا جاتا تھا لیکن جوں جوں زمانہ ترقی کرتا گیا عورتوں کا ملازمت حاصل کرنا اور عام زندگی میں حصہ لینے کے بارے میں سماجی اور معاشرتی نظام میں تبدیلی آئی ہے۔ملازمت کے ذریعہ ہندوستانی معیشت میں عورتوں کے کردار کو متاثر کرنے والے اہم عوامل میں دستکاریوں کا زوال، زراعت کا کئی خاندانوں میں تقسیم ہونا،شہروں کی طرف نقل مکانی کرنا، بڑھتی ہوئی ٹیکنیکل ترقی، جدید صنعت کا نشونما، تعلیم کا عام ہونا اور زندگی کے بڑھتے ہوئے مصارف ہیں۔ان نامساعد حالات نے عورتوں کو روزگار حاصل کرنے کی دوڑ میں لا کھڑا کیا ہے۔عورتوں کی ملازمت حاصل کرنے کے باوجود ابتدا سے تا حال ان کے ساتھ ہمیشہ ہی سے استحصال کیا گیا انھیں ہنرمند یا نیم ہنرمندانہ قسم کے کام تک محدود رکھا گیا۔انہیں مردوں کے مقابلے میں کم اجرت دی جاتی رہی۔عورتوں کی اجرت میں کمی کی ایک وجہ گھریلو ذمہ داریاں بھی سمجھی جاتی رہیں۔

ان عوامل کے علاوہ عورت کی معاشی محکومی، مردوں کے زیر سرپرست رہنے کا رجحان اور مظلومی کی وجہ سے عورت کا استحصال ہوتا رہا ہے اور یہ بات سماجی انصاف اور معاشرتی نظام کے تحت حقوق کی منافی ہے۔

کارل مارکس سے لیکر گاندھی جی نے مرد اور عورت کے درمیان امتیاز برتنے کی سخت مخالفت کی ہے۔ سماج کی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں تمام انسان اپنی صلاحیتوں کے ذریعہ مملکت کی ترقی میں تعمیری کردار ادا کریں۔ عورتوں کی مخفی صلاحیتوں اور قابلیتوں کے اعتبار سے انھیں پورے مواقع فراہم ہونے چاہیے۔

عورتوں کی آزادی کی کوشش ہندوستان کی جنگ آزادی کی جدوجہد کے دوران ہی شروع ہوئی۔ ہندوستانی عورت جو کہ ہمیشہ چار دیواری کے اندر قید رہا کرتی تھی اور اپنے وجود کو گھر کی چار دیواری میں محدود کرلیا تھا۔ اس نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں حصہ لے کر ساری دنیا کو چونکا دیا۔ حالانکہ اس دور میں بھی ہندوستانی عورتوں کی ترقی میں بعض سماجی اور مذہبی قوانین حائل رہے۔ ان مذہبی امور کی اصلاح پر بعض ہندوستانی مفکرین نے توجہ دی۔ ان مفکرین اور مصلحین میں گاندھی جی، راناڈے، رابندرناتھ ٹائیگور، بدرالدین طیب جی، راجہ رام موہن رائے وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں۔

راجہ رام موہن نے رائے ستی کی رسم کے سخت مخالفت کی۔ انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے زریعہ ہندوستانی عوام کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ رسم انسانیت سوز حرکت ہے۔ راجہ ران موہن رائے کے اصلاحی نظریئے کی وضاحت کرتے ہوئے ہاشم قدوائی لکھتے ہیں:

> ''انہوں (راجہ رام موہن رائے) نے ہندو قوانین وراثت شادی اور دوسرے معاملوں میں ہندو عورتوں کو حقوق دیئے جانے کی زبردست وکالت کی انہی کی کوشش سے ستی کی وحشیانہ رسم کا خاتمہ ہوا۔ انہوں نے مشرقی اور مغربی سماجی قدروں میں امتزاج پیدا کیا آفاقی مذہب اور مسلک انسانیت پر زور دیا''۔ 3

صنعتی انقلاب اور انیسویں صدی کی سائنسی ترقیوں نے بڑی حد تک عورتوں کی حیثیت پر اثر ڈالا۔ عورتوں کو بھی آزادیٔ نسواں اور ان کے جائز حقوق کا احساس ہوا۔ چنانچہ ہندوستان میں عورتوں کے لئے آواز اٹھانے والوں میں ''اینی بیسنٹ'' پیش پیش رہیں۔ ان کے ساتھ سروجنی نائڈو، کستور با گاندھی، بی اماں اور مسز وجئے لکشمی پنڈت نے عورتوں کے حقوق منوانے کی سعی کی۔ اس طرح جدوجہد آزادی کی تحریکوں میں عورتوں کے لئے انقلاب کے دروازے کھول دیئے گیے۔ محمد ہاشم قدوائی آگے لکھتے ہیں:

''برطانوی سامراج اور سرمایا دارانہ نظام کا ہندوستان
کے سماجی حالات پر زبردست اثر پڑا۔ اب قانون بنانے
والی جماعتوں نے بتدریج ایسے قانون پاس کئے کہ جن سے
ہندوعورتوں کی سماجی پوزیشن پہلے سے بہتر ہوئی''۔ 4

برطانوی سامراج میں عورتوں کے لیے مردوں کے ساتھ ساتھ حق رائے دہی کا حق دلانے کی کوشش بھی کی گئی۔ جس کو برطانوی سرکار نے چند شرائط کے ساتھ منظور کرلیا۔ عورتوں کے حق میں یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ ڈاکٹر شمیم نکہت لکھتی ہیں:

''آخرکار 1936ء میں پہلی بار ہندوستانی عورتوں نے ووٹ دینے کا حق حاصل کرلیا'' 5

عورت ہندوستانی سماج میں انگریزوں کی حکومت سے پہلے کسی نہ کسی طرح خاندان کی مدد کرتی تھی۔ انگریزوں نے نوکری حاصل کرنے کے لئے انگریزی زبان اور چند مخصوص ہنر کو ضروری قرار دیا۔ جس کا جزوی اثر مردوں پر اور مکمل اثر عورتوں پڑا۔ عورتیں جو گھریلو صنعت کے ذریعہ دولت حاصل کرتی تھیں، وہ ختم ہوگئی، عورت کی حالت پست سے پست ہوتی چلی گئی۔ صغرا مہدیہندوستان میں عورتوں کی حیثیت کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

''ہندوستان میں عورتوں کی زندگی کے کچھ مخصوص
پہلوؤں جیسے بچپن کی شادی، ناخواندگی کی شرح اور شرح
اموات میں زیادتی اور روزی کمانے کے موقع کی کمی سے یہ
صاف ظاہر ہے کہ یہاں سماج میں عورتوں کا درجہ مردوں
کے مقابلے میں کم تر ہے''۔ 6

ہندوستانی سماجی ڈھانچہ ''پدر سری نظام'' پر مشتمل ہے۔ اس نظام کے تحت گھر کے اندر اور باہر مرد کا ہی رعب و دبدبہ چلتا ہے۔ عورت گھر کے تمام کام کرتی ہے لیکن اس کے کام کی کوئی پذیرائی نہیں ہوتی۔ اس کے کام کو غیر پیداواری اور غیر معیاری کام مانا جاتا رہا ہے۔

گھر کے باہر کے مختلف اداروں پر بھی مرد کی ہی اجارہ داری رہی، عورتوں کو مخصوص عہدے یا مخصوص کام ہی دیئے جاتے رہے ہیں، کم اجرت پر مزدوری کروائی جاتی ہے۔ کم تنخواہ پر زائد کام لیا جاتا ہے۔ چونکہ پدر شاہی نظام کا یہی اصول متعین ہیں۔ مثلاً:

''پدر شاہی نظام'' میں مرد کو حاکمیت اور عورت کو ماتحت
کا موقف حاصل رہتا ہے۔ اس حاکمیت کے کئی اقسام
ہیں۔ جیسے امتیازات، خراب برتاؤ کنٹرول تذلیل ظلم (جبر)
گھریلو تشدد کام کی جگہ پر ہراسانی وغیرہ''۔ 7

ہندوستان کے دستور کی رو سے عورت اور مرد کو ہر میدان میں مساوی حقوق دیئے گئے ہیں، لیکن عملی طور پر ان میں واضح طور پر امتیاز کیا جاتا ہے، عورت اور مرد کے دائرہ کار کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ عورت سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ خانہ داری کے امور انجام دیں۔ گھر میں بیوی اور ماں کی حیثیت سے گھر کی دیکھ بھال کرے۔ تہذیبی طرز فکر کے مطابق بچوں کی تربیت و پرورش کرے۔

عورتوں کے نسوانی فطری تقاضوں پر بچپن سے ہی زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ بچپن ہی سے حالات سے مطابقت پیدا کرنا اور اطاعت شعاری کا شیوہ اپنانے کی تعلیم دی جاتی رہی ہے۔ اسی لیے ہمارے معاشرے میں عورتیں کسی بھی معاملے میں اپنی الگ رائے رکھنے سے ہچکچاتی ہیں۔

عورت کھیتوں میں کام کرے یا فیکٹری میں یا مکان کی تعمیر کے کاموں میں حصہ لے یا دفتر کے امور انجام دے اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ خانہ داری کا کام اسی طرح انجام دیں جس طرح گھریلو عورتیں کرتی ہیں۔ اس طرح ملازمت پیشہ خواتین کے کاندھوں پر دہرا بوجھ پڑ جاتا ہے۔ دوسری طرف ہندوستانی سماج میں مرد حضرات کھانا بنانا، گھر اور آفس کی سجاو کرنا، کپڑے سینا وغیرہ جیسے فنون کو پیشے کے طور پر اختیار تو کر لیتے ہیں لیکن گھر میں بیوی کے ساتھ ان ہی کاموں کو کر کے ہاتھ بٹانا کسر شان سمجھتے ہیں۔

عصر حاضر میں معاشی صورتحال کی وجہ سے مرد و عورت دولت حاصل کرنے کی دوڑ میں لگے ہیں دولت حاصل کرنے کے لئے جو مقابلہ آرائی ہے اس میں صنف نازک کو کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عورتوں کے مسائل کے حل کے لئے مردوں نے ہی آواز اٹھائی، جنسی تفریق مٹا کر دونوں کو ظلم، بربریت نا انصافی جیسی برائیوں کو ختم کرنے میں ایک دوسرے کا ساتھ دینا ضروری ہے۔ بابائے قوم مہاتما گاندھی نے عورتوں کے متعلق مردوں کو اس طرح باور کرایا تھا:

> ''مرد عورتوں کو اپنا غلام یا کنیز سمجھنے کے بجائے دوست،
> ساتھی اور ہمدرد سمجھیں اور ان کو برابر کے حقوق دیں تا کہ ان
> کی ذہنی اور دماغی قوتیں پوری طرح سے اُجاگر ہو سکیں اور وہ
> بھی مردوں کے ساتھ ملک کی ترقی کی جدوجہد میں برابر کی
> شریک ہو سکیں''۔ 8

عصری تعلیم و ہنر مندی کی طرف ہندو قوم کے برخلاف مسلمان قوم تذبذب کا شکار رہی اِن حالات میں عورتوں کی تعلیم و تربیت اور ملازمت کے مواقع صفر کے برابر تھے۔ حتٰی کہ سرسید اور ان کے رفقاء میں بیشتر افراد کی تعلیمی اصلاحی کوششیں مردوں تک ہی محدود تھیں۔ چونکہ یہاں کے لوگ انگریزوں سے متنفر تھے اور اسی نفرت کی وجہ سے مغربی علوم سیکھنے کو عار سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ جب سرسید احمد خاں مغربی اور جدید علوم وفنون سیکھنے پر زور دے رہے تھے، تب اُنہیں بے پناہ مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا اس تناظر میں سرسید اور ان کے رفقاء خواتین کی تعلیم کو ضروری قرار دینا قبل از وقت تصور کرتے تھے۔

خواتین کی تعلیم پر سرسید نے جامع انداز میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

''میری دلی آرزو ہے کہ عورت کو بھی عمدہ اور اعلیٰ درجے کی تعلیم دی جائے۔ مگر موجودہ حالت میں کنواری عورت کو تعلیم دینا ان پر سخت ظلم کرنا ہے اور ان کی تمام زندگی کو رنج و مصیبت میں مبتلا کر دینا ہے عورت کی تعلیم قبل مہذب ہونے مردوں کے لئے نہایت ناموزوں اور عورتوں کے لئے آفت درماں ہے۔ یہی باعث ہے کہ میں نے آج تک عورتوں کی تعلیم کے لئے کچھ نہیں کہا''۔ 9

سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء نے عورتوں کی تعلیم کو دوسرے درجہ پر رکھا کیونکہ وہ سماج کو مغربی طرز زندگی کی خرابیوں سے پاک رکھنا چاہتے تھے۔ مغرب میں تعلیم کو صرف اور صرف ذریعہ معاش کے لئے حاصل کیا جاتا ہے۔ سرسید عورتوں کو عصری تعلیم دلا کر ملازمت کی مصیبت میں مبتلا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ جیسا کہ سرسید کا خیال تھا جب مسلم معاشرہ کے مرد تعلیم یافتہ ہوجائیں گے پھر خواتین کو بھی تعلیم کی خواہش پیدا ہوگی۔ چنانچہ سرسید کی تعلیمی تحریک کے نتیجہ میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ایک گروپ تیار ہوا اس گروپ نے تعلیم نسواں کا

آغاز اور اصلاح نسواں کا بیڑا اُٹھایا اِن میں سجاد حیدر یلدرم، شیخ عبداللہ، غلام الثقلین ممتاز علی وغیرہ نے تعلیم نسواں کی شروعات میں جدو جہد کی۔ سر سید احمد خاں نے مسلمانوں میں عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی، جو آج اردو ادب میں سر سید تحریک کے نام سے مشہور ہے اس تحریک کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو ذہنی، معاشرتی اور اخلاقی پستی سے نکالنا تھا۔

انگریزیوں کی ہندوستان میں آمد مغل حکومت کے خاتمہ اور جنگ آزادی 1857ء کی شکست نے مسلمانوں کو ذہنی اور معاشی طور پر بدحال کر دیا تھا۔ تعلیم کی کمی اور کسی فکری نظام کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ پستی کی طرف مائل تھے سر سید اور ان کے رفقاء نے عقل فہم ادراک وادب کے ذریعہ مغموم قوم میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کی ان کے علاوہ سیاستداں بدرالدین طیب جی نے مسلمانوں کی تعلیمی وتہذیبی بیداری کی کوشش کی۔

ان کے بعد کئی روشن خیال مرد و خواتین کا ایک دانشور طبقہ نہ صرف تعلیم بلکہ بے شمار سماجی لعنتوں سے چھٹکارا دلانے کی کوششیں کی۔ جیسے جیسے تعلیم عام ہوئی ملازمتوں کے حصول میں عورتیں بھی مردوں کے شانہ بہ شانہ چلنے لگیں۔ عورتوں نے پیشہ معلّمی، طب اور دوسری گھریلو صنعتوں سے نکل کر فیکٹریوں اور آفسوں کا رخ کیا۔ صنعتی انقلاب نے عورتوں کو ان کی فطرت کے خلاف دن رات ہر حال میں محنت کرنے پر مجبور کیا۔ عورت پر گھر کی ذمہ داری، بچوں کی پیدائش اور پرورش کے ساتھ ساتھ محنت و مزدوری کی دوہری ذمہ داری ڈال دی گئی۔ اس بات کا اظہار کمیونسٹ انقلاب کے رہنما لینن (Lenin) نے اپنی کتاب On Emancipation of women میں اس طرح کیا ہے:

'' آبادی کی پوری زندگی میں جو تبدیلی خاص طور پر
فیکٹری کھلنے سے آجاتی ہے۔ اس کے بارے میں یہ کہنا
پڑے گا کہ پیداوار میں عورتوں اور نوجوانوں کو شامل کرنا

درحقیقت ایک ترقی پیشہ قدم ہے۔اس سے انکارنہیں کیا
جاسکتا کہ سرمایہ داری کارخانہ اس زمرے کے مزدوروں کو
(عورتوں اورنوجوانوں کو) خاص طور پر سخت مشکل حالات
میں رکھتا ہے۔ جب کہ ان کے لئے بالخصوص ضروری ہے
کہ کام کے گھنٹے کم کئے جائیں جس جگہ وہ کام کرتے ہیں
اور جن حالات میں مزدوری کرتے ہیں۔ ان کو بہتر بنایا
جائے وغیرہ ۔لیکن عورتوں اورنوجوانوں کو صنعتی مزدوری
میں شامل ہونے کی بالکل ممانعت کردینا یا پھر ان کو ایسے
پدری اقتدار کے خاندان میں زندگی گزارنے دینا جو اس
طرح کی محنت کو خارج ازامکان سمجھے یہ رجعت پسندانہ اور
یوٹوپین(Utopian) ہوگا۔ جو اشخاص خاندانی رشتوں
کے محدود دائرے سے پہلے کبھی باہر نہیں نکلے،ان کو پدری
اقتدار کے خاندان سے علاحدہ کرنے سے اور سماجی پیداوار
میں ان کو شامل کرنے سے ان کی ترقی تیز رفتار ہوگی۔یہ عمل
ان کی خودمختاری کو بڑھاتا ہے''۔ 10؎

عصرحاضر میں نوکری کرنا عورت اور مرد دونوں کے لیے لازمی ہوگیا ہے۔جب بیوی،شوہر کے ساتھ ملازمت اختیار کرتی ہے تو خانہ داری کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔خانہ دار عورتوں کے لیے صرف اُمور خانہ داری کی ذمہ دار ہوتی ہے جبکہ ملازمت پیشہ خواتین کو دوہری ذمہ داری اٹھانی پڑتی ہے۔فطرت نے مرد اور عورت کی جسمانی ساخت کو مختلف بنایا ہے،جس کی وجہ سے عورتیں وہی کام انجام دے سکتی ہیں جس کو ان کی جسمانی

طاقت برداشت کرسکتی ہے۔دوسری طرف مرد حضرات بھی فطرتاً وہی کام سرانجام دے سکتے ہیں جوان کے بس میں ہےاور دونوں کے لیےاپنے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔جس کی وجہ سے وہ کوئی بھی کام اپنی طاقت سے زیادہ نہیں کر سکتے ہیں ۔اسی لیے اس میں عورت اور مرد کے فطری نقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عورتوں کو رعائتیں دی جانی چاہیئے ۔مساوی حقوق کے ساتھ مساوی فرائض ادائیگی بھی مرداور عورت دونوں پرلازمی ہے اس لیے اگر دونوں کو اپنی اپنی زمہ داریوں کا احساس ہوجائے اور مردانہ سماج بھی اس مسئلہ میں عورت کا ساتھ دےتو یہ مسئلہ نہ رہےلیکنہمارا معاشرہ اورسماج اس حقیقت کوتسلیم نہ کرپانے کی وجہ سےعورتوں کےحق میں زمہ داریوں کابوجھ بڑھ جاتاہےاورایسی صورتحال میں ملازمت پیشہ عورتوں کوکئی مسائل سے گزرنا پڑتا ہے۔

جب تک مسائل کا احاطہ نہ ہومسئلہ کاحل نہیں نکالا جاسکتا۔اس کے لئے دنیا کےتمام علوم میں ادب ہی ایک وسیع وسیلہ ہےجس کے ذریعہادیب ومفکراپنے خیالات اورافکار کےاظہار کےذریعے ان مسائل کی یکسوئی کی کوشش کرتے ہیں ۔ادیب چوں کہ سماج کا حساس اور باشعور فرد ہوتا ہے اس لیے اسے ہمارے معاشرتی اورتہذیبی عوامل کا شدیداحساس ہوتاہےاوروہ سماج میں ہورہی ناانصافیوں ،مظالم اورتشدد کےخلاف احتجاج کرکے ہماری توجہ ان مسائل کی طرف راغب کرتاہےتاکہان مسائل پرہماری نظر جاسکے۔اردوادب میں صنف ناول ہی اسی صنف رہی ہےجس میں ہمارے معاشرے کے بےشمارمسائل کوبڑی آسانی سےسمویا جاسکاہےیہی وجہ رہی کہ اردوناول نگاروں نے انسانی زندگی کے بےشمارمسائل کواپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ناول کی اسی وسعت اوراہمیت کےپیش نظروقارعظیم لکھتے ہیں:

"۔۔۔۔ناول زندگی کی وسعتوں کا حامل ہے"۔یعنی
زندگی کواس طرح ادب کےسانچے میں ڈھالنا کہ اس کی
ساری وسعتیں اور گہرائیاں اس سانچے میں سماسکیں،

ادب کی کسی اور صنف کے ذریعہ سے یہ ممکن نہیں

سوائے ناول کے'' 11؎

اصناف نثر میں ناول کو سچی زندگی کا ترجمان کہا گیا ہے یہ مکمل طور پر زندگی اور سماج کے نشیب وفراز اورتبدیلیوں کی تصویر پیش کرتا ہے ناول میں ہر دور کے مسائل واقعات اور انسانی جذبات کو حقیقی رنگ میں دکھایا گیا ہے۔اس صنف میں حب الوطنی، ظلم تانا شاہی، زمینداروں کا ظلم، دیہات کی زندگی،شہری زندگی، حسن و عشق،نفرت وانتقام، طبقاتی کشمکش، سماجی نابرابری، اورخواتین کو درپیش مسائل ملتے ہیں۔

ادبی فن پاروں یعنی داستانوں سے افسانوں تک تمام اصناف میں عورت کے کردار کی بڑی اہمیت رہی ہے داستانوں کے نسوانی کردار میں بھی ہنر مندی، حکمت ودانش مندی جیسے اوصاف ملتے ہیں۔ الف لیلوی حسینہ بھی کوئی کارنامہ سرانجام دیتے ہوئے نظر آتی ہے۔اس سے آگے زندگی کی حقیقی ترجمانی کرنے والی صنف ''ناول نگاری'' میں تو عورت کو قوم کی معمار، انقلاب کی علمبردار، سرمایہ دارانہ نظام کی حصہ دار اور صنعت و حرفت کی ہنر مند خاتون کے طور پیس کیا گیا ہے۔اسی طرح زندگی کی گاڑی کو چلانے میں مرد اور عورت کو مساویانہ طور محنت ومشقت کرتے دکھایا گیا ہے۔ ناول نگاروں کا مقصد بھی یہیر ہا ہے کہ وہ اپنی تخلیقات کے ذریعہ سماج میں پائی جانے والی خرابیوں کو بے نقاب کرتا ہے تا کہ ان کی اصلاح ممکن ہو سکے۔ چنانچہ

جان کالزوری نے ناول نگار کوایسا مصلح قرار دیا ہے جو

ہدی کے کوچے میں ''چراغ سرراہ'' لے کر خرابیوں کو بے

نقاب کرتا ہے۔12؎

اردو کے پہلے ناول نگار نذیر احمد نے اپنی ناول نگاری کا اولین مقصد بھیعورتوں میں علم وہنر کا فروغ بتایا ہے۔ وہ مرد اور عورت کو زندگی کی گاڑی کے دو پہیوں سے تعبیر کرتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''دنیا کی گاڑی کا جب تک ایک پہیہ مرد کا اور دوسرا
عورت کا نہ ہو چل نہیں سکتی۔۔۔۔۔مرد کتنا ہی ہوشیار کیوں
نہ ہو ممکن نہیں کہ عورت کی مدد کے بغیر گھر چلا سکے''۔ 13؎

نذیر احمد نے زندگی اور گھر کی خوشحالی اور ترقی کیلئیمرد وعورت دونوں کی کاوشوں پر زور دیا ہے۔اس دور کا عام خیال تھا کہ عورتیں صرف خانہ داری کے کام کریں اور مرد ذریعہ معاش حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کریں لیکن نذیر احمد نے اس بات کا خلاصہ کیا کہ مرد کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی وقت ضرورت گھر کے خرچ کے لئے کام کرتی ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''مرد جو باپ ہوتے ہیں ، کوئی محنت مزدوری سے
کماتے ہیں کوئی پیشہ کرے،کوئی سوداگری،کوئی نوکری غرض
جس طرح بن پڑتا ہے ۔۔۔۔عورتیں جو ماں ہوتی
ہیں،اگر باپ کی کمائی گھر کے خرچ کو کافی نہیں ہوتی بعض
اوقات خود بھی محنت کیا کرتی ہیں۔کوئی ماں سلائی کا کام لیتی
ہے کوئی گوٹا بنتی ہے کوئی ٹوپیاں کاڑھتی ہے۔، یہاں تک
کہ کوئی مصیبت کی ماری ماں چرخہ کات کر، چکی پیس کر ماما
گری کر کے بچوں کو پالتی ہے''۔ 14؎

نذیر احمد نے اپنےناولوں کے ذریعے اس بات پر روشنی ڈالی کہ جن عورتوں نے اپنی صلاحتیوں کو جانا اور ساے کم میں لایا ان کی ہمیشہ سے قدر رہی ہے چنانچوں عورتوں میں حوصلہ پیدا کرنے کے لیے انھوں اس وقت کی ملکہ وکٹوریہ کی مثال پیش کی اور جنھوں نے اپنی انتظامی صلاحیتوں کی بدولت برطانوی حکومت کیقیادت کرتی رہی ہے۔ناول ''مرأۃ العروس'' کے پہلے حصہ میں عورتوں میں خوداعتمادی پیدا کرنے کے

لیے ملکہ وکٹوریہ کی انتظامی صلاحیت کی ستائش کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''جن عورتوں نے وقت کی قدر پہچانی اوراس کو کام کی باتوں میں لگایا، ہنر سیکھا، لیاقت حاصل کی، وہ مردوں سے کسی بات میں پیچھے نہیں رہیں۔ بلکہ وکٹوریہ کو دیکھو عورت ذات ہو کر کس دھوم اور کس شان اور کس ناموری اور کس عمدگی کے ساتھ اتنے بڑے ملک کا انتظام کررہی ہیں''۔ 15؎

نذیر احمد نے اپنے ناول ''مرأۃ العروس'' کی مرکزی کردار اصغری کو تعلیم یافتہ، مہذب، شائستہ، ہنر منداور امور خانہ داری سے واقف ہونے کی وجہ سے ایک کامیاب زندگی گزارنے والی بتایا ہے اور دوسری طرف اکبری نامی ایسے کردار کی تخلیق کی جو اپنی جہالت اور نااہلی کی وجہ سے اپنے گھر کو جہنم بنالیتی ہے۔ اسی طرح انھوں نے اپنے دوسرے ناول ''بنات النعاش' کی مرکزی کردار ''اصغری'' کو معلّمہ بتایا ہے۔اس طرح ان کے خیال میں عورتوں کی ملازمت کی اہمیت شروع سے رہی ہے لیکن انھوں نے یہ بھی کہا کہ عورتوں کے تعلیم حاصل کرنے کا مقصد صرف نوکری کرنا نہیں بلکہ زندگی کے بے شمار مسائل کا حل تلاش کرنا ہے اور زندگی کو بہتر بنانا ہے چنانچہ وہ عورتوں کی تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بعض نادان عورتیں خیال کرتی ہیں کہ کیا لکھ پڑھ کر ہم کو مردوں کی طرح نوکری کرنی ہے لیکن اگر کسی عورت نے لکھ پڑھ لیا ہے اوراس نے نوکری نہیں کی تو اس کا لکھنا پڑھنا اکارت بھی نہیں گیا اس کو اور بہتر ے فائدے پہنچے جن کے مقابل میں نوکری کی کچھ بھی حقیقت نہیں''۔ 16؎

نذیر احمد کے بعد اردو ناول نگاری میں رتن ناتھ سرشار کا نام آتا ہے سرشار نے فسانۂ آزاد لکھ کر آنے

والی نسل کے لیے لکھنو کی زوال آمادہ جاگیردارانہ تہذیب کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے۔انھوں نے بدلتے ہوئے حالات،انگریزوں کی حکومت کے قیام کے اثرات،نوابوں کی کھوکھلی اور بناوٹی زندگی اور سماج میں پائے جانے والی بے چینی کو پیش کیا ہے۔

فسانہ آزاد میں رتن ناتھ سرشار نے حسن آراء کے ذریعہ عورتوں تک یہ پیغام پہنچانا چاہا کہ عورتیں بھی مردوں کے برابر اعلیٰ تعلیم حاصل کریں تاکہ میاں بیوی ایک دوسرے سے مشورہ کرسکیں علمی واخلاقی مسائل پر گفتگو و بحث کے ذریعہ زندگی کو خوشحال بنا سکے۔ان کا خیال تھا کہ کامیاب ازدواجی زندگی کے لئے میاں بیوی کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔اپنے اس خیال کو انھوں نے حسن آراء کی زبان لطیف انداز میں پیش کیا ہے:

''جو میاں اور بیوی دونوں تعلیم یافتہ ہوں تو خوب
ہی مزے سے کٹے۔۔۔۔۔لطف یہ ہے کہ میاں کتاب
پڑھ رہے ہیں بیوی مزے سے سن رہی ہے بیوی نے
پڑھا کبھی میاں کو سنایا کبھی اخلاق پر بحث ہو رہی ہے کبھی
شعروشاعری کا چرچا ہے۔۔۔یہ ان کو صلاح نیک دیں
وہ ان کو مشورہ دیں''۔ 17

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رتن ناتھ سرشار تعلیم نسواں کے حق میں تھے۔وہ چاہتے تھے کہ عورتوں کے لئے الگ سے مدارس قائم کئے جائیں تاکہ عورتیں بھی ریاست کی ترقی میں اہم رول ادا کرسکے۔وہ ناول'' فسانۂ آزاد'، میں عورتوں کی تعلیم کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار حسن آراء کے ذریعہ یوں کرتے ہیں:

''ہماری دلی آرزو یہ ہے کہ ہم مدرسہ نسواں قائم کریں
۔میں نے ایک لکچر لکھا ہے میاں آزاد اگر اصلاح دے دیں
تو میں کسی دن یہاں کی شریف زادیوں کو جمع کر کے لکچر دوں۔

شاید کسی کے دل پر اثر کرے اور کوئی نتیجہ نکلے‘‘۔ 18؎

خواتین ناول نگاروں میں نذر سجاد حیدر کا نام ابتدائی ناول نگاروں میں آتا ہے، نذر سجاد حیدر نے اپنے ناولوں میں سیاسی وسماجی تبدیلیوں کی صحیح عکاسی اور آئینہ داری کی ہے وہ ’’تعلیم نسواں کی کٹر حامی تھیں۔ وہ اکثر اپنے ناولوں کے ذریعے عورتوں کو تعلیم کے ذریعہ حالات سے مقابلہ کرنے کا مشورہ دیتی ہیں۔ان کی تخلیقات میں نسوانی کرداروں کو نہ صرف علم کے زیور سے آراستہ کر کے پیش کیا گیا ہے بلکہ انہیں ملازمت کرتا ہوا بھی دکھا گیا ہے۔ ناول ’’اختر النساء بیگم‘‘ کی مرکزی کردار اختری بیگم کو ڈاکٹر اور اسکول انسپکٹر کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کے دوسرے ناول ’’حرماں نصیب‘‘ میں بھی مرکزی نسوانی کردار فیروزہ بھی حالات سے مقابلہ کرتے ہوئے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرتی ہے۔ اور اپنے آپ کو خدمت خلق کے لئے وقف کر دیتی ہے۔ ان کے ایک اور ناول ’’ثریا‘‘ میں بھی مرکزی کردار ’’ثریا‘‘ اپنے بیٹے کی پرورش کے لئے ملازمت اختیار کرتی ہے، اقتباس دیکھیے:

’’اسکول میں ٹیچری کر کے بچے کی پرورش کی۔۔علاوہ
ٹیچری میں نے نرسنگ مڈوائفری بھی سیکھی‘‘۔19؎

نذر سجاد حیدر نے نہ صرف قوم کی عورتوں میں علم و ہنر سیکھنے کا شعور پیدا کیا بلکہ عورتوں کی مجبوری لاچاری اور بے کسیکے خلاف اٹھ کھڑے ہونے اور تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے کی طرف توجہ بھی دلائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے ناول ’’اختر النساء بیگم‘‘ کے اختتام عورتوں کی تعلیم کی اہمیت وضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے:

’’اگر بہتری قوم منظور ہے تو سب سے پہلے جہاں تک
ممکن ہو سکے تعلیم نسواں عام کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اس کا

انتظام کرلیا تو سمجھنا چاہئے کہ تمام قوم سنبھل گئی‘‘۔20ے

قرۃالعین حیدر نے بھی اپنی والدہ کی طرح اپنے ناولوں میں عورتوں کے مختلف مسائل اور ان کی الجھنوں کو پیش کیا ہے۔ان کا شاہکار ناول ’’آگ کا دریا‘‘ ہے یہ ناول ڈھائی ہزار برسوں پر محیط اور انتہائی الجھی ہوئی ہندوستانی تاریخ کے چار مختلف ادوار پر محیط ہے۔انھوں نے ہر دور کی تہذیبی و تمدنی وثقافتی اصولوں کو چار مختلف کہانیوں میں کے ذریعے پیش کیا۔اس ناول کی مرکزی کردار ہندوستانی تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف روپ میں نظر آتی ہے۔جو کبھی ہندو،کبھی مسلمان،کبھی شریف اور کبھی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے تو کبھی بھکارن اور کبھی طوائف کا روپ دھار لیتی ہے۔وہ چمپک، چمپارانی، چمپاوت، چمپاوتی، چمپابائی، چمپا احمد جیسے ناموں سے جانی جاتی ہے۔

انہوں نے عورت کو ملک کی معمار کہا ہے۔ان کے مطابق عورتیں ملک کی ترقی میں مردوں کے شانہ بہ شانہ حصہ لیں اور چند مخصوص میدان میں طبع آزمائی کرنے کے بجائے عصری علوم وفنون کو سیکھ کر سماج میں اپنی اہمیت و افادیت کا لوہا منوانے کی کوشش کریں۔قراۃالعین حیدر ناول ’’آگ کا دریا‘‘ میں اپنے لافانی کردار کے ذریعہ عورتوں کو یہ پیغام دیتے ہوئے کہتی ہیں:

’’اس ملک کا گڑھ یا مسرت کا گھر بنانا میرے اپنے
ہاتھ میں ہے۔ مجھے دوسروں سے کیا مطلب ۔ اس نے
اپنے ہاتھ کھول کر غور سے انہیں دیکھا رقاصہ کے ہاتھ
آرٹسٹ یا لیکھک کے ہاتھ نہیں یہ صرف ایک عام اوسط درجے
کی ذہین لڑکی کے ہاتھ ہیں جواب کام کرنا چاہتی ہے‘‘۔ 21ے

ہندوستان کی تقسیم کے حالات پر لکھے جانے والے ناولوں میں ایک اہم ناول ’’آنگن‘‘ ہے جس میں

خدیجہ مستور نے اس ناول کی مرکزی کردار عالیہ کو حالات سے تنگ آکر سکون حاصل کرنے کے لئے ملازمت حاصل کرنے والی لڑکی کے روپ میں پیش کیا ہے۔ جب عالیہ اوراس کی ماں تقسیم ہند کے بعد ہندوستان سے پاکستان آتے ہیں اور انہیں یہاں رہنے کے لئے پرانی کوٹھی مل جاتی ہے لیکن خرچے کے لئے کوئی آمدنی کا ذریعہ نہ ہونے کی وجہ سے عالیہ اسکول میں ملازمت اختیار کرلیتی ہے۔ یہاں پر ناول نگار نے عالیہ کے ان جذبات کو پیش کیا جو ملازمت پیشہ لڑکیجو اپنے مسائل کسی کے سامنے بتانا چاہتی ہے لیکن اس کا دکھڑا سننے والا کوئی نہیں چنانچہ اپنی اماں کے بارے میں عالیہ کہتی ہے:

> ''چند دن تک خاموش بیٹھے رہنے کے بعد اس نے ایک
> ہائی اسکول میں ملازمت کی درخواست دے دی جو جلد ہی
> منظور ہوگئی اور مصروفیت نے اسے بہت سے عذابوں اور دکھوں
> سے بچالیا۔۔۔اماں صرف اماں تھی۔اس کی تنخواہ ملنے اور کوٹھی
> کی مالک بننے کے بعد پہلی جیسی مغرور اور خود پسند''۔ 22

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوں جوں اردو ناول نگاری نے ترقی کی اسی طرح ان میں عورتوں کے مسائل کی نوعیت بھی بدلتی ہوئی نظر آئی۔ پہلے عورتوں کے لیے اچھے اخلاق اور بہتر زندگی گزارنے کے لیے ناول نگاروں نے ان کے اندر تعلیمی شعور کو بیدار کرنے کی طرف توجہ دلائی پھر ملازمت حاصل کرنے اور اپنی صلاحتوں کے ذریعے دوسروں کو فیض پہچانے کی طرف، پھر اس کے بعد بعض معاشی مسائل و مصیبتوں کے سبب اپنے اور اپنے اہل وعیال کے پیٹ بھرنے کے لئے مختلف پیشوں سے جڑتا دکھایا۔غرض بعض سماجی تغیرات کے اثرات بلاشبہ ہمارے ناولوں میں نظر آنے لگے مثلاً آزادی کی جدوجہد میں عورتوں کو آگے آنے کے لیے اور مردوں کے شانہ بہ شانہ چلنے اور اس لڑائی برابر حصہ لینے کا حوصلہ پیدا کیا گیا پھر تقسیم ہند

کے اثرات واضح طور پر اردو ناولوں میں نظر آئے۔خاص طور پر خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن'' اس کی بہتری مثال ہے۔جس میں عالیہ کو معاشی مسائل کے سبب ملازمت اختیار کرنا پڑتا ہے۔غرض اردو ناولوں میں ملازمت حاصل کرنے کے بعد جن مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔اس پر بھی بہت لکھا گیا چنانچہ یہاں ملازمت پیشہ خواتین کو درپیش مسائل کا ذکر تفصیل سے کیا جا رہا ہے۔

## معاشی بدحالی کا مسئلہ

پریم چند کے ناولوں میں ملازمت پیشہ خواتین کے باضابطہ مسائل نظر نہیں آتے لیکن ان کے یہاں سماج غریب طبقے خصوصاً کسان طبقے کی خواتین کے بے شمار مسائل ملتے ہیں۔جس میں اہم مسئلہ معاشی کسمپرسی کا مسئلہ ہیں عورتیں جو کھیتوں میں شوہر کے ساتھ محنت مزدوری کرتی ہیں لیکن پھر بھی معاشی بدحالی کا شکار کرتی ہیں۔پریم چند کے ناول بیوہ میں پورنا مصیبت زدہ بے کس بیوہ عورتوں کی نمائندگی کرتی ہے۔اس کے شوہر کے انتقال کے بعد اسکی دنیا ہی اجڑ جاتی ہے۔بدقسمتی سے وہ ان عورتوں میں ہے جس کے میکے اور سسرال میں کوئی نہیں ہے۔شوہر کے انتقال کے بعد غیر محفوظ ہے۔اس کو زندگی کے گذر بسر کے لیے کوئی معاشی ذریعہ نہیں ہے۔پریم چند بیوہ عورت کی معاشی بدحالی کو اس کی ذلت کا سبب مانتے ہیں۔اس ناول میں پورنا نوکری کرنا چاہتی ہے تاکہ اپنا پیٹ بھر سکے لیکن صرف اس وجہ سے کہ دیہات میں عورت کو نوکری کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے ایسے حالات میں سمترا پورنا سے کہتی ہے:

> بیچاری عورت کما نہیں سکتی اس لیے اس کی یہ درگت بنی
> ہے۔مگر کہتی ہوں کہ اگر مرد اپنے کنبہ بھر کو کھلا سکتا ہے تو کیا
> عورت اپنی کمائی سے اپنا پیٹ بھی نہیں بھر سکتی۔23

ناول ''گئودان'' میں پریم چند نے کسانوں کی بے کسی اور کسمپرسی کی کہانی بیان کی ہے اور ان کے

حالات زار کی حقیقی عکاسی کی ہے۔اس ناول کا مرکزی کردار ہوری ہے جس میں ہوری اوراس کی بیوی دھنیا بیٹا گوبر اور بیٹیاں سونا اوررو پا ہیں۔اس ناول میں ہوری کی زندگی کے آئینہ میں سارے ہندوستانی کسانوں کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ہوری او راس کے افراد خاندان معاشی مسائل سے دوچار ہوتے ہیں اورخصوصاً عورتوں کوشوہر کی مصیبت میں پریشان نظر آتے ہیں۔

کھیت میں کام کرنے والی عورتوں کی مزوری کی معیشت میں کوئی متعین قدر نہیں ہوتی۔معاشی پیمائش میں اس کو''چھپی ہوئی'' بیروزگاری کہا جاتا ہے۔یعنی کسی کام کے کرنے کے لیے صرف چند مزدوروں کی ضرورت ہوتی ہے ناول گئودان میں بھی ہوری کام کرتا ہےاس کے ساتھ اس کے افراد خاندان بھی خصوصاً اس کی بیوی اور بیٹیاں ، بہو اور بیٹا بھی کام کرتے ہیں لیکن سب پر حق صرف ہوری کا ہوتا ہے یعنی گھر کا مکھیا ہی حقدار ہوتا ہے اسی کو چھپی ہوئی بیروزگاری کا نام دیا گیا ہے۔اس کے بارے میں صغرامہدی وضاحت پیش کی ہے۔

''ان میں (غیر منظّم سیکٹر یعنی زراعت) میں زیادہ تر
عورتیں وہ ہیں جو بغیر تنخواہ کے اپنے خاندان کے لیے کام
کرتی ہیں اور خاندان کی کمائی میں ان کی مدد اور حصہ کو تسلیم
نہیں کیا جاتا ہے۔اس سلسلہ میں جو متعدد تخمینے لگا دیئے
ہیں وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ایسی عورتیں محنت کش مردوں کی
جماعت کا 15 تا 17 فیصد ہیں اور محنت کش عورتوں کی
جماعت کا 41 تا 49 فیصد ہیں۔''24؎

اکثر دیہاتی عورتیں گھریلو کام کے علاوہ کھیتی کا کام جیسے بیج بونا گھاس کاٹنا فصل کی کٹائی وغیرہ کا کام انجام دیتی ہیں جس کی انھیں کوئی اجرت نہیں ملتی۔ناول نگار نے اس طرح کی مزدوری کا ذکر اس طرح کیا ہے:

دوسرے دن بڑے سویرے گاؤں کے کئی آدمیوں نے

اِکیھ کاٹنا شروع کیا۔ ہوری بھی اپنے کھیت میں گنڈاسا لے
کر پہنچا۔ ادھر سے سوبھا بھی اس کی مدد کو آ گیا۔ پنیا، جھنیا،
دھنیا، سونا سبھی کھیت میں پہنچ گئیں۔ کوئی اکیھ کاٹتا تھا کوئی کئی
چھیلتا تھا کوئی گھٹے باندھتا تھا۔ 25

اور جب ہوری اکیھ بیچ کر جو پیسہ حاصل کرتا ہے اسے راستے ہیمیں قرض دار کو دے کر گھر پہنچتا ہے تو گھر کی عورتیں مجسم غم بن جاتی ہیں جس کا اظہار پریم چند نے اس طرح کیا ہے۔

''ہوری گھر پہنچا تو روپا پانی لے کر دوڑی، سونا چلم
بھرلائی، دھنیا نے چرین اور نمک لاکر رکھ دیا اور سبھی آس بھری
آنکھیں اس کی طرف تاکنے لگے۔ دھنیا بھی چوکھٹ پر آ کھڑی
ہوئی تھی۔ دھنیا نے پوچھا کتنے کی تول ہوئی ایک سوبیس ملے۔
پر سب وہیں لٹ گئے۔ دھیلا بھی نہ بچا یا 26

عورتیں جو اپنے باپ اور شوہر کے ساتھ کھیتوں میں مزدوری کرتی ہیں جن کی مزدوری کی کوئی تنخواہ نہیں دی جاتی اور باپ اور شوہر کی کمائی میں ایسی عورتوں کا کوئی حصہ بھی نہیں ہوتا۔ پریم چند نے عورتوں کی معاشی بدحالی کی اسی صورت کو اپنے اس ناول میں پیش کیا۔

معاشی بدحالی کا شکار عورتیں اکثر بدنام پیشے اختیار کر لیتی ہیں جیسے کلبوں میں ڈانسر کا پیشہ، ماڈلنگ کا پیشہ، کال گرل اور طوائف کا پیشہ وغیرہ۔ عام طور پر طوائف کے پیشہ کو ملازمت سے تعبیر نہیں کیا جاتا لیکن طوائف کے کوٹھے پر جتنے لوگ ہوتے ہیں باقاعدہ انھیں اجرت ملتی ہے ان کی تنخواہیں مقرر ہوتی ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ میں ان طوائفوں کا ذکر بھی ملتا ہے جو نوابوں کی اولادوں کی تعلیم و تربیت کیا کرتی تھیں۔

عورتوں کے کوٹھوں پر مغنیہ' موسیقار اور رقاصہ ہوتی ہیں۔ عام طور پر بادشاہ امراء و روسا ان کو دل

بہلانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں ۔ان پر بے تحاشہ دولت خرچ کرتے ہیں لیکن سماج میں طوائفوں کے پیشے کا مقام سب سے معیوب پیشہ تصور کیا جاتا ہے ۔طوائفیں معاشی بدحالی کے سبب اس پیشے سے وابستہ ہوتی ہیں اور یہ پیشہ صرف ان کی نو جوانی کے دور تک چلتا ہے ۔لیکن عمر ڈھلنے کے ساتھ یہ غربت وافلاس اور بیماریوں کا شکار ہوتی ہیں ۔ان کے لئے سماج ومعاشرے میں ہمدردی نظر نہیں آتی ۔حتی کہ ایسی عورتوں کو خاندان کے افراد بھی ساتھ رکھنے سے انکار کر دیتے ہیں ۔

عورتوں کے اس پیشے سے جڑنے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں خاص طور پر معاشی بدحالی ہے اس کے علاوہ ہندوسماج میں بیوہ عورتوں کو دوسری شادی کی اجازت نہ دینا، بیوہ عورت کا سماج اور خاندان میں نوکر وکنیز جیسا سلوک' باپ اور شوہر کی جائیداد میں سے حصہ نہ دینا، بچپن کی شادی کی وجہ سے کم عمری میں لڑکی کا بیوہ ہو جانا اور ان کا کوئی پرسان حال نہ ہونا ،جہیز کے نہ ہونے کی صورت میں بے جوڑ شادیاں اور مجبور والدین کی لڑکیوں کی خرید وفروخت ایسی وجوہات ہیں جن سے راہ فرار اختیار کرنے کیلئے عورتیں طوائف کے پیشے سے جڑ جاتی ہیں ۔اگر سماج انہیں بہتر زندگی گزارنے کا کوئی ذریعہ فراہم کرتا ہے تو شائد وہ ذلت وحقارت کی زندگی کو چھوڑ کر باعزت زندگی بسر کرتیں ۔

رقص وموسیقی زمانے قدیم سے ہی عورتوں کے لیے ذریعہ معاش رہا ہے۔ دور حاضر میں یہ پیشہ نئے ناموں اور جدید طریقوں سے چلایا جا رہا ہے۔ یہ پیشہ عورتوں پر ظلم کے مترادف ہے اس پیشے کو اپنانے والی عورتیں اوباش بیو پاریوں کے ہاتھوں اس پیشے میں جھونک دی جاتی ہیں ۔

صغرا مہدی نے اس پیشے کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے اسے منافع بخش صنعت قرار دیا ہے ۔

''عصمت عفت پر حد سے زیادہ زور، کم سنی کی شادی

بیوہ کی دوسری شادی کی ممانعت جہیز اور عورتوں کے روزگار

> کے مواقع میں کمی، صنعتی نظام اور شہروں میں جا کر رہنے کے
> بڑھتے ہوئے رجحان نے عصمت فروشی کے دھندے کو
> نہایت منافع بخش صنعت بنا دیا ہے۔27

اس پیشے سے وابستہ عورتوں کی بڑی تعداد ان روایتی گروپوں کی اولاد ہیں۔ جو پچھلے کئی برسوں سے نسل در نسل اس پیشے سے وابستہ ہیں لیکن اس کے ساتھ بہت سی ایسی عورتیں بھی ہیں جو اس پیشے میں سماج کے ظلم وستم سے تنگ آ کر اس سے جڑ گئیں ہیں اس کے علاوہ بندھوا مزدوروں کی بیویاں اپنے خاندانوں کو قرض کے جال سے نکالنے کے لیے یہ بھی یہ پیشہ اختیار کر لیتی ہیں۔

اردو ادب میں مرزا ہادی رسوا ایک اہم ناول نگار ہیں۔ انہوں نے کئی ناو لکھے ہیں جن میں ''افشائے راز''، ''امراو جان ادا''، ''ذات شریف''، ''شریف زادہ'' اور ''اختری بیگم'' اہم ناول ہیں۔ ان تمام ناولوں میں ''امراؤ جان ادا'' ان کا شاہکار ناول ہے۔ اس ناول میں انسان زندگی کے تاریخی اور رومانی پہلوؤں کا ایسا نپا تلا امتزاج ہے جو لکھنو تہذیب کے بنیادی عناصر ہیں۔ اس ناول کی کامیابی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انہوں نے لکھنوی معاشرت کی عکاسی تک ہی اپنے آپ کو محدود نہیں کیا بلکہ طوائفوں کے احساسات وجذبات کی بھی بھر پور عکاسی کی ہے۔

اس ناول کے نسوانی کرداروں میں بوا حسینی، خانم، بسم اللہ جان، خورشید جان، بیگم جان ناول کے اہم کر دار ہیں جنہیں رسوا نے اس ناول کی مرکزی کردار امراؤ جان کے ذریعہ متعارف کیا ہے۔

اس ناول میں امیرن نامی ایک لڑکی کی آپ بیتی بیان کی گئی ہے۔ دلاور خاں نامی ایک ڈاکو کو امیرن کے والد کے گواہی سے جیل ہو جاتی ہے۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ اس کے والد سے انتقام لینے امیرن کو اغوا کر لیتا ہے۔ فیض آباد سے لکھنو جاتے ہوئے وہ اسے خانم کے ہاتھوں کوٹھے پر بیچ دیتا ہے۔ خانم کے کوٹھے

پرآ کر امیرن ''امراؤجان'' بن جاتی ہے۔اس ناول میں رسوا نے طوائفوں کی زندگی کے اطراف واکناف کے ماحول اوراس پیشے سے جڑے تمام افراد کا احاطہ کیا ہے ۔

طوائف بننے کے لئے باصلاحیت ہونا ضروری ہوتا ہے۔طبیعت میں شائستگی، وضع داری اورادبی ذوق رکھنے والی طوائف کو زیادہ کامیاب سمجھا جاتا ہے۔ان سب کے علاوہ رقص، موسیقی اور گلوکاری کی صلاحیت کی بھی اہمیت ہوتی ہے یہ تمام خاصیتیں امراؤجان میں ہوتی ہیں لیکن انہیں دولت حاصل کرنے کیلئے فرضی عشق کی اداکاری کرنی پڑتی ہے جیسا کہ امراؤجان کہتی ہے۔

> ''میرا رنڈی کا پیشا ہے اور یہ ہم لوگوں کا چلتا ہوا پیشہ ہے جب کسی کو دام میں لانا چاہتے ہیں اس پر مرنے لگتے ہیں ہم سے زیادہ کسی کو مرنا نہیں آتا ٹھنڈی سانسیں بھرنا، بات بات پر رودینا، دودن کھانہ کھانا، کنویں میں پیر لٹکا کر بیٹھ جانا یہ سب کچھ کیا جاتا ہے۔کیسا ہی پتھر دل آدمی کیوں نہ ہمارے فریب میں آ ہی جاتا ہے۔مگر میں آپ سے سچ کہتی ہوں نہ مجھ سے کسی کو عشق ہوا نہ کسی سے مجھ کو''۔28

طوائف کے پیشے میں دولت عورتوں کے حسن، رقص وموسیقی اور گلوکاری کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے ایک نظام ہوتا ہے اور یہ لوگوں کے باقاعدہ عہدے ہوتے ہیں یعنی رقاصہ، مغنیّہ اور موسیقار وغیرہ۔ان میں آپس میں کوئی محبت نہیں ہوتی ہے۔یہ لوگ حالات سے مجبور ہوکر بے مروت اور سنگ دل ہوجاتے ہیں۔مثلاً اس ناول میں بسم اللہ جان کا کردار بھی ایسا ہی کردار ہے۔

خانم کی بیٹی بسم اللہ جان کا کردار بہت شوخ وشنگ لڑکی کا ہے۔خانم کی خاص توجہ اور سرپرستی کی وجہ سے بسم اللہ جان مکمل طوائف بن جاتی ہے اوراس کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے اس میں طوائف پیشہ

عورتوں کی خصوصیتیں موجود ہیں۔ وہ بے مروتی سے مردوں کو لوٹتی ہے، انہیں بے وقوف بناتی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''بسم اللہ۔۔۔۔میں کھری کہتی ہوں اسی سے بڑی مشہور ہوں اور کہتی بھی نہ تمہارے چھچھورے پن سے جی جل گیا۔ یوں تو آتے تھے۔ میں نے کبھی منع نہیں کیا۔ آج ہی تو نواب پر یہ واردات گزری۔ آج ہی آپ نے میرے منھ در منھ نوکری کا پیغام دیا۔ ہوش کی دوا کرو تم کیا نوکر رکھو گے''29۔

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسوا نے طوائف کے پیشے کو نوکر اور ماہانہ تنخواہ سے جوڑ کر لکھنوی تہذیب میں اس پیشے کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لکھنوی تہذیب کا یہ وہ عہد تھا جب طوائف کا گھر ایک تہذیبی ادارہ سمجھا جاتا تھا امیر وروسا کے لڑکے نشست و برخاست کے آداب اور تہذیب سیکھنے کے لئے طوائفوں کے پاس بھیجے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ان طوائفوں کو ماہانہ تنخواہ پر معمور کیا جاتا تھا۔ اگر کوئی سوداگر نیا ہوا اور اس کی جان پہچان مشکوک ہو تو ایسے سوداگروں سے مہینہ بھر کی تنخواہ پیشگی لی جاتی تھی۔ جیسا کہ امراؤ جان کے ایک آشنا سے بوا حسینی پیشگی ایک ماہ کی تنخواہ لیتی ہے۔

ایک مثال ملاحظہ ہو:

''آخری کلام یہ تھا کہ ایک مہینہ کی تنخواہ پیشگی دینا ہوگی ان صاحب نے کمر سے پینڈ روپیوں کی نکالی۔ بوا حسینی نے گود پھیلائی۔ انہوں نے چھن سے روپے دیئے''۔30

رسوا نے اس ناول میں لکھنوی دور کی جو تصویر پیش کی ہے اس دور میں امیر و جاگیردار اپنی تمام تر آرام

وآسائشوں کے ساز وسامان کے ساتھ طوائفوں کو بھی اپنی زندگی کا ایک جز سمجھ کر ساتھ رکھتے تھے اور انھیں با قاعدہ تنخواہ پر مامور کیا جاتا تھا جیسا کہ ناول کے اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے:

''اسی زمانے میں نواب جعفر علی خاں صاحب کی ملازم
ہوئی۔ سن شریف کو کوئی ستر برس کے قریب تھا۔۔۔۔
۔۔۔آپ کہئیے گا اس عمر اور ایسی حالت میں رنڈی رکھنا کیا
ضروری تھا۔ سنئے؟ مرزا صاحب اس زمانے کا فیشن یہی تھا
کوئی امیر رئیس ایسا بھی ہوگا جس کے پاس رنڈی نہ ہو۔
نواب صاحب کی سرکار میں جہاں اور سامانِ شان وشوکت
کے تھے وہ سلامتی منانے کے جلوسیوں میں ایک رنڈی کا
بھی اسم پچھتر روپیہ ماہوار دیتے تھے''۔31

مرزا رسوا نے ناول ''امراؤ جان ادا'' کے ذریعہ لکھنوی تہذیب' طوائفوں کی زندگی کے تقریباً سبھی پہلوؤں کو بڑے اچھے انداز میں پیش کر دیا ہے۔ ایک شریف ماں باپ کی بیٹی کا طوائفوں کے کوٹھے پر فروخت ہونا اور تمام عیش وعشرت کے باوجود ایک پرسکون زندگی گزارنے کی آرزو اس کے کردار کی خیر وشر کی کشمکش کو ظاہر کرتی ہے وہ بُری زندگی گزارنے کے بعد بھی شرافت کی گھریلو زندگی گزارنے کی متمنی رہتی ہے جب وہ اپنے ساتھ اغوا کی گئی لڑکی رام وتی کو ایک گھریلو عورت کی شکل میں دیکھتی ہے تو اپنی قسمت پر افسوس کرتی ہے۔

پریم چند کے ناول ''بازارِ حسن'' میں طوائف پیشے کے مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول کی مرکزی کردار ''سمن'' ہے جو جہیز نہ ہونے کی صورت میں بے جوڑ جاہل ظالم ''گجادھر'' سے بیاہ دی جاتی ہے۔ سمن گجادھر کی غربت سے زیادہ اس کی شکی مزاجی سے عاجز تھی۔ وہ گجادھر کی جھڑکیوں اور مار پیٹ کو برداشت کر سکتی تھی لیکن جب گجادھر نے اس کے کردار پر شک کرتا اور اس کی بے عزتی کرتا ہے تو وہ برداشت نہیں

کر پاتی اور اس طرح وہ در بدر بھٹکتی ہے اور طوائف کا پیشہ اختیار کر لیتی ہے۔ اس بازار میں اور کئی عورتیں ایسی تھیں جنھیں گھروں میں عزت کے ساتھ دو وقت کی روٹی نصیب نہیں تھی جب مصلحقوم بٹھل راؤ سمن کو سمجھاتے ہیں کہ ''تم برہمنی ہو تمہارے اس عمل سے ساری قوم کا سر جھک گیا ہے'' تو وہ کہتی ہے:

ابھی کئی صاحب یہاں سے مجرا سن کر گئے ہیں۔ وہ سبھی ہندو تھے۔ لیکن کسی کا سر نیچا نہیں معلوم دیتا تھا۔ وہ میرے یہاں آنے سے بہت خوش نظر آتے تھے۔ پھر اس منڈی میں ایک میں ہی برہمنی نہیں ہوں۔ دو چار کے نام ابھی لے سکتی ہوں۔ جو بہت اونچے خاندان کی ہیں۔ پر گھر میں اپنا نباہ نہ دیکھا تو مجبور ہو کر یہاں چلی آئیں۔ 32

پریم چند نے اس پیشے کو اختیار کرنے میں عورت کے ساتھ ساتھ ان مردوں کو بھی اتنا ہی قصوروار ٹھہرایا ہے جو مذہبی ٹھیکدار ہیں یا سماج کے شرفا میں شمار ہوتے ہیں اور سرِ شام طوائفوں کے بالا خانوں کے چکر لگاتے ہیں اس کے علاوہ ایسے مرد بھی جو گھر کی عورت کی کفالت اور ذمہ داری تو دور کی بات اسکی عزت بھی نہیں کرتے۔ اسکے ساتھ ناروا سلوک کرتے ہیں جسکی بنا پر عورتیں لاچار و مجبور ہو کر اس راستے کو اختیار کرتی ہیں۔ سمن کی زبانی عورت کی مجبوری و لاچاری کی داستان پریم چند یوں سناتے ہیں:

''آپ سوچتے ہوں گے کہ میں نے عیش کی آرزو میں اس کوچے میں قدم رکھا ہے۔ پر یہ بالکل غلط ہے۔ میں ایسی اندھی نہیں ہوں کہ برے بھلے کو پہچان نہ کر سکوں۔ میں یہ جانتی ہوں کہ میں نے بہت شرمناک فعل کیا ہے۔ لیکن میں مجبور تھی میرے لیے اور کوئی راستہ نہ تھا۔۔۔۔۔۔!

آپ اتنا تو جانتے ہیں کہ دنیا میں سب کا مزاج یکساں
نہیں ہوسکتا ہے۔کوئی اپنی بے عزتی سہہ سکتا ہے کوئی نہیں
سہہ سکتا۔میں اونچے خاندان کی لڑکی ہوں والدین کی غلطی
سے میری شادی ایک پھٹے حال گنوار سے ہوگئی۔لیکن
غربت میں بھی مجھ سے بے عزتی نہیں برداشت ہوتی تھی
جن کی بے عزتی ہونی چاہیئے ۔ان کی عزت دیکھ کر میرا کلیجہ
کباب ہوجاتا تھا میں اندر ہی اندر آگ سے جلتی تھی۔کبھی
کسی سے اپنی تقدیر کا شکوہ نہ کرتی تھی''۔33

اس طرح اس ناول میں سمن طوائف کے پیشہ سے وابستہ ہونے کے باوجود اپنی عزت ونفس کی رکھوالی کرنا چ چاہتی ہے اس سے عورت کی فطرح شرافت کا احساس ہوتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے عورتیں مجبوری میں اس پیشہ سے وابستہ ہوتی ہیں۔ جہاں کہیں اس پیشہ سےچھٹکارا حاصل کرنے کا انھیں موقع ملتا ہے اس سے راہ فرار اختیار کرتی ہیں سمن شوہر کے ظلم سے تنگ آکر اگر چہ کہ طوائف بن جاتی ہے لیکن وہ اس پیشہ سے تائب ہوکر بھاگ نکلتی ہے اور کپڑے سی کر گزارہ کرنا چاہتی ہے۔لیکن طوائف کے پیشے کے کارندوں کا جال ہر جگہ پھیلا ہوتا ہے جس کی وجہ سے جو عورتیں اس پیشہ سے بھاگ جاتی ہیں انہیں کسی نہ کسی طرح پکڑ کر اسی پیشہ میں دوبارہ جھونک دیا جاتا ہے جیسا کہ ناول ''بازارحسن'' میں سمن کے ساتھ ہوتا ہے وہ کہتی:

''۔۔۔گھر سے نکل کر میں بھولی بائی کے جال میں
پھنسی مگر اس حالت میں بھی اس راہِ بد سے بھاگتی رہی میں
نے چاہا کہ کپڑے سی کر گزر کروں پر شہدن نے مجھے اتنا
تنگ کیا کہ آخر مجھے اسی غار میں کودنا پڑا۔اگر چہ میں خانہ

سیاہ میں آ کر بے داغ رہنا نہایت مشکل ہے پر میرا عہد ہے
کہ اپنی ناموس کی مرتے دم تک حفاظت کروں گی۔ میں نا
چوں گی۔گاؤں گی۔پر اپنا دامن پاک رکھوں گی‘‘۔34؎

پریم چند عورتوں کیخستہ حالت کے سدھار کے لئے ناول میں کچھ تجاویز بھی پیش کرتے ہیں۔وہ عورت کوطوائف بن جانے پر ملزم نہیں قرار دیتے ہیں بلکہ ہمارے سماج کی فرسودہ روایات اور اقتصادی کمزوریوں کو الزام دیتے ہیں اوراس کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔پریم چند نے ناول ’’بازارحسن‘‘میں مصلح قوم پدم سنگھ کے ذریعہ یہ تجویز رکھی ہے:

’’ہم نے اس اخراج کی تجویز اس لئے نہیں کی ہے کہ
ہمیں ان عورتوں سے نفرت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے یہ ان
کے ساتھ سخت بے انصافی ہوگی یہ ہماری ہوس رانیاں ہماری
ہی تمدنی برائیاں ہمارے ہی مذموم رسم و رواج ہیں جنہوں
نے یہ مجسم صورت اختیار کرلی ہے یہ بازارحسن ہماری پرداغ
معاشرت کا عکس، ہماری ہی شیطانی گمراہیوں کی زندہ تصویر
ہے۔ہم کس منہ سے انہیں حقیر سمجھیں ان کی حالت واقعی قابل
رحم ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم انہیں راہ راست پر لائیں ان کی
اصلاح کریں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ شہر سے
باہر مکروہات اور ترغیبات سے دور رہیں‘‘۔ 35؎

پریم چند نے عورتوں کو بازارحسن کے پیشے سے نکالنے کے لئے سماج کے نیک، با اخلاق لوگوں کو آگے آکر ایسی عورتوں کی باز آبادکاری کے لیے ادارے قائم کرنے پر زور دیتے ہیں۔ناول ’بازارحسن‘ میں

ایک ایسا ہی گھر قائم کیا گیا ہے جس کا نام ''سیوا سدن'' ہے۔سیوا سدن میں بازار حسن سے نکلی ہوئی طوائفیں چھوٹی چھوٹی نو خیز لڑکیوں کو تعلیم وتربیت اور خانہ داری کی تعلیم دیتی ہیں۔ یہ لڑکیاں بالا خانوں کی طوائفیں اور بے گھر لڑکیاں ہوتی تھیں۔ پریم چند نے طوائفوں کی باز آبادکاری کے لیے جو تصور پیش کیا ہے اس کے متعلق رجیشور گرو نے لکھا ہے:

> ''سیوا سدن (بازار حسن) مردوں کو یہ سوچنے پر مجبور
> کرتی ہے کہ عورت کو صدیوں سے اپنے آلۂ کار کی طرح
> بنائے رکھ کر مرد نے گناہ کیا ہے عورت جاگ کر اپنے کو
> مردوں کے بے جا قبضہ اور اس کی بدنگاہی سے بچا کر سماج
> میں اپنی خدمت اور محبت کی طاقتوں کو مسلط کر سکتی ہے ''
> سیوا سدن'' کا زبردست پیغام یہی ہے''۔ 36؎

جن حالات کے تحت عورت طوائف بننے پر مجبور ہو جاتی ہے وہ سماج کی فرسودہ رسمیں ہیں یہ کہیں جہیز کی ایک لعنت بن کر سامنے آتی تو کہیں بے جوڑ شادی کی صورت میں اور کہیں بیوہ کے ساتھ ناانصافی کی صورت میں یہ سامنے آتی ہیں اور اس طرح بیچ شہر میں اور عام بازار میں بالا خانے آراستہ کئے جاتے ہیں اور روساء کی تفریح کا سامان مہیا کیا جاتا ہے شادی اور خوشی کے دوسرے موقعوں پر اس اخلاقی وتہذیبی گراوٹ کا کھلے عام مظاہرہ ہوتا ہے اور اس پر فخر کیا جاتا ہے۔محبت سے محروم مصیبت میں بسر کرنے والی عورتیں چمک دمک کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتی ہیں اور جب ان پر کوئی آفت پڑتی ہے تو وہ دور سے خوشنما اور دلکش نظر آنے والی اس زندگی کو حاصل کر لیتی ہیں۔ یہاں آ کر ان کو اس کی خرابیوں کا احساس ہوتا ہے لیکن پھر وہ یہاں سے نکل نہیں پاتیں اور جو عورتیں اس دلدل سے نکل جاتی ہیں انہیں سماج قبول نہیں کرتا۔اس پیشہ سے وابستہ

خواتین کوسماج اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا۔ وہ ایک نیک اور باعزت زندگی گزارنا چاہتی ہیں لیکن جس سماج نے اسے طوائف بننے پر مجبور کیا وہی سماج اسکے پیشے کو عیب سمجھتا ہے۔

عصمت چغتائی نے اردو ناول نگاری کو وسعت بخشا ہے اظہار خیال میں بے باکی اور جرات مندی سے کام لیا ہے انہوں نے اپنے ناولوں میں زندگی کے روزمرہ پہلوؤں کے تہہ در تہہ پوشیدہ حقائق کی بہترین ترجمانی کی ہے۔

ناول ''معصومہ'' میں ایک ایسی لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے جو اپنے والد کے گھر چھوڑ کر بھاگ جانے سے خاندان کو سہارا دینے کے لئے فلم انڈسٹری سے وابستہ ہوتی ہے اور اپنی عزت کا سودا کر کے سب کا سہارا بن جاتی ہے۔ انہوں نے ریاست حیدرآباد میں قاسم رضوی کی فوج کی ناکامی اور پولس ایکشن کے المیہ کی وجہ سے یہاں کے نوابوں کی ہجرت اور ان کے پیچھے بچے کچے خاندانوں کی حالت کی تصویر کشی کی ہے۔ ناول معصومہ کا خاندان نوابی ٹھاٹ باٹ والا خاندان ہے معصومہ کے والد قاسم رضوی کی فوج کی بٹالین جس خاص عہدے پر فائز تھے جس قاسم رضوی کی فوج ناکام ہوگئی تو معصومہ کے والد ہجرت کر گئے۔ اس امید پر کہ حالات بہتر ہونے پر وہ معصومہ سمیت تمام خاندان کو بلالیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا، پاکستان جا کر معصومہ کے والد وہیں مقیم ہوگئے۔ حیدرآباد میں معصومہ کی والدہ چاروں بچوں کے ساتھ بے یارومددگار زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئیں انہیں عیش وعشرت کے ساتھ زندگی گزارنے کی عادت تھی اسی لئے وہ بمبئی کی چکاچوند اور پرکیف ماحول میں فلمی صنعت میں اپنی قسمت آزمانے اپنی تینوں بچیوں اور ایک لڑکے سمیت بمبئی پہنچ جاتی ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''مملکت خداداد میں قاسم رضوی کی کمانڈ میں دلی کے

قلعے پر جھنڈے گاڑنے کے منصوبے باندھے جارہے

تھے۔معصومہ عرف نیلوفر کے والد ماجد اس فوج کے رکن
خاص تھے اور خطرے کی گھنٹی بجتے ہی اپنے بڑے بیٹوں کے
ساتھ روپیہ پیسہ قیمتی زیورات اور مکانوں کے کاغذات لے
کر اُڑ گئے۔صرف گود کا بچہ سلیم اور تینوں لڑکیاں بیگم کے ساتھ رہ
گئے۔ارادہ تھا کہ وہاں پر جم جائیں گے تو سب کو بلالیں گے۔
مگر نہ جانے کیا ہوگیا انہیں وہاں جا کر لوٹ کر خبر نہ لی
۔۔۔۔۔۔وہ بستر بوریا سمیٹ کر بمبئی آ گئیں''۔ 37؎

''معصومہ'' انضمام ریاست حیدر آباد کے المیہ کی ایک علامت ہے جو ایک آسودہ راحت و آرام میں رہنے والے خاندان کی چشم و چراغ بمبئی میں آ کر بدکار ماحول کی رکن نیلوفر بن گئی:

''اور پھر ایک دن احمد بھائی کے دام وصول ہو گئے۔اور معصومہ
بانو نیلوفر بن گئی۔اور بیگم کی نوابی لوٹ آئی۔وہی کھانے پینے کی
ریل پیل۔قدم قدم پر نوکر''۔ 38؎

حالاں کہ معصومہ اپنی خواہش سے یہ بدکاری کے پیشے سے وابستہ نہیں ہوئی بلکہ سماج کے ٹھکیدار نواب اور جاگیردار لوگ ہی اس کے ذمہ دار ہیں۔عصمت چغتائی اس فعل میں عورت کی مجبوری اور مردوں کی بالا دستی کو ذمہ دار قرار دیتی ہیں وہ لکھتی ہیں:

''راجہ صاحب بدکار نہیں! اور وہ دنیا، جو معصومہ کو نیلوفر
بناتی ہے، بدکار نہیں! صرف نیلوفر بدکار ہے! وہ نیلوفر جو
اپنے خاندان کی پالن ہار ہے۔ان کے بچوں کی ناجائز ماں
ہے ان کی ان داتا ہے، وہ بدکار ہے''۔ 39؎

معصومہ عیاشی اور بدفعلی میں بُری طرح ملوث ہوتی ہے تو اس کا ضمیر ملامت کرتا ہے ناول نگار نے اس طرح ایک مشرقی لڑکی کی فطرت کی تصویر کشی کی ہے۔معصومہ ''نیلوفر'' بن جانے کے بعد بھی سہیلیوں کی خوش گپیاں، بہن کی ہمدردی،شوہر کی ناز برداری بیوی کا تصور، باعزت زندگی، ماں بننے کی خوشی، کے خواب دیکھتی ہے۔لیکن اس کے تمام خواب دولت مندلوگوں کی جنسی ہوس کا شکار ہوکر بکھر جاتے ہیں۔ وہ اپنی ماں کی عیش پسند زندگی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔

ناول نگار جیلانی بانو نے ناول ''بارش سنگ'' میں حیدرآباد کے علاقہ چکڑ پلی کے بسنے والے کسان ومزدوروں کی ذہنی کشمکش بیان کی ہے۔ یہاں ایک زمیندار دوسرے زمیندار سے حسد کرتا ہے غلام کسان اپنے آقاؤں کی وفاداری میں اپنی زمین جائیداد عزت سب کچھ قربان کردیتے ہیں۔

اس ناول میں ہندوستانی سماج کے دو اہم طبقات زمیندار اور کسان ہیں جن میں ہندو اور مسلم کردار مساوی ہے۔ وینکٹ ریڈی اور ملیشم ریڈی زمیندار ہیں اور معصوم کسانوں کو زرخرید غلام بنا لیتے ہیں جن میں سلیم اور مراد کے علاوہ کئی دوسرے گاؤں کے غریب لوگ شامل ہیں۔ان غریب غلاموں کی بیویوں اور بیٹیوں کی عزت و ناموس زمینداروں کے لئے سامان نشاط ہے۔گاؤں کے ایک زمیندار کی ہوس کی شکار خواجہ بی بن جاتی ہے خواجہ بی کا باپ مستان وینکٹ ریڈی کا زرخرید غلام ہے، کیونکہ وہ اس کے یہاں رہن ہے اسی لئے وہ خواجہ بی پر ہوئے ظلم پر آواز نہیں اٹھاتا۔خواجہ بی پڑوس کے گاؤں میں شابو سے بیاہی جاتی ہے اور چھٹے مہینے میں ہی ایک بچہ کو جنم دیتی ہے جس پر اس کی ساس سر پر آسمان اٹھا لیتی ہے گاؤں میں بات پنچایت تک چلی جاتی ہے۔ ماں کے خلاف شابو بچے کو اپنا لیتا ہے کیونکہ وہ خود زمیندار کے پاس رہن ہے وہ حالات سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ لڑکا چند سالوں کے بعد کھیتوں میں کام کرکے باپ کا اقرض ادا کرنے میں مدد کرے گا۔اپنی ماں کو غصہ کرتے ہوئے شابو کہتا ہے:

ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''سارے خاندان کی ناک کٹوادی ،حرامی چھوکرے کو

کلیجے سے لگا کر۔ وہ پنچایت کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

چپ بڈھی۔ زور سے چلایا۔

سارے دن کھیتوں میں کام کرکے میرا قرض اتار رہی ہے وہ

۔۔۔تم سب کا پیٹ بھرتی ہے۔۔۔۔۔۔میں تو ساہوکار کے

پاس رہن پڑا ہوں۔ بھوکی مرے گی تُو''۔ 40

پیشہ طوائف میں لڑکیوں کے داخلے کی ایک اور وجہ جہیز کی لعنت بھی ہے لڑکی کی شادی کے لئے حسن سیرت کے بجائے دولت کو ترجیح دی جارہی ہے۔ جہیز نہ ہونے کی صورت میں کئی لڑکیاں شادی کی عمر پار کر رہی ہیں ایسے خاندان جو جہیز کی رقم نہ جوڑ سکتے ہیں وہ اپنی لڑکیوں کو کنواری ہی رکھتے ہیں جس کی وجہ سے وہ بوڑھی ہو جاتی ہیں اور چند ایک خاندان اس پیشے کے ذریعہ دولت حاصل کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں اس مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے صغرا مہدی نے ایک جگہ رقمطراز ہیں:

''کچھ علاقوں میں کنواری لڑکیوں کو اس لئے اس کی

(عصمت فروشی ) کی اجازت دیدی جاتی ہے کہ وہ اس

طرح اپنی کمائی سے جہیز کا سامان کریں''۔41

جہیز کے مسئلہ کے لئے طوائف کے پیشے کے رجحان میں اضافے پر ناول نگاروں نے بھی اپنی تخلیقات میں تحریر کیا ہے۔ اقبال متین نے ناول ''چراغ تہہ داماں'' میں اس ناول کی مرکزی کردار کوشلیا کے اس پیشے سے جڑنے کی وجہہ جہیز ہی کو قرار دیتے ہیں۔ اس ناول میں ہیروین کوشلیا اپنی سہیلی کو اس کی شادی نہ ہونے کی اصل وجہ بتاتے ہوئے کہتی ہے:

''تم جانتی ہو کہ اس کاروباری دنیا میں لڑکے والے لڑکی
سے نہیں، اس کے پیسے سے بیاہ رچاتے ہیں۔۔۔تم
میرے اس درد کو جس طرح جان سکتی ہو شائد دنیا نہ سمجھ سکے
اس لئیے کہ تم پر بیتی ہے۔۔۔تمہاری ماں نے تمہارے بے پناہ
حسن کے باوجود تمہارے ہاتھ اس لئے پیلے نہیں کئے کہ وہ
آسمان سے ہن برسنے کے انتظار میں تھی اور تم اس ہن کا انتظار
کیئے بغیر شانوجہ کے باپ کے ساتھ بہت دور نکل گئیں۔۔۔۔
اتنی دور کہ پھر لوٹ نہ سکیں۔۔۔۔۔'' ۔42۔

اس پیشے سے جڑی ہر عورت اس پیشے سے نکلنا چاہتی ہے لیکن اس پیشے سے جڑے دلالوں اور سماجی بندھنوں کے ڈر سے وہ اس گھناؤنے پیشے سے نکل نہیں پاتی۔ دوسری عورتوں کی طرح یہ عورتیں بھی اپنے بچوں کے ساتھ معاشرے میں سر اٹھا کر زندگی گزارنے کی خواہش رکھتی ہیں عورتوں کی اس فطری خواہش کا اظہار اقبال متین کوشلیا کے خیالات کے ذریعہ یوں کرتے ہیں:

''مجھے کچھ کرنا نہیں ہے۔۔۔لیکن شانوجہ کو زندگی میں
بہت کچھ کرنا ہے میں چاہتی ہوں اس کی خاطر۔۔میرے
شانوجہ کی خاطر کوئی میرا ہاتھ پکڑے اور میں اس کے ساتھ
شانوجہ کو لے کر اس ماحول سے دور نکل جاؤں۔۔۔۔اس
زندگی سے بہت دور نکل جاؤں، اتنا دور کہ شانو بڑا ہو جائے
تو یہ بات بھی اسے معلوم نہ ہو کہ اس کی ماں نے جو کچھ
دولت اس کی تعلیم و تربیت کے لئے جمع کی ہے وہ اس طرح

جمع کی گئی ہے جس طرح میں کرتی رہی

ہوں۔۔۔۔‘‘۔43

اردو ناول نگاروں نے معاشی بدحالی یا دیگر مسائل کی وجہ سے جو عورتیں اس پیشے سے وابستہ ہوتی ہیں ان کے مسائل ہی کو پیش نہیں کیا بلکہ ان کے مسائل کے حل کے لیے تجاویز بھی پیش کیے ہیں تا کہ حکومت مجبور و بے سہارا عورتوں کو تحفظ فراہم کرے اور انھیں معاشی طور پر مستحکم کرنے کے لیے پیش قدمی کرے تا کہ سماج میں انھیں باعزت شہری ہونے کا موقع مل سکے۔صغرا مہدی عورتوں کی اسی صورتحال کی عکاسی کرتے ہوئے جو چند تجاویز پیش کی ہیں وہ اس طرح ہیں:

’’ہماری تجویز ہے کہ عورتوں کو اس پیشے سے بچانے اور ان عورتوں کو جو اس پیشے میں ہیں۔سماج میں بحال کرنے کے لئے بہتر تدبیریں ہونی چاہئیں۔ناجائز اور ایسے بچوں کے لئے جن کی ماؤں نے انہیں چھوڑ دیا ہو، ہوم ہونے چاہئیں ۔ ان عورتوں کے لئے جنہیں اخلاقی اور سماجی خطروں کا سامنا ہو۔ایک مشاورتی سروس ہونی چاہیۓ جو انہیں اس پیشے سے نجات دلائے اور ان کی معاشی بحالی کا انتظام بھی ہونا چاہئے‘‘۔44

معاشی بدحالی پر قابو پالیا جائے تو یقیناً بے شمار عورتیں اس طرح کے پیشے اختیار کرنے پر مجبور نہ ہوں گی۔اردو ناول نگاروں نے ان مسائل کے ذریعے عورتوں کی انھیں مجبوریوں اور مسائل کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہیں۔

تقسیم ہند سے پہلے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف پوری عوام میں جو جذبہ اتحاد پیدا ہوا وہ

آزادی ہند سے چند سال پہلے تقسیم کے نظریہ کی وجہ سے آپسی نفاق میں بدل گیا۔ تقسیم کے زیر اثر فسادات کی زہر آلود فضا دونوں ملکوں میں آگ کی طرح پھیل گئی، جس سے انسان کا وجود نہ صرف بے معنی ہو کر رہ گیا بلکہ انسانی اخوت و محبت کی جڑیں بھی متزلزل ہونی شروع ہوگئیں ۔ پرانی قدروں کا زوال، طبقاتی کشمکش کسانوں اور محنت کشوں کی جدو جہد، ہندو مسلم اتحاد و اختلاف اور بڑے پیمانے پر دونوں ملکوں سے ہجرت کا عمل اور اس عمل کے نتیجے میں پیدا شدہ مسائل کو اس عہد کے ناول نگاروں نے بڑی فن کاری سے ناولوں میں پیش کیا ہے ۔ انہی مسائل میں ایک مسئلہ معاشی مسائل کا بھی رہا ہے۔ اس دور کے ناول نگاروں نے بھی بڑی فنکاری سے اپنے ناولوں میں معاشی مسائل کی عکاسی کی ہے ۔خصوصاً ملازمت پیشہ خواتین کے مسائل کے ذریعے بھی یہ بتانے کی کوشش کی کہ اس دور کے حالات کا اثر خواتین پر بھی پڑا جنھوں نے بڑے خراب حالات میں بھی ملازمت کر کے اپنے بچوں کی پرورش اور اچھی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔

مثلاً قرأۃ العین حیدر نے ناول ''چاندنی بیگم'' کے ذریعے ہندوستان کے جدید معاشرے کے تغیر پذیر حقائق اور مسائل کی طرف نہ صرف توجہ دلائی ہے بلکہ متوسط طبقے کے گھرانوں کی تقسیم اور پاکستان و بنگلہ دیش میں آباد ہونے والی عوام کے نئے مسائل کی عکاسی بھی کی ہے۔ ناول کا اہم نسوانی کردار'' چاندنی بیگم'' ہے، وہ جاگیرداروں کی اس نسل سے تعلق رکھتی ہے جو اپنی بیویوں اور اولادوں کو بے سہارا چھوڑ کر پاکستان چلے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ چاندنی بیگم نہایت عسرت کی زندگی گزارتے ہوئے تعلیم حاصل کرتی ہیں اور اسکول ٹیچر کی معمولی نوکری کرتی ہے اور نیک سیرت لڑکیوں کی طرح در در بھٹکتی ہوئی موت کی آغوش میں پہنچ جاتی ہے۔اس کی وجہ یہی ہے کہ چاندنی بیگم کی زندگی میں کوئی رنگینی یا خوشگوار واقعہ پیش نہیں آتا کیونکہ حصول معاش کی سخت جدو جہد نے اسے کچل کر رکھ دیا تھا۔ چنانچہ ناول'' چاندنی بیگم کے ذریعے اس عہد میں عورتوں کے ملازمت اختیار کرنے کا جواز اس طرح پیش کیا گیا:

''علیمہ بانو، بڑو باجی کی سہیلی تھیں۔ بڑی آفت زدہ' ان
کی بھی وہی کہانی۔شوہر پاکستان فرار ہوئے ۔وہاں سے
طلاق لکھ بھیجی ۔علیمہ بانو نے میٹرک شادی سے پہلے کیا
تھا۔اب بی اے' بی ٹی اسکول میں نوکری کر کے بیٹی کو ایم۔
اے، بی ایڈ کروایا''۔ 45

کم وبیش تمام ناول نگاروں نے عورتوں کے معاشی مسائل کی یکسوئی کے لیے عورتوں کا ملازمت کا پیشہ اختیار کرنے اور ان مسائل سے جوجتے دکھایا ہے۔اس عہد میں معاشی مسائل سے گھری عورتیں مختلف ذرائع معاش سے جڑ گئیں۔لیکن یہاں بھی عورتوں کا استحصال کیا جانے لگا۔

رفیعہ منظورالامین نے اس ناول میں اوٹی کی تہذیب وتمدن اور یہاں کے چائے کے باغات کا ذکر بہت ہی دلکش انداز میں کیا ہے۔چائے کی کاشت یہاں کے رہنے والوں کے لئے اہم معاشی ذریعہ ہے جس میں اہم کام چائے کے پودوں سے پتوں کو توڑ کر احتیاط سے جمع کرنا ہوتا ہے اس کام کو انجام دینے کے لئے عورتیں اپنی پیٹھ پر بڑے بڑے ٹوکریوں کو باندھ لیتی ہیں اور چائے کی پتیوں کو توڑ کر ان ٹوکریوں میں جمع کرتی ہیں۔ یہاں ناول نگار نے عورتوں کا گھریلو ذمہ داریوں میں مردوں کا ہاتھ بٹانے میں جو رول ہوتا ہے وہ ان چائے کے باغوں میں کام کرنے والی عورتوں کے ذکر کے ذریعے کیا ہے :

'' عورتوں کے پرے کے پرے بڑی تیزی اور
چابکدستی سے چائے کی نرم کومل پتیاں توڑ کر اپنی پیٹھ پر
باندھی لمبی ٹوکریوں میں جمع کرتے جا رہے تھے۔۔۔۔۔
باغات میں چائے کی پتیاں جمع کرنے کا کام چابکدستی کی بنا
پر ہی عورتوں کا خاصہ مانا جاتا تھا''۔ 46

اس اقتباس سے ہمیں بخوبی علم ہوتا ہے گھر کی کفات کی ذمہ داری اگرچیکہ مرد کی ہے لیکن عورتیں بھی گھریلو اخراجات کے لئے ان کا ہاتھ بٹانے میں نہ صرف ان کے ساتھ چلتی ہیں بلکہ بڑی خوبی سے اپنی دیگر گھریلو ذمہ داریاں بھی نبھاتی ہیں۔

اس ناول میں شاہدہ، ڈورا اور کاکل کو ملازمت پیشہ خواتین کے کردار میں پیش کیا گیا ہے یہ تینوں معاشی مسائل کے سبب ملازمت کرتی ہیں اور کئی دیگر مسائل سے دوچار ہوتی ہیں۔شاہدہ حالات سے مقابلہ کرتے ہوئے موت کو گلے لگا لیتی ہے لیکن ڈورا اور کاکل حالات سے مقابلہ کرتے ہوئے کامیاب زندگی گزارتی ہیں۔

## شوہر یا والد کی غیر ذمہ داری کا مسئلہ

ناول ''یہ راستے'' کی اہم کردار شاہدہ ملازمت پیشہ خاتون ہے۔وہ اپنے شاعر شوہر فدا حسین کے غیر ذمہ دار رویے کی وجہ سے ملازمت اختیار کرتی ہے اور خندہ پیشانی سے شوہر اور بیٹی کے اخراجات کا بار سنبھالتی ہے یہاں ناول نگار نے شاہدہ کے کردار میں ایک ایسی عورت کو پیش کیا ہے جو اپنے اہل وایال کے لئے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیتی ہے وہ ایک خدمت گزار و وفا شعار بیوی ہے جو اپنے شوہر کی ذمہ داریوں کو خود اپنے کاندھوں پر لے لیتی ہے۔اس کا شوہر غیر ذمہ دار اور اپنی بیوی کی کمائی پر عیش کرنے والا غیر ذمہ دار انسان ہے جس کے کردار کو ناول ''یہ راستے'' میں رفیعہ منظور الامین نے اس طرح پیش کیا ہے:

''اچھا کھانے اور اچھا پہننے کا انہیں بہت شوق تھا جامہ زیب تھے ہر لباس میں سجیلے لگتے تھے۔ان کے سارے ہی شوق بیوی کے سہارے پورے ہوئے۔پھر بھی کاکل نے اپنی ماں سے کبھی کوئی حرف شکایت نہیں سنی''۔ 47

عورت کوایثار وقربانی کا پیکر کہا جاتا ہے۔شاہدہ میں یہ خصوصیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔شاہدہ کو پیٹ کے کینسر کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا لیکن وہ گھر کی معاشی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے نہ اپنی بیماری پر تنخواہ خرچ کرتی ہے اور نہ ہی آرام کرنے کے لئے چھٹی لیتی ہے جس کے نتیجہ میں شاہدہ اپنی جان گنوا بیٹھتی ہے۔ شاہدہ کا اپنے شوہر کے ہاتھوں استحصال کو ناول نگار نے اس طرح قلم بند کیا ہے:

''کاکل کی زندگی سے صرف اس کے والد ہی استحصال نہیں کرتے رہے بلکہ دروازہ کھلا دیکھا تو ایک رہزن اور بھی گھس پڑا۔جس نے بالاخران کی جان ہی لے کر چھوڑی ۔ پیٹ کا درد بہانا بن گیا جسے وہ ٹالتی رہیں۔شاہدہ کی ذمہ داریاں ہی کچھ ایسی تھیں کہ وہ چھٹی لے کر آرام نہیں کرسکتی تھیں۔علاج تو درکنار فدا نے خود کے علاوہ کب کسی اور کو قابل توجہ سمجھا تھا؟ شاہدہ تو ایسی مشین تھی جو ان کے خیال میں کبھی خراب ہی نہیں ہوسکتی تھی''۔48

اس تیز رفتار دنیا کا یہ المیہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں ایک آرام دہ اور پرسکون زندگی گزارنے کی آرزو میں گھر کا چین وسکون سے دور ہو جاتے ہیں اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ میاں اور بیویں میں سے کسی کے یہاں احساس کی کمی ہو جائے تو دوسرے کی زندگی عذاب بن کر رہ جاتی ہے۔اکثر اوقات مرد اکثر ملازت پیشہ بیوی پر اپنے حقوق کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا استحصال کرتے ہیں خصوصاً بُری عادتوں کے شکار مرد اپنی کمانے والی بیوی یا پھر کمانے والی بیٹی کا استحصال کرتے ہیں مثلاً ناول ''یہ راستے'' میں فدا حسین نے عمر بھر بیوی کی کمائی کا ناجائز استعمال کیا اور بیوی کے انتقال کے بعد جب گھر کی ذمہ داری سر پر آن پڑتی ہے تو اپنی ذمہ داریوں سے بھاگتا ہے اور کسی امیر بیوہ سے شادی کر کے عیش وعشرت کی زندگی گزارتا ہے۔اس کی اسی

بے حسی کا شکار شاہدہ کو ہونا پڑا۔ ناول نگار نے یہاں غیر ذمہ دار مرد کی وجہ سے ایک عورت کن مسائل سے دوچار ہوتی ہے اس کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

## خانگی اداروں اور اسکول و کالج میں ملازمت کرنے کا مسئلہ

معاشی حالات سے پریشان اکثر خواتین اپنا اپنی اولاد کا یا اپنے گھر والوں کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے لیے نوکری کرتی ہیں۔ خصوصاً کسی بیوہ یا طلاق شدہ عورتیوں کو جب ملازمت اختیار کرنی پڑتی ہے تو پھر مسائل دگنے ہو جاتے ہیں۔ ان خواتین کو جن کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا ان کو محض اسی وجہ سے پریشان کیا جاتا کہ وہ مجبور ہے کچھ نہیں کہ پائیں گی۔ انھیں طرح طرح سے ستایا جاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ااپنے ناول ''چاندنی بیگم'' میں اس مسئلہ کو اپنے کرداروں کے ذریعے اس طرح پیش کیا ہے:

> ''علیمہ بانو بٹو کی بچپن کی سہیلی تھیں۔ بڑی آفت زدہ ان کی بھی وہی کہانی۔ شوہر پاکستان فرار ہوئے وہاں سے طلاق لکھ بھیجی۔ علیمہ بانو نے میٹرک شادی سے پہلے کیا تھا اب بی اے بی ٹی۔ اسکول میں نوکری کر کے بیٹی کو ایم۔ اے، بی ایڈ کروایا، دونوں ماں بیٹیاں قصبہ ظفر پور میں اپنے آبائی کھنڈر کے سالم دو کمروں میں رہتی تھیں اور ایک پرائیوٹ کالج میں پڑھاتی تھیں۔ کالج کے مالک اور پرنسپل ڈیڑھ ڈیڑھ سو ماہانہ کی رسیدیں ان سے لیتیں اور اسی (80) اسی (80) روپئے دونوں کو تھما دیتیں''۔49

## خانگی اداروں یا ملازمت میں اگریمنٹ کا مسئلہ :

خانگی اداروں میں کام کرنے والوں کو سب سے اہم مسئلہ اگریمنٹ کا ہوتا ہے ان سے ایسا اگریمنٹ کروایا جاتا ہے جس سے انھیں دیگر مسائل سے دوچار ہونا پڑا ہے مثلاً انھیں کوئی بھی مشکل پیش آئے وہ نوکری نہیں چھوڑ سکتیں ورنہ ان پر مقدمہ ہوجائے گا یا ان کے سرٹیفیکٹ نہیں دئے جائیں گے۔اس طرح کے اگریمنٹ کی وجہ سے ان کو بے شمار مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ناول ''دوراستے'' فدا حسین کی ہونے والی بیوی حور بانو پہلے تو کاکل کی شادی طئے کردیتی ہے جسے کاکل کرنے سے انکار کردیتی ہے لیکن وہ دسری چال چلتے ہوئے چھوٹے بچوں کی آیا کی نوکری کے لئے اوٹی بھیج دیتی ہے اور یہ نوکری ایک اگریمنٹ کے تحت ہوتی ہے جس پر کاکل کو تجسس رہتا ہے جیسا کہ وہ کہتی ہے:

''۔۔۔التمش شہزادا اور زینو کے ماموں تھے اور انہوں
نے ہی اسے یہ ملازمت دی تھی لیکن کہاں تھے وہ،
اگریمنٹ پر مسیح نے اس کے دستخط کیوں لئے تھے۔یہ سوال
اس کے دماغ میں اٹھے ضرور''۔50؎

ملازمت کے شرائط میں یہ شرط بھی عام ہے کہ اپنے اسنادات کو مالک کے حوالے کردیں اور جب استعفیٰ دے دیں تو اسنادات واپس حاصل کرلیں لیکن چند مالکین اسنادات حوالے نہیں کرتے بلکہ ان دستاویزات کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ ناول ''چاندنی بیگم'' میں چاندنی بیگم جس اسکول میں ملازمت کرتی تھی، وہاں کا پرنسپل اپنے ملازمین کے اسنادات ضبط کرلیتا تھا جس کی وجہ سے وہ دوسری جگہ نوکری کرنے سے قاصر رہیں۔اس مسئلہ پر کا بیان کرتے ہوئے قرۃالعین حیدر لکھتی ہیں:

''کچھ ایسے حالات میں کالج سے استعفیٰ دینا پڑا کہ میرے

تمام کاغذات پرنسپل نے اپنے قبضہ میں کر لئے''۔51

جمہوری طرز حکومت کا سب سے اہم ستون صحافت ہے۔صحافت کے ذریعہ ہر قسم کے مسائل کو عوام کے نمائندوں تک پہنچایا جاسکتا ہے تا کہ عوام کے ذریعہ چنے گئے نمائندہ وزراء ان مسائل کا گہرائی سے جائزہ لے سکیں اوران کو حل کرسکیں۔

ناول ''چاندنی بیگم''میں بٹو باجی سوشیل ریفارمر ہیں ان کے شوہر بیرسٹر شیخ اطہر علی کے بیٹے قنبر علی صحافی ہیں بٹو باجی اپنی سہیلی علیمہ بانو کی بیٹی چاندنی سے قنبر کا رشتہ طے کرنے ظفر پور جاتی ہیں جہاں انھیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سہیلی علیمہ بانو اوران کی بیٹی شوہر کے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد ایک معمولی اسکول میں ٹیچر ہیں جہاں پران کی صلاحیتوں کا استحصال ہو رہا ہے جس پر وہ اپنے طور پر اس مسئلہ کو میڈیا کے ذریعہ حل کرنا چاہتی ہیں وہ اپنے صحافی بیٹے قنبر علی سے اس کا ذکر کرتی ہوئی کہتی ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایک تعلیمی شارک کالج پرنسپل کے روپ میں ان ماں بیٹیوں کا اور ان کی ایسی بہت سی ٹیچروں کا اقتصادی استحصال کر رہی ہے''بٹو بیگم نے پھر ایک دم تقریر شروع کر دی''تم اگلے شمارے میں پرائیویٹ اداروں کے اس ایکٹ پر ایک پرزور نوٹ بھی لکھو''۔52

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے ناول نگاروں نے نہ صرف مسائل کا بیان کیا ہے بلکہ ان کے حل کے لیے کرداروں کے ذریعے کوششیں کرتے بھی دکھایا گیا ہے غرض اردو ناول نگاروں نے اس طرح اپنے والوں میں کرداوں کے ذریعے ملازمت پیشہ خواتین کے مسائل کے حل کے سلسلے میں بھی بڑی اہم تجاویز پیش کی ہیں۔

# صنفی امتیاز کا مسئلہ

دور قدیم سے ہی اعلیٰ عہدوں پر مردوں کی اجارہ داری رہی ہے۔ بادشاہت، وزارت، سیاست ،وکالت کے علاوہ نظم ونسق غرض تمام م عہدوں کے لیے مردوں کو ہی موزوں مانا جاتا رہا ہے۔ زمانہ کی ترقی کرنے اوراعلی تعلیم حاصل کر کے تمام میدانوں میں اپنالوہا منوانے کے باوجود بھی انھیں صنفی امتیازات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس امتیاز کا سبب مرد اور عورت کے درمیا نصنفی امتیازات ہیں یہی وجہ ہے کہ ملازمت کے حصول میں مردوں کی جگہ عورتوں کو لینا مناسب نہیں سمجھا جاتا ہے بعض پبلک سیکٹر اور پرائیویٹ سیکٹر کھلے عام عورتوں کو اعلیٰ اور ذمہ دار عہدوں پر فائز نہیں کرتے۔ اس عدم مساوات کی وجہ سے خواتین اعلی ذہنی صلاحیتیں ہونے کے باوجود ایک اعلیٰ عہدہ پر تقرر ہونے سے محروم رہ جاتی ہیں۔ صغرا مہدی لکھتی ہیں؛

> ''ذمہ داری کی بلند تر سطحوں پر عورتوں کے تناسب میں
> جو عدم مساوات کی صورتیں موجود ہیں ان کا سبب تعصّبات
> بھی ہیں اور بھرتی کی امتیاز وتفریق کرنے والی پالیسیاں
> بھی۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ عورتوں میں اپنی روش
> حیات کی سمت کا تعین کرنے اور پابندی و ذمہ داری قبول
> کرنے کی اہمیت کا فقدان ہے۔ بہت سے پرائیویٹ
> اداروں اور خود پبلک سیکٹر کے بعض اداروں نے بھی ہمارے
> سوالنامے کے جواب میں تسلیم کیا کہ بطور پالیسی وہ مینجری
> کی سطح پر عورتوں کو بھرتی نہیں کرتے ہیں۔'' 53

اس رپورٹ سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارے معاشرے میں صنفی اعتبار سے عورتیں کے ساتھ

ناانصافی ہورہی ہے۔اردوناولوں میں بھی صنفی امتیازات کے مسائل ملتے ہیں۔خاص طور پرقرۃالعین حیدر نے اپنے ناول ''چاندنی بیگم'' کے کرداروں کے ذریعہ اپنے عہد کے ان پڑھے لکھے لوگوں کی کھوکھلی ذہنیتکا پردہ فاش کرنے کی کوشش کی ہےجو عورت کوناقص العقل سمجھتے ہیں۔اس طرح کیذہنی تعصبکے سبب بھی تعلیمی قابیلیت اور لیاقت رکھنے کے باوجودعورتوں کوملازمتوں میں وہ مقام ومرتبہنہیں مل پاتا ہےجن کی وہ حقدار ہوتی ہیں۔ان مسائل سے دوچارخواتین کونہ صرف مختلف دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتاہے بلکہ وہ احساس کمتری کا بھی بعض اوقات شکارہوجاتی ہیں۔

قرۃالعین حیدر نے ناول ''چاندنی بیگم'' میں اسی مسئلہ کوایک بڑی عمدگی سے پیش کیا ہےاس ناول میں قنبر علی کے مرنے کے بعدان کے باپ کی کوٹھی ''ریڈروز'' کے لیےکئی وارث اُٹھ کھڑے ہوجاتے ہیں جن کے درمیان قبضہ حاصل کرنے کے لئے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ایسے میں قنبر علی کی بیوی بیلا کے باپ اور بھائی قنبر علی کی جائیداد حاصل کرنے کے لیے وکیل کی مدد لینا چاہتے ہیں اس وقت انھیں ایک قابل اور فارن سےتعلیم یافتہ ایک خاتون وکیلکو مقدمے کی کارروائی کے لیےمقرر کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہےلیکن وہ صرف اس وجہ سے کہ وہ عورت ہےاوران کےنزدیک ناقص العقلہوتی ہےاس لیےاسے مقدمہ کے لیےمنتخب نہیں کیا جاتا۔مثلاً اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''کہنے لگے۔ایک وکیلن کرلیجیے۔نئ نئ پریکٹس شروع
> کی ہے بہت قابل ہیں۔فارن میں پڑھ کرآئی ہیں۔۔۔
> میں بولا ! بادشاہ جانی: بھائی کیا ہے کہ عورت ذات ناقص
> العقل ہے یہ مردوں کےکام ہیں۔''54

صنفی امتیازات کےاسی مسئلہ کےسبب خواتین عمدہ صلاحتیوں اورقابیلیتوں کے باوجوداچھی عہدوں فائز

نہیں ہو پاتی ہیں اور اپنے جائز حقوق سے محروم رہ جاتی ہیں۔

## فلمی صنعت میں استحصال کا مسئلہ

خوابوں کا شہر ممبئ فلمی صنعت کیلئے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ ملک کے کونے کونے سے اس شہر میں لوگ اپنی قسمت آزمانے کے لیے آتے ہیں۔ بعض دفعہ لوگ فلمی دنیا کی چمک دھمک دیکھ کر اس کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات لوگ معاشی حالات سے مجبور ہو کر اس کا رخ کرتے ہیں۔ خصوصاً خواتین بحالت مجبوی اس میدان میں قدم رکھتی ہے تو اس کا بہت استحصال ہوتا ہے اور ہر کوئی اس کا استحصال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ قراۃ العین حیدر کے ناول ''چاندنی بیگم'' میں بیلا اور پری زادہ بھی فلمی صنعت میں گانے' بجانے اور ایکٹنگ کے علاوہ ادنیٰ سے ادنیٰ کام کرنے کے لئے بھی تیار رہتی ہیں تا کہ انہیں دو وقت کی روٹی مل سکے۔ اتفاق سے انھیں کام مل جا تا ہے لیکن فلمی صنعت میں انھیں اپنی عزت بچائے رکھنا بھی مشکل ہو جا تا ہے۔ اسیفلمی دنیا میں چنبیلی بیگم نام کی حسین وجمیل لڑکی تھ بھی تھیلیکن اسے اپنی عزت بچائے رکھنے کے لیے صرف چھوٹے موٹے رول ہی ملا کرتے تھے کیوں کہ اس فلم انڈسٹری میں خوبصورتی اور اعلی صلاحیتوں سے زیادہ عزت کا سودا کرنے والی خواتین کو ہی اعلی اور اہم رول دیئے جاتے تھے۔ اسی مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے قرۃ العین حیدر ناول ''چاندنی بیگم'' میں لکھتی ہیں:

> ''مجبوراً چنبیلی بیگم بھی چھوٹے موٹے رول کرنے
> لگیں۔ ایک بات ماننا پڑے گی، یہ اتنی خوبصورت تھیں کہ
> اگر چاہتیں تو آسانی سے ہیروئن بن سکتی تھیں۔ مگر نیک چلن
> عورت تھی، بہن بھابھی پر اکتفا کیا''۔ 55؎

فلم انڈسٹری میں ملازمت عورتوں کے لئے عارضی ہوتی ہے عورتوں کے حسن اور ان کی عمر کو اس پیشہ

میں خاصی اہمیت ہوتی ہے۔سینکڑوں ہیروئن چند دن کے کام کے بعد گمنامی اور کسمپرسی کی زندگی گزارتی ہیں۔ اس انڈسٹری میں کام کا کوئی مستقل معاوضہ نہیں دیا جاتا اور نہ ہی روزگار کی گیارنٹی دی جاتی ہے۔قرأۃ العین حیدر نے ''چاندنی بیگم اپنے کردار کے ذریعے اس مسئلہ کی طرف بھی توجہ دلائی جس سے اکثر خواتین دوچار رہتی ہیں مثلاً وہ لکھتی ہیں:

''موٹاپا سوار ہوگیا تو سائڈ رول بھی ملنے بند ہوگئے۔
انہوں نے ایک اسٹوڈیو کے احاطے میں برگد تلے انگیٹھی
رکھ کر کباب پراٹھے پکانے شروع کئے''۔56

تقسیم ہند کے المیہ پر ناول نگاروں نے بہت کچھ لکھا ہے۔خاص طور پر سیاسی سماجی صورت حال اور معاشرتی بدحالی کو زیادہ بیان کیا گیا ہے۔قرۃ العین حیدر ہی کی طرح جیلانی بانو کے یہاں بھی تقسیم ہند کی صورت میں پیدہ شدہ مسائل ملتے ہیں انہوں نے ''سقوط حیدرآباد'' یعنی ریاست حیدرآباد کا ہندوستان کی تمام ریاستوں کے ساتھ انضمام کی صورت میں پیدا شدہ مسائل و حالات کا بیان ناول ''ایوان غزل'' میں کیا ہے ۔جس میں فلمی دنیا کے مسئلہ کو بھی پیش کیا گیا۔انضمام حیدرآباد کی وجہ سے جاگیردارانہ طبقہ بہت مشکل حالات سے دوچار ہوا۔ایسے حالات میں مرد اور عورتیں چھوٹی موٹی نوکریوں کو اپنانا اپنی شان کے خلاف سمجھنے لگیں اور گنتہ داری اور فلمی دنیا میں اپنے قدم جمانے میں دلچسپی لینے لگیں۔اس کی صورتحال کے پیش نظر جیلانی بانو اس عہد کی خواتین کے بارے میں لکھتی ہیں:

''اس وقت حیدرآباد کے اونچے طبقے میں دو طرح کی
خواتین پائی جاتی تھیں۔ایک واحد حسین کا گھرانہ جہاں
ابھی تک عورتیں کار کو پردا لگا کر بیٹھی تھیں اور بی بی کی طرح
انہیں اپنے شوہر کے عہدے کا انگریزی تلفظ کبھی صحیح طور یاد

> نہیں ہوتا تھا۔۔۔۔دوسری عورت وہ تھی جو حیدر علی خاں
> کے یہاں پیدا ہوئی تھی۔۔۔انگریزوں آفیسروں کے کلب
> میں ناچتی تھیں۔بغیر آستینوں کا بلاوز اور کٹے ہوئے دہانوں
> کے ساتھ نئے نئے میکپ کے انداز' وہ پپا' مما کو ڈیر اور
> ڈارلنگ کہتی تھیں''۔57

نہ صرف ناچنا گانا فیشن بن گیا تھا بلکہ مجبوری کے عالم میں اکثر خواتین تھیٹر کی طرف بھی راغب ہو رہی تھیں۔جیلانی بانو کے اس ناول کی نسوانی کردار چاند،اورغزل کو تھیٹر کی دنیا (بھارت کلا مند)' میں ایک فعال ایکٹر کے طور کام کر رہیں تھیں۔چاند معاشی بدحالی کی وجہ سے ایکٹنگ کرنے تیار ہو جاتی ہے لیکن چاند کو اس کا ماموں راشد دانشمندی اور چالاکی سے اپنے مقصد کے حصول کا ذریعہ بناتا ہے اور اس سے ہر ممکن طور پر فائدہ اٹھاتا ہے۔راشد کے کردار کی عکاسی کرتے ہوئے جیلانی بانو لکھتی ہیں:

> ''راشد ترقی پسند تھا مگر مصلحت پسند ضرور تھا۔اس نے
> انجینئری کے علاوہ بزنس بھی شروع کر رکھا تھا مٹی چونے اور
> پتھر کا بیوپار اور بزنس کے اصول پڑھ رہا تھا اور جانتا تھا کہ
> چاند جیسی تہذیب یافتہ خوبصورت فیشن ایبل لڑکیوں کا بھاؤ
> کتنا بڑھا ہوا ہے اتنا کہ لوگ چاہیں تو ان کے سہارے
> لاکھوں کنٹراکٹ لے لیں''۔ 58

اس طرح قرۃ العین حیدر اور جیلانی بانو نے اپنے ناولوں میں فلمی انڈسٹری اور تھیٹر میں کام کرنے والی لڑکی کے ساتھ جس طرح سے وہاں کے مالکین اور ان کے رشتہ دار استحصال کرتے ہیں اس کی بڑی خوبی سے عکاسی کی ہے۔

# عورت کی فطری شرم وحیااورڈروخوف کا مسئلہ

ناول ''عالم پناہ'' میں رفیعہ منظورالامین نے حیدرآباد کے جاگیردارانہ نظام کے خارجی رکھ رکھاؤاور داخلی خلفشار کو پیش کیا ہے اس ناول کا مرکزی کردار ''ایمن'' ہے ایمن یتیم یسیر باعزت خاندان کی لڑکی ہے جو تنگ دستی اور مشکل حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے نوکری کی تلاش میں بنگلور سے حیدرآباد آتی ہے۔ حیدرآباد کے زوال پذیر جاگیردار گھرانے کی سرپرست اعلیٰ کی پرسنل سیکریٹری کی حیثیت سے خدمت پر معمور ہوجاتی ہے۔ جاگیردرانہ ماحول اورنظام زندگی کی بعض خرابیوں کے دیکھنے کے بعد بھی ایمن اپنے آپ کو ان مسائل سے بچائے رکھتی ہے اوراپنے نیک اخلاق وکردار کے ذریعہ ان مسائل سیجو جتی ہوئی اپنی قابلیت کالوہا منواتی ہے۔

ہندوستان کی تقسیم کے بعد ہندوستان میں سقوط حیدرآباد کا المیہ جنوبی ہند کے عوام کے لئے بہت بڑا سانحہ تھا۔ ہندوستان کی انگریز حکومت کے ساتھ ساتھ حیدرآباد میں خاندان آصفیہ کی حکومت قائم تھی۔ آزادی کے بعد ریاستوں کی لسانی بنیادوں پر تشکیل نوعمل میں آئی۔ اسی دوران حیدرآباد کا الحاق بھی عمل میں لایا گیا جس کو ''پولس ایکشن'' کہتے ہیں پولس ایکشن کے بعد ریاست حیدرآباد آندھراپردیش کا ایک حصہ کہلایا۔ اس دوران قتل وغارت، انسانیت سوز واقعات جنوبی ہند میں رونما ہوئے۔ اس کا اثر سماجی ومعاشرتی زندگی پر راست طور پر پڑا۔ معیشیت متزلزل ہوگئی۔ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی ضروریات زندگی پورا کرنے کے لئے گھر سے باہر آکر ملازمت اختیار کرنے لگیں۔ اسی خیال کا اظہار ناول ''عالم پناہ'' میں رفیعہ منظورالامین کرتی ہیں:

> ''حیدرآباد کے وہ باشندے جوعورتوں کا ملازمت کرنا تو
> کجامخلوط تعلیم کوبھی معیوب سمجھتے تھے اب دھڑلے سے اپنی

بہو بیٹیوں سے نوکریاں کروا رہے تھے۔ یہ مرغ بادنما تھے۔
پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد میں عبوری دور آیا تھا۔ پرانا
سماج مر چکا تھا۔ اور نئے سماج نے ابھی جنم نہیں لیا تھا۔
حیدرآباد کے کچھ خاندان ایسے تھے جنہوں نے وقت کی نبض
کو پہچان لیا تھا۔ انہیں عظیم ہندوستانی سماج کا ایک حصہ
بننے میں اتنی دشواری نہیں ہوئی''۔ 59

عورتیں ملازمت کرنے تو لگیں لیکن جب ان سے ملازمت کرنے کے سلسلے میں طرح طرح کے سوال کیے جاتے ہوں تو جس ذہنی پریشانی اور فطری شرم وحیا اور ڈر وخوف کا انھیں سامنا کرنا پڑتا ہے اس کی طرف بھی اس ناول میں ذکر کیا گیا ہے۔ ماں باپ کا نہ ہونا اور جاگیردانہ سماج میں عورت کا مرد کے شانہ بہ شان نوکری کرنا بھی لوگوں کو ناگوار اور معیوب لگتا ہے اسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا اور اس پر شک کیا جاتا اور خاندان اور گھر والوں پر انگلیاں اٹھتی ہیں ایسے ہی کئی معاملات ہیں جہاں عورت کے حوصلے اور ہمتکمزور پڑ جاتی ہے۔ ناول ''عالم پناہ'' میں مرکزی کردار ایمن کے ساتھ بھی یہی مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ جب وہ بنگلور سے انٹرویو دینے کے لئے حیدرآباد آتی ہے تو اس سے ملازمت کی ضرورت پر کئی سوال کئے جاتے ہیں

''جی............!

اتنی دور...... حیدرآباد آکر نوکری کرنے کی تمہیں
ضرورت کیوں آپڑی؟ ...... بڑی سرکار نے اس کے کچھ
بے ترتیب لیکن اچھوتے سراپا کو دیکھ پوچھا، تمہاری عمر تو
زیادہ نہیں لگتی۔ تمہارے گھر والوں نے کس طرح تمہیں اتنی
خودمختاری کی اجازت دی؟۔

''جی میری عمر (۲۳) سال ہے''۔۔۔۔۔۔میرے ماں

باپ نہیں ہیں''۔60؎

اسی طرح رفعیہ منظورالامین کے ناول ''یہ راستے میں بھی کاکل کے ساتھ یہی مسئلہ پیش وَتا ہے جب التمش کاکل کو آیا کی ملازمت دینے سے پہلے اس کی نوکری کرنے کے سلسلے میں کئی سوالات کر کے اس کے کردار کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے:

'' تمہاری طرح کی بگڑیل لڑکیاں خودمختاری کی تلاش

میں گھر چھوڑ کر نکل پڑتی ہیں۔ان خطروں سے بے خبر جو

مردوں کی اسی دنیا میں ان کے منتظر رہتے ہیں۔

میں اللہ کی بنائی اس دنیا کو صرف مردوں کی دنیا نہیں

سمجھتی اس پر جتنا مردوں کا حق ہے اتنا ہی عورتوں کو ابھی

ہے...........''۔

'یہ محض تمہارا زعم ہے۔تم بھٹکی ہوئی لڑکیاں اسی خیال

خام میں گھر سے نکل پڑتی ہیں۔اور جب خطرہ سامنے آتا

ہے تو بالکل معصوم بن جاتی ہیں''۔ 61؎

عورتیں جب گھر سے باہر قدم رکھتی ہیں تو انہیں شرم حیا،جھجھک اور ہچکچاہٹ ہونا فطری بات ہے، عورت کا خودمختار ہو کر ملازمت کرنا اور خاص کر مسلم معاشرے کی خواتین کا بے پردہ ہو کر مردوں کی طرح نڈر بے باک ہو کر باہر گھومنا آج بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔عورت کی صنفی کمزوری کا بار بار اسے احساس دلایا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ ہر وقت ڈر وخوف کے عالم میں ملازمت کرتی ہیں۔رفیعہ منظورالامین نے ناول عالم پناہ میں اسی مسائل کو پیش کیا ہے وہ لکھتی ہیں:

'' ڈیوڑھی کے بڑے پھاٹک میں داخل ہونے سے
پہلے ایمن ہچکچائی ۔اس کو شک ہوا کہ کہیں وہ غلط پتے پر تو
نہیں پہنچ گئی ہے۔اس نے اپنے بیگ سے انٹرویو کال کا
کاغذ نکالا اور غور سے پڑھا۔
''فرمان''۔گولکنڈہ روڈ نمبر۔4
پتا بالکل صحیح تھا۔اور وہ بڑی مشکل سے یہاں پہنچ پائی
تھی۔اسٹیشن سے یہاں تک پہنچنے کے لئے ٹیکسی والے نے
اس سے بیس روپے وصول کر لئے تھے اس نے پلٹ کر
دیکھا۔ٹیکسی والا اب بھی ٹیکسی کے دروازے پر ہاتھ رکھے
اسے گھور رہا تھا۔ پل بھر کو ایمن کے پاؤں کانپے، وحشت
طاری ہوئی''۔ 62

اس اقتباس میں عورت کی فطری کمزوری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ویرانی میں خوف کا طاری ہونا۔ٹیکسی والے کی نظروں سے خوف زدہ ہو جانا،صنفی کمزوری کی علامت ہے اوراس کمزوری کی وجہ سے خواتین اکثر اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے کے باوجود برابری کے حقوق حاصل کرنے سے قاصر رہتی ہیں۔اردو ناولوں میں بھی اس طرح کے مسائل کے ذریعہ ان مسائل کے حل کے لیے ناول نگاروں نے کوششیں کی ہیں۔

## سفر کی صعوبتوں کا مسئلہ

عورتیں انفرادی طور پر گاڑیاں استعمال کرنے سے گریز کرتی ہیں اس کے علاوہ راستے پر سواریوں میں لفٹ لینے سے بھی گھبراتی ہیں اردو ناولوں میں اس طرح کے مسائل بھی ملتے ہیں۔خصوصاً ناول ''عالم پناہ'' میں ایمن کے ساتھ بھی یہی مسئلہ پیش آتا ہے۔جب وہ بنگلور سے حیدرآباد ریل اور ٹکسی میں دھکے کھا کر انٹرویو

کے لئے حویلی پہنچتی ہے تو وہاں کار میں حویلی کے مکین آرام سے سیر وتفریح کے لئے نکلتے ہیں وہ تھکی ہوئی ہونے کے باوجود اس کار سے لفٹ نہیں مانگتی کیونکہ عورت ہونے کی وجہ سے وہ مختلف منفی اندیشوں میں گرفتار ہوجاتی ہے اور پیدل چلتے ہوئے انٹرویو کے مقام تک جاتی ہے لیکن پیدل آنے کی وجہ سے انٹرویو کے لئے چند منٹ دیر سے پہنچنا پڑتا ہے، سفر کی صعوبتوں کی وجہ سے ایمن طرح طرح کے سوالات کے گھیرے میں آتی ہے اور سوچنے لگتی ہے ناول نگار نے اس کی ذہنی حالت کی عکاسی کرتے ہوئے اس کی پریشانی کا ذکر یوں کیا ہے :

''تم دس منٹ دیر سے آئی ہو''۔ بڑی سرکار نے
اشارے سے سلام لیتے ہوئے کہا۔اب ایمن کیا کہتی کہ
راستے میں کانٹوں نے دامن تھام لیا تھا۔۔۔۔ دبیز مخملی،
آسودہ ماحول میں رہنے والے بھلا عوام کی دیر سویر کی
گوناگوں وجوہ کو کیسے سمجھیں''۔ 63

سفر کے حالات کا مسئلہ تو ہمیشہ سے خواتین کے ساتھ رہا ہے سفر کی صوبعتوں سے بچتے بچاتے آنے کے باجود ان سے رعایت نہیں برتی جاتی اور وقت کی پابندی کا مسئلہ درپیش آجاتا ہے۔اور وقت پر نہ پہنچنے کی وجہ سے اکثر اپنے مالکین کے آگے شرمندہ بھی ہونا پڑتا ہے۔یہ اور اس طرح کے مسائل کی طرف ہمارے ناول نگاروں نے خصوصی توجہ دلائی ہے تاکہ اس کے حل کی صورت نکل سکے۔

## عزت نفس کی حفاظت کا مسئلہ

ملازمت میں عام طور سے تعلیمی لیاقت کے ساتھ ساتھ اسکی محنت و ایمانداری کو بھی دیکھا ہے لیکن عورت کو ملازم رکھنے کے لئیے تعلیمی قابیلیت اور تجربے کے علاوہ اس کی خوبصورتی اور جسمانی خط وخال بھی دیکھے جاتے ہیں۔جس کی وجہ خواتین کو اپنی عزت کی حفاظت کا بھی مسئلہ درپیش ہوتا ہے اس لیے نوکری کرنے

والی خواتین اکثر اپنے آپ کو شیطانی صفات اشخاص سے بچاتی پھرتی ہیں تا کہ وہ محفوظ رہ سکے ۔ایمن ایک عزت دار گھرانے کی لڑکی تھی چوں کہ والدین کی اچانک موت کے بعد ذریعہ معاش کی تلاش اس کے لیے ناگزیر ہوگئی تھی ۔اسی لیے وہ ایک باعزت ، صاف ستھری نوکری کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے لیکن اس کا سابقہ بعض بد اخلاق و بدکردار لوگوں سے پڑتا ہے جو اس کی صلاحیتوں سے زیادہ اس کے جسم کے خط و خال کو ترجیح دیتے ہیں جس سے وہ بے حد رنجیدہ رہتی ہے اور ان واقعات کو بھول نہیں پاتی ہے ۔مثلاً یہ اقتباس دیکھئے جہاں ناول نگار نے ایمن کے نفسیاتی کیفیات کی ترجمانی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ :

''اسے صرف وہ مواقع یاد رہ گئے تھے جہاں اس کی
صلاحیتوں سے زیادہ کمر کے خم اور اس کے خد و خال کے
تیکھے پن کا زیادہ معائنہ کیا گیا تھا ، اور وہ بوکھلا کر باہر
نکل آئی تھی''۔ 64

جب مشکل حالات میں عورت گھر کی ذمہ داری اُٹھانے کی کوشش کرتی ہے تو سماج میں موجود بعض شر پسند اور بدنیت اشخاص عورتوں کا جنسی استحصال کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔عورتیں ایسی ملازمت کو ترجیح دیتی ہیں جہاں سکون اور پاک ماحول انھیں نصیب ہو اور جب ایسا ماحول خواتین کو مل جاتا ہے جہاں وہ اپنی عزت کی حفاظت

کرپاتی ہے تو وہ اس سے باہر آنا بھی پسند نہیں کرتی چنانچہ ناول ''عالم پناہ'' کی ایمن بھی نواب آزر کی والدہ کے یہاں چہار دیواری میں کام کرتی ہے تو اسے وہاں سکون و چین کی زندگی نصیب ہوتی ہے ۔رفیعہ منظور الامین لکھتی ہیں :

''۔۔۔۔وہ کئی بار نوکری کر چکی تھی ، اور اب بھی وہ بے

روزگار نہیں تھی۔ اصل میں اس نوکری کی نوعیت اور اہمیت
کچھ اور تھی۔ اب وہ باہر کی دنیا اس کے اندیشوں اور افتاد
سے تنگ آ چکی تھی۔ وہ حویلی کی چہار دیواری میں سکون اور
طمانیت ڈھونڈ نا چاہتی تھی''۔ 65؎

## اولاد کی پرورش کا مسئلہ

''ناول یہ راستے'' میں ڈورا ایک وفادار ملازمہ کا کردار ادا کرتی ہے۔بیگم اختر بخت اوٹی میں اچانک بیمار ہونے کی وجہ سے ڈورا کو نرس کے طور پر طلب کیا جاتا ہے اس دوران ڈورا اپنی وفاداری اور خدمت گزاری کی وجہ سے بیگم کے دل میں جگہ بنالیتی ہے۔ جب بیگم کو بیٹی نور پیدا ہوئیں تو ڈورا کو طلب کیا جاتا ہے لیکنو ہ ملازمت کرنے سے انکار کر دیتی ہے ۔اس عذر کی وجہ اصل میں اس کے دوسال کا بچہ تھا۔ جو کسی انگریز سے ڈورا کے تعلقات کا پھل تھا۔ جس کو وہ اکیلے ہی پرورش کر رہی تھی۔ ناول نگار رفیعہ منظورالامین ڈورا کے ذریعہ عورت کی اس خوبصورت جذبے کی نشاندہی کی ہے جو ممتا کی صورت میں ہر ماں کے پاس ہوتا ہے۔عورت چاہے کسی بھی قصبہ یا قبیلے سے تعلق رکھتی ہو تعلیم یافتہ ہو یا جاہل ہو، ماں کی ممتا کا روپ ایک ہی ہوتا ہے۔ جو دنیا کے ہر جذبے سے افضل اور پاکیزہ ہے، ڈورا ایک غریب قبائلی عورت تھی جس کا گزر بسر محنت مزدوری کے ذریعے ہی ہوتا ہے لیکن ایسی مجبوری کے عالم میں بھی اس نے اپنی ملازمت اس لیے چھوڑ دی کیوں کہ اس کے سامنے بچے کی پرورش کا مسئلہ درپیش تھا۔ وہ نہایت کسمپرسی کی زندگی گزار رہی تھی بچے کو ہر حال میں خود سے جدا نہیں کر سکتی تھی۔ ملازمت پیشہ خواتین کو اولاد کی پرورش کے سلسلے میں جس طرح کے مسئلہ سے گذرنا پڑتا ہے ۔ڈورا کے ذریعے رفعیہ منظورالامین نیوں پیش کیا ہے:

''ڈورا کو بلایا گیا لیکن اس نے عذرداری کری۔ پھر بھی

بیگم کی خاطر اختر بخت نے ہمت نہیں ہاری ۔۔۔۔۔ہم
اسے اس کی توقع سے زیادہ تنخواہ دیں گے۔۔۔انہوں
نے اپنے فیصلہ کن انداز میں کہا۔لیکن جب وہ خود ڈورا
کو لینے کے لئے پہنچے تو پتہ چلا کہ ڈورا کی مجبوری پیسہ نہیں
بلکہ اس کا دوسال کا بچہ تھا۔سرکار میں آتا تھا۔ڈورا نے
چادر سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا مگر یہ میرا بچہ مسیح ۔۔۔
اس نے پاس بیٹھے گول مٹول سرخ وسپید رنگت والے
بچے کی طرف اشارہ کیا''۔66

کام کرنے والی عورتوں کے ساتھ یہ مسئلہ اکثر درپیش رہتا ہے کہ کام کے اوقات میں شیر خوار بچوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری کس کو سونپی جائے ۔ ہندوستان میں ملازمت پیشہ خواتین کی سہولت کے لیے شیر خوار بچوں کی دیکھ بھال کے لئے خاص انتظام نہیں ہے۔ چند جگہوں پر ''بال واڑی''اور''آنگن واڑی'' جیسے ادارے ہیں لیکن ان اداروں میں خواتین اپنے بچوں کو چھوڑ نہیں سکتیں کیوں کہ وہاں صحت وصفائی کا خاص خیال نہیں رکھا جاتا۔اس لیے بھی عورتیں تذبذب کا شکار رہتی ہیں کہ بچوں کو وہاں چھوڑیں یا نہیں۔ یہ مسئلہ ملازمت پیشہ خواتین کے ہمراہ رہتا ہے۔

## عورتوں کی ملازمت کے انتخاب میں تنگ نظری کا مسئلہ

عورتوں سے ملازمت کے انتخاب کے سلسلے میں اکثر تنگ نظری سے کام لیا گیا ہے ۔ وہ جسمانی اعتبار سے صحت مند ہونے کے باوجود ان کو معلّمی اور طبی پیشو کے اختیار کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔اور اگر طبی ملازمت کا معاملہ ہو تو بھی صرف ڈاکٹر کے پیشہ کو ہی معزز سمجھا جاتا ہے نرس یا کم درجے کی آیا کا پیشے کو اچھی

نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔صغرا مہدی نے اس طرح لکھا ہے:

''ڈاکٹری اور معلّمی کا پیشہ عورتوں کے لئے اور پیشوں کے مقابلے میں زیادہ باعزت سمجھا جاتا ہے۔۔۔اس کے برخلاف نرسنگ کا پیشہ روایتی نسوانی رول سے تو نہیں ٹکراتا۔ لیکن اس میں گندی چیزوں کو چھونا پڑتا ہے ۔مرد مریضوں اور ڈاکٹروں سے سابقہ رہتا ہے۔کام کے اوقات غیر معین ہیں۔اس لئے چند علاقوں اور قوموں کو چھوڑ کر اسے کم مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔اس قسم کے تعصّبات عورتوں کے ڈرامہ موسیقی اور رقص میں حصہ لینے کے سلسلے میں پائے جاتے ہیں''۔ 67؎

اردو ناول نگاروں نے بھی اپنے ناولوں میں اس طرح کے مسائل کو پیش کیا۔خصوصاً نرس کے پیشے کو تنگ نظری سے دیکھا جاتا ہے۔اس مسئلہ کو صالحہ عابد حسین نے ناول ''الجھی ڈور'' میں اپنے کردار ستارا کے ذریعے پیش کیا جو ڈاکٹر کنہیا کے پاس نرس کی طرح ملازمت کرتی ہے۔اس کا بھائی اس نوکری سے خفا ہے اور اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:

''تم نے خواہ مخواہ اپنا کیریر خراب کرلیا۔ایم۔اے۔ کر کے اچھی نوکری مل جاتی ۔ پرائیویٹ نرسنگ ہوم میں کب تک کام کرسکوگی''۔68؎

## اخلاق و کردار کی پاسداری کا مسئلہ

اردو ناولوں میں ملازمت پیشہ خواتین کے جہاں بے شمار مسائل ملتے ہیں وہاں ایک مسئلہ اخلاق و

کردار کی پاکبازی و پاسداری کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ملازمت کرنے والی خواتین کو اپنے اخلاق کو ہر حال میں بہتر رکھنا ہوتا ہے ورنہ دوسروں پر اس کے برے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور ملازمت پیشہ خواتین کو لوگ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے ۔اس طرح کے مسائل کو اردو ناولوں میں پیش کیا گیا ہے ۔اردو ناول نگار صالحہ عابد حسین ’’قطرے سے گوہر ہونے تک‘‘ میں پیش کیا ہے۔ان کے تمام ناول اخلاقی ،معاشرتی اور اصلاحی نقطہ نظر کی غمازی کرتے ہیں۔ان کے ناولوں میں سماجی بیداری اور اصلاحی و اخلاقی رجحانات ہر جگہ نمایاں نظر آتے ہیں ،متوسط طبقہ کے کئی مسائل کے ساتھ تعلیم نسواں کے سلسلے میں انھوں نے کئی مسائل کو پیش کیا ہے۔ساتھ ہی جدید تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیوں کو یہ مشورے بھی دیئے گئے ہیں کہ وہ اعلی تعلیم کے حصول کے دوران اپنے اخلاق اور معیاری قدروں کا خاص خیال رکھیں۔ناول ’’قطرے سے گہر تک‘‘ کی مرکزی کردار عذرا ادبی دنیا میں مشہور ہوجانے کیبعد بھی اپنے اچھے اخلاق و کردار کی مالک ہوتی ہے اور دوسروں کو بھی تعلیم کے فوائد سے روشناس کراتی ہے۔ وہ اپنی سوتیلی بہن غزال کو ایک با اخلاق تعلیم یافتہ لڑکی کی مثال پیش کرتے ہوئے اچھے اخلاق و کردار کی پاسداری کی تلقین کرتی ہے:

’’کسی تعلیم یافتہ لڑکی کی اچھی مثال بہت سیء دوسری لڑکیوں کے لئے تعلیم کا دروازہ کھول دیتی ہے اور ایک بری مثال کتنے معصوموں کو علم کی روشنی سے محروم کردیتی ہے اور عمل کے دروازے ان پر بند ہوجاتے ہیں یادرکھو، ہر بات میں پہل کرنے والوں کو زیادہ سہنا زیادہ سننا اور زیادہ احتیاط کرنی پڑتی ہے۔تمہیں ایسی مثال پیش کرنی ہے میری بہن کہ کسی کی مجال نہ ہو کہ تم پر انگلی اٹھا سکے‘‘۔ 69؎

اکثر شادی شدہ عورتوں کا ملازمت کی وجہ سے اپنے سسرالی رشتہ کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور اپنی

ذمہ داریوں کو بخوبی نبھانا اور شریف النفس ہونا بھی ان کی اولاد کے حق میں نقصاندہ ثابت ہوتا ہے اور خود ان کی زندگی بھی اسی شرافت اور نیک سیرتی کی وجہ سے اکثر خواتین اپنا اور اپنی اولاد کا خیال نہیں رکھ پاتی ہیں۔

ناول ''الجھی ڈور'' صالحہ عابد حسین کا ناول ہے اس ناول میں انہوں نے ایک ایسی لڑکی کی کہانی بیان کی ہے۔ جو ناز و نعم میں پلی بڑھی ہے لیکن شادی کے بعد اسے معاشی مسائل کے باعث مختلف الجھنوں اور خاندانی رشتہ داروں کی جانب سے پیدہ شدہ مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس ناول کی مرکزی کردار آسیہ متوسط طبقے کی لڑکی ہے جس کے دل میں شوہر اور ساس کی خدمت، کا جذبہ ہونے کے باوجود وہ اپنے شوہر احسن کی محبت و اعتماد کو نہ پا سکی۔ اس ناول کا دوسرا کردار احسن احساس کمتری کا شکار ہے قلیل آمدنی کی وجہ سے وہ معاشی پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہے۔

آسیہ اپنی ازدواجی زندگی میں سکون لانے کے لئے اسکول میں ملازمت کرتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ گھر کے تمام کام خوش اسلوبی سے نبھانے کی پوری کوشش کرتی ہے لیکن زیادہ ذمہ داریوں تلے دب کر جان لیوا بیماری میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

بعض اوقات عورتوں کی شرافت اور اچھے اخلاق کا بعض مرد فائدہ بھی اٹھاتے ہیں اور ان کی نیک سیرتی اور خوش اخلاقی کے سبب انھیں نوکری کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ صالحہ عابد حسین نے ناول ''الجھی ڈور'' میں عورت کی ملازمت اختیار کرنے کی وجوہات ہیں۔ احسن جس کی قلیل تنخواہ ہوتی ہے اور اس پر گھر کے افراد کا زیادے بوجھ ہوتا ہے وہ آسیہ کی شرافت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے شادی سے پہلے ہی نوکری کرنے پر زور دیتا ہے تاکہ تمام خاندان کے لئے مدد ہو جائے گی۔ لیکن وہ شادی کے بعد اسکی ملازمت کی ذمہ دیاریوں میں ہاتھ نہیں بٹاتا بلکہ اسے ٹوکتا رہتا اور دیر سے آنے پر عتراض بھی کرتا ہے۔ احسن کے آسیہ کو ملازمت کے سلسلے میں اصرار کرنے کو صالحہ عابد حسین نے یوں پیش کیا ہے:

''تم نے ٹریننگ لی ہے۔ابھی سے نوکری کرلو......ورنہ
شاید بعد میں میرے گھر والے اس پر اعتراض کریں۔تم تو
جانتی ہو مجھ پر بہن بھائی ماں سب کا بوجھ ہے۔میں کہہ
سکوں گا کہ میں بیوی پر زبردستی نہیں کرسکتا۔ وہ اپنی مرضی
سے نوکری کرتی ہے''۔ 70

## جسمانی کمزوری کا مسئلہ

عورتیں طبعاً نازک اور کمزور ہوتی ہیں۔ وہ گھر کے کام کاج کر کے ہی تھک جاتی ہیں اگر انہیں ملازمت کی زائد ذمہ داری سونپی جائے تو ان کی صحت پر منفی اثرات ہو سکتے ہیں۔اردو ناول نگاروں نے عورتوں کی جسمانی کمزوری پر زیادہ ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دب کر بیماری میں مبتلا ہونے اور اپنی صحت کا خیال نہ رکھنے کی صورت میں موت کے آغوش میں چلے جانے کی صورتحال کی بہترین عکاسی کی ہے ساتھ ہی اس کی وجوہات کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ گھر کے افراد کا مدد نہ کرنے اور گھریلو کاموں میں ہاتھ نہ بٹانے کے سبب عورتیں اس مسئلہ سے دوچار ہوتی ہیں۔ ناول ''الجھی ڈور'' میں صالحہ عابد حسین نے آسیہ کی صحت کے سلسلے میں اس حقیقت کو پیش کیا ہے:

''آسیہ آج کچھ زیادہ ہی تھک گئی تھی۔ٹانگیں بے جان
سی لگ رہی تھیں۔ چار پانچ گھنٹے بچوں سے سر کھپایا۔اوپر
سے نیچے اور نیچے سے اوپر دوڑتے دوڑتے ٹانگیں شل
گئیں۔سانس الگ پھولنے لگتا ہے۔''ارے اللہ توبہ کہیں
اماں جان کی طرح دمہ نہ ہو جائے۔جانے یہ اسکول کی دو تین
منزلیں کیوں بنوائی گئی ہیں۔اور اب یہ تھیلا۔اُف کتنا بھاری

ہے۔بازار میں کس قدر بھیڑ تھی۔کسی سے اتنا نہیں ہوتا کہ کم از

کم بازار کا سودا سلف ہی لائے یا منگا دے"۔71؎

مرد حضرات اکثر صرف اپنی ملازمت یا کاروبار میں ہی دلچسپی لیتے ہیں۔وہ گھر کے کاموں میں حصہ نہیں لیتے یا انہیں دلچسپی نہیں رہتی۔گھر کے کام کی مکمل ذمہ داری عورتوں پر ہوتی ہے۔گھر کی صاف صفائی، کھانا پکانا، کپڑے، برتن دھونا وغیرہ سب عورتوں کو کرنے پڑتے ہیں۔ان کا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہیں ہوتا ہے۔اگر کوئی عورت ملازمت کرتی ہے۔تب بھی گھر کے تمام کام اسی کو کرنے پڑتے ہیں۔یہ دوہری ذمہ داریاں ان کی جسمانی صحت کے اعتبار سے زیادہ ہوجاتی ہیں اور اسی وجہ سے اکثر عورتیں بیمار پڑ جاتی ہیں یا جسمانی اعتبار سے کمزوری محسوس کرتی ہیں۔ناول"الجھی ڈور" کی آسیہ بھی آفس سے آنے کے بعد تھکن محسوس کرتی ہے اور گھر کے دیگر امور کے انجام دینے کے لیے اس کی جسمانی طاقت جواب دیتی ہے تب وہ کہتی ہے:

"اُف ......سر کتنا چکرا رہا ہے۔مگر ابھی تو کھانا پکانا

ہے۔بچی کے کپڑے دھونے ہیں"۔ 72؎

انسان بے شمار سیاسی سماجی اور تہذیبی مسائل میں گھرا ہوا ہے۔اس کے ساتھ صحت، مرض، دولت غربت، تکلیف و آسائش بھی لگی ہوئی ہے بسا اوقات معاش کے لئے اسے سخت جدوجہد اور محنت کرنی پڑتی ہے اپنی اور اپنے خاندان کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لئے بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان حالات میں مرد وعورت دونوں کو ذہنی سکون و آرام کی ضرورت پڑتی ہے۔اگر وہ دونوں ایک دوسرے کا ساتھ دیں تو زندگی کی گاڑی آسانی سے آگے بڑھتی ہے۔لیکن اکثر ایسا نہیں ہوتا۔عورتوں کو ہی نوکری کی اور گھر کی دونوں ذمہ داریاں نبھانی پڑتی ہیں۔ناول"الجھی ڈور" میں آسیہ اپنی ملازمت اور گھر کے کاموں کے دوہرے بوجھ تلے دب کر ذہنی دباؤ کا شکار ہوجاتی ہے کیوں کہ اسے نہ تو شوہر کی رفاقت و ہمدردی نصیب ہوتی ہے اوور نہ ہی ذہنی

سکون ملتا ہے۔ انہی وجوہات سے وہ پریشان ہو جاتی ہے۔شوہر کی بدسلوکی سے اس کی زندگی جہنم بن جاتی ہے۔اس سلسلے میں صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں:

''نہیں ...... وہ نہ بیاہتا ہے نہ بیوی ...... نہ دوست نہ
رفیق ۔ وہ تو باندی ہے بے داموں کی لونڈی ۔ دن بھر اس
کے گھر، بچوں، ماں بہنوں کی خدمت کرے، کما کر لائے،
رات کو آقا کے ہوس کے شعلوں کو بجھائے''۔ 73

اردو ناول نگاروں نے ملازمت پیشہ عورتوں کی تکالیف، دکھ درد، جسمانی اور ذہنی پریشانیوں کا ذکر بڑی خوبی سے اپنے ناولوں میں کر کے ان کے حل کی کوشش کی ہے۔

## اپنی خواہشات کو پورا نہ کر پانے کا مسئلہ

ملازمت پیشہ خواتین کی تنخواہ پر کس کا حق زیادہ ہونا چاہئے ؟ یہ سوال معاشرے کے اکثر گھرانوں میں ہوتا ہے عورت کی تنخواہ پر شوہر کا حق ہے یا ساس سسر کا یا ماں باپ کا یا اپنے بچوں کا۔ ہندوستانی سماج میں عورت شادی سے پہلے باپ کی زیر سرپرستی رہتی ہے اور شادی کے بعد وہ شوہر کی نگرانی میں رہتی ہے۔

آسیہ ایک اسکول میں پڑھاتی ہے اور اس کا شوہر احسن آفس میں معمولی کلرک ہے۔ان کی دس برس کی بیٹی گڈی ہے جو بیمار رہتی ہے آسیہ چاہتی ہے کہ اس کی اپنی تنخواہ میں سے چند روپئے بیٹی کے لیے خرچ کریں لیکن اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لیے وہ بیٹی کے لیے کچھ نہیں کر پاتی ہے اور اس فکر سے پریشان رہتی ہے ایک مثال دیکھئے:

''تھیلے میں سے گھی کا چھوٹا ڈبہ، دالوں کی پڑیاں، شکر کی
تھیلی، گوشت نکال کر تخت پر رکھا۔ پھر ہاتھ ڈال کر ایک

ڈبل روٹی اور تین انڈے نکالے۔ تین انڈے، ایک اماں
جان کا، ایک بیٹے صاحب کے لئے ! رہا ایک وہ ستارا
کھائے گی۔ جی چاہے گا تو گڈی کو اسی میں سے ذرا سا
دیدے گی ورنہ نہیں!

نامراد کے پیٹ میں پاؤ آدھ سیر دودھ جائے ایک انڈا
کچھ پھل اور یخنی ملے تو طاقت بھی آئے۔ مگر یہاں تو اماں
جان کی دواؤں اور پرہیزی طاقت کی غذاؤں پر پیسے خرچ
کرنے ہیں! بچی کا کیا ہے ماں اور بچی ساتھ ہی چلی جائیں
اس دنیا سے تو۔۔۔۔'' ۔ 74

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس اردو ناولوں نگاروں نے ملازمت پیشہ خواتین کی آرزوں اور خواہشات کو جب وہ پورا نہیں کر پاتی ہیں تو کس طرح کی نفسیاتی کیفیات سے دوچار ہوتی ہیں اس کا بھی جائزہ لیا ہے۔

## ملازمت پیشہ خواتین کو شک کی نگاہ سے دیکھنے کا مسئلہ

عورت جب گھر سے باہر نکل کر ملازمت کرتی ہے تو سماج میں اس کو عموماً شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے یا اس پر سماج اور خود خاندانی رشتہ داروں کی نگاہیں ہمیشہ رہتی ہے کہ آیا وہ شرافت کے دائرے میں ہے یا نہیں۔ اس کا بے پردہ مردوں کے درمیان میں اٹھنا بیٹھنا ہندوستانی معاشرے میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اردو ناول نگاروں نے بھی اس مسئلے کو اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ کو صالحہ عابد حسین نے ناول ''الجھی ڈور میں اس مسئلہ کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔ آسیہ کی سوتیلی ماں اس کی نوکری اور مردوں کے درمیان اٹھنے بیٹھنے کے عمل کو شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور آسیہ کے والد سیآسیہ کی نوکری پر اعتراض کرتے ہوئے شکایت کرتی ہے۔ مثلاً اقتباس دیکھیے :

''بڑی بیٹی پردہ نہیں کرتی ! نوکری کرتی ہے، مردوں
سے ملتی جلتی ہے اس کی آزادی۔خدا بچائے!!!''۔ 75

اس ناول میں آسیہ کی ملازمت کرنے اور مردوں سے دوستانہ تعلقات پر اعتراض کیا جاتا ہے، دوسری طرف آسیہ کا شوہر جب دوسری عورتوں کے ساتھ پارکوں میں گھومتا پھرتا ہے تو وہ قابل اعتراض نہیں سمجھا جاتا۔ملازمت پیشہ خواتین کے ساتھ اس طرح کے الزامات اوراعتراضات اور نامساویانہ سلوک کی وجہ سے بھی ان کی ذہنی و جذباتی کیفیات اور صحت پر خراب اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

## شوہر کا احساس کمتری کا رویہ

میاں بیوی دونوں ملازمت کرتے ہیں تو دونوں کی تنخواہ کے فرق کی وجہ سے ازدواجی زندگی میں الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔اگر بیوی کی تنخواہ یا آمدنی زیادہ ہو تو اکثر شوہر احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔اردو ناول نگاروں نے بھی اس مسئلے کو اپنے ناولوں بخوبی سمویا۔ناول الجھی ڈور میں صالحہ عابد حسین نے اس مسئلہ کو میں آسیہ کی ازدواجی زندگی کو بیان کرتے ہوئے پیش کیا ہے آسیہ جو کہ اس ناول کا مرکزی کردار ہے وہ ایک خدمت گذار وفا شعار بہو اور بیوی کے فرائض انجام دیتی ہے وہ اپنے والدہ کی طرف سے ملی ہوئی جائیداد کی آمدنی کے علاوہ خود نوکری کر کے شوہر اور سسرال کی مدد کرتی ہے لیکن اس کی اتنی محنت، خدمت اور جذبہ ایثار کی شوہر اور سسرال والوں کی نظر میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔شوہر کو بات بات پر طعنہ دیتا اور اس کے جذبات واحساسات کو سمجھنے کی بجائے اس کی وفاؤں کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔چنانچہ آسیہ سے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے احسن کہتا ہے:

''آخر وہ سمجھتی کیوں نہیں !میں کس بات میں اس سے
گھٹیا ہوں۔ وہ سوسوا سو کماتی ہے، میں سات سو۔ پانسو

سہی۔کما کراسے دیتا ہوں اس کی زمین ہے ہوا کرے قرض

ادا کرتی ہے میرا۔۔۔تو کیا ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔مجھ پر کیا

احسان کیا''۔ 76

# شوہر کا احساس برتری کا مسئلہ

ملازمت پیشہ خواتین کے ساتھ نہ صرف احساس کمتری کی وجہ سے برا سلوک کیا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات احساس برتری کی وجہ سے نشانہ بنایا جاتا ہے اردو ناول نگاروں نے شوہروں کے اس برتاؤ اور سلوک کی بڑی عمدہ عکاسی کی ہے۔اردو ناول نگاروں میں صغرا مہدی نے خواتین کے مسائل کی بہترین عکاسی کی ہے۔وہ ایک حساس قلمکار رہے۔انھوں نے نہ صرف خواتین کے مسائل کو بڑی خوبی سے اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے بلکہ خواتین کے مسائل کی یکسوئی کے لیے ایک رپورٹ بھی''ہندوستانی سماج میں عورت کی حیثیت'' کے عنوان سے پیش کی ہے۔

ناول''راگ بھوپالی''میں بھی انھوں نے شوہر کا احساس برتری کا شکار ہوکر اپنی بیوی رابعہ کے ساتھ زیادتی کرنا اور طعنہ زنی کرنا جیسے مسئلہ کو بیان کیا ہے۔جس کی وجہ سے رابعہ نفسیاتی دباؤ کا شکار ہر کر اپنے حالات سے غیر مطمئن رہتی ہے۔ ہندوستانی معاشرے میں خاندان اور رشتہ داروں کی بڑی اہمیت ہے رابعہ ایک مشترکہ خاندان کی فرد ہے جو اپنی ماں' پھوپھی اور خالہ پر ہوئے مظالم کی وجہ خوف زدہ رہتی ہے اور خاندانی رشتوں اور تناؤ بھرے ماحول سے دور رہنا پسند کرتی ہے۔اور ہاسٹل میں رہ کر اپنی تعلیم کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔کالج میں عادل اور علی سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔بعد میں تعلیم مکمل ہونے کے بعد تینوں ایک میوزیم میں ملازمت اختیار کر لیتے ہیں۔رابعہمیں تعلیم کی وجہ ایک زندگی جینے کا شعور آجاتا ہے اب وہ باہمت اور حوصلہ مند خاتون بن جاتی ہے۔رابعہ کی شادی عادل کے ساتھ اپنے والدین کی مرضی سے روایتی انداز

میں ہوتی ہے۔ وہ بیوی اور بہو کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ایک بیٹی کی حیثیت سے اپنے ماں باپ کی خدمتبھی کرنا چاہتی ہے جس پر عادل کو اعتراض ہوتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ رابعہ صرف اپنے گھر اور کیریئر کی فکر کرے۔ عادل کے ان خیالات سے رابعہ کو بڑی پریشانی ہوتی ہے وہ عادل کے احساس برتری کے رویہ سے اس لیے نالاں رہتی ہے کہ صدیوں سے عورت کے ساتھ مردوں کا یہی رویہ ان کے ساتھ ناانصافی کی وجہ بنتا ہے۔ جب وہ مرد کے گھر کو اپنا گھر سمجھتی تو م پھر اس کو اپنے ماں باپ کی خدمت سے کیوں دور رکھا جا رہا ہے ۔مذہب اسلام نے مرد اور عورت کے برابر حقوق رکھے ہیں تو پھر کیوں شوہر عورت کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ نابرابری کا سلوک کیا جاتا ہے۔ رابعہ عادل کی باتوں کو یاد کر کے اسی ذہنی ونفسیاتی کشمکش میں مبتلا رہتی ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> ''تمہیں تو اپنے کیریئر کی فکر ہو، اپنے گھر کی فکر ہو، وہ'' اپنے'' پر زور دے کر کہتا۔ اس کو اسی پر اعتراض تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کے گھر کو ''اپنا گھر'' کیوں کہتی ہے۔ عجیب نفسیات ہوتی ہے ان مردوں کی غریب عورتوں پر حکومت کرنے اور ان کو اپنی ملکیت بنانے کا سبق تو بچپن سے ہی سیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں یہ بات شروع سے ہی بٹھائی جاتی ہے کہ وہ عورت سے ہر طرح برتر ہیں اعلیٰ ہیں افضل ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عورت ان کی ملکیت ہے''۔ 77

اس ناول میں صغرا مہدی نے بڑی عمدگی سے رابعہ کے اس مسئلہ کے ذریعے ملازمت پیشہ خواتین کے مسائل کی بڑی عمدگی سے تصویر کشی کی ہے۔ مرد کا ایک عورت کے ساتھ غیر اخلاقی و ناشائستہ رویہ ہمیشہ سے

رہا ہے۔صغرا مہدی نے اس ناول میں رابعہ کے اس مسئلہ کو احتجاجی انداز میں پیش کیا ہے کیوں کہ جب تک ملازمت پیشہ خواتین کے شوہر انھیں اپنا ہم سفر، رفیق اور دوست نہ سمجھے تب تک وہ اس کے ساتھ اچھا سلوک روا نہیں رکھ سکتے ۔ یہی وجہ ہے کہ ناول نگار نے ان کرداروں کے ذریعہ یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ عورت کو جب تک محض ایک شئے سمجھا جائے تب تک اس کے ساتھ ناانصافی ہوگی اور جب اسے ایک انسان کا درجہ دیا جائے گا اور مساوی سلوک کیا جائے گا تب تک اس کی ذہنی الجھنوں کا حل نہیں نکل پائے گا۔اپنے انہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

''اپنے کیریئر کے انتخاب اور پھر اس کو بنانے میں اس کو کن کن الجھنوں کا سامنا کرنا پڑا ایک طرف اس ناانصاف سماج میں ایک فرد کی حیثیت سے لڑنا پھر دوسری طرف عورت ہونے کے ناطے جو زیادتیاں ہمارے معاشرے میں ہوتی ہیں ان کے خلاف آواز اٹھانا ۔ ہر وقت اپنی مدافعت میں چوکس رہنا قدم قدم پر اس مردوں کی دنیا میں ان سے ٹکر لینا جن کے ذہن میں عورت کا ایک مخصوص تصور ہے جو ایک لمحہ کو یہ نہیں بھول پاتے کہ وہ عورت کے پاس بیٹھے ہیں وہ عورت کے ساتھ کام کر رہے ہیں مردوں کے ذہن میں عورت ایک شئے ہی رہے گی'' ۔ 78

## شوہر سے دور رہنے کا مسئلہ:

صغرا مہدی نے ناول ''راگ بھوپالی'' میں شوہر اور بیوی کی ملازمت کے دوران دوسرے مقامات پر تبادلے کی صورت میں میاں بیوی کا علاحدہ زندگی بسر کرنا اور بیوی سے علاحدہ رہنے کی صورت میں شوہر کا

دوسری عورتوں سے رشتے قائم کرنے کے مسئلہ کو بھی پیش کیا ہے۔روی عادل کا دوست ہے جو اپنی نوکری کے سلسلے میں دلی میں رہتا ہے اوراس کی بیوی شملہ میں ملازم ہے جس کی وجہ سے یہ دونوں مہینوں ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں، الگ رہتے ہوئے روی کی بیوی اپنی بیٹی کی پرورش کی ذمہ داری سنبھالتی ہے جبکہ روی بیوی سے دور دوسری عورتوں کے ساتھ رشتے استوار کرتا ہے۔روی کی اپنی بیوی کے ساتھ بے وفائی کا ذکر ناول میں دو دوستوں کی آپسی گفتگو کے ذریعے کیا گیا ہے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''کیا روی کا یہاں کوئی افیر چل رہا ہے روی کے جانے
> کے بعد اس نے عادل سے پوچھا اونہہ اس کے افیر تو چلتے
> رہتے ہیں۔
> روی کی شادی ہوگئی ہے اس کی چھ سال کی بچی بھی ہے تو
> پھر اس کی بیوی کہاں ہے۔ وہ شملے میں رہتی ہے اپنے
> ماں باپ کے پاس نوکری کرتی ہے روی دہلی میں نوکر ہے۔
> مگر یہ لوگ چھٹیاں بھی ایک ساتھ نہیں گزارتے ۔ وہ
> جاڑوں میں روی کے پاس آجاتی ہے یہ کبھی چلا جاتا ہے۔۔
> ۔۔روی یہاں رنگ رلیاں منا رہا ہے اور اس کی بیوی وہاں
> اکیلی رہ کر نوکری کر رہی ہے بچی کو پال رہی ہے''۔ 79

سرکاری ملازمتوں کی وجہ سے مجبوراً خواتین کو شوہروں سے دور رہنا پڑتا ہے عورتیں اس معاملے میں اکثر قربانیاں دیتی ہیں لیکن بعض مرد بیوی سے دوری کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور غیر ضروری افیر رکھتے ہیں۔جس سے ان کی ازدواجی زندگی میں خلل پیدا ہوتا ہے۔

## شک کی بناپر بے جا روک ٹوک کا مسئلہ

اکثر شوہر ملازمت پیشہ بیوی کے الگ رہنے سے دوسری عورتوں سے افیر کرنا معیوب نہیں سمجھتے لیکن جب بیوی اپنے کسی پرانے دوست یا دفتر کے کسی مرد سے ملتی ہے یا بات کرتی ہے تو یہ برداشت بھی نہیں کر پاتے ہیں یہیں جا کر عورتیں مجبور ہو جاتی ہیں ایسی صورت میں یا تو انھیں نوکری چھوڑنا پڑتا ہے یا پھر کسی سے بات کرنا چھوڑنا پڑے گا جسکی وجہ سے عورتیں ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتی ہیں ایک طرف نوکری کی ذمہ داریاں اور بچوں کی تعلیم و پرورش کی ذمہ داری دوسری طرف شوہر کا غیر اخلاقی سلوک اسکی الجھنوں کو اور بڑھا دیتا ہے ۔ناول ''راگ بھوپالی'' میں رابعہ کے سامنے بھی یہی مسئلہ آتا ہے جب عادل، رابعہ کی علی کے ساتھ دوستی کو پسند نہیں کرتا اور اسے دور رہنے کی ہدایت دیتا ہے۔اقتباس دیکھئے:

> ''اس نے ایک دفعہ کہا تھا رابعہ تم علی سے ملنا کم نہیں
>
> کرسکتیں۔
>
> کیوں؟
>
> بس میں چاہتا ہوں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ 80

رابعہ کو عادل کے اس رویہ سے بے حد تکلیف ہوتی ہے اسے عادل کی یہ بات بُری لگتی ہے کہ اس کا شوہر اس پر محض شک کی بنیاد پر اس پر پابندیاں عائد نہ کرے کیوں کہ سب اچھے دوست ہے پرانی دوستی ہے اور نوکری پیشہ خواتین پر ایسی بے جا پابندیاں جو محض شک کی بنا پر کی جائے رابعہ اسے گوارا نہیں کرتی ہے اور اسی وجہ سے دونوں میں غلط فہمیاں بڑھ جاتی ہیں جو علاحدگی کی صورت اختیار کرتی ہے ۔ملازمت پیشہ عورتوں پر شوہر کی بے جا پابندیاں اور غیر اخلاقی سلوک سے بھی ان کی پرسکون زندگی میں ہلچل پیدا ہوتی ہے۔

# جنسی استحصال کا مسئلہ

ملازمت پیشہ عورتوں کے ساتھ سب سے اہم مسئلہ جنسی استحصال کا مسئلہ ہوتا ہے۔ اکثر خواتین مجبوری میں نوکری کرتی ہیں اور نوکری حاصل کرنا بھی آج کے دور کا اہم مسئلہ ہے۔نوکری حاصل کرتے وقت یا پھر نوکری کے دوران انھیں ایسے اشخاص کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو ان کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کے ساتھ جنسی استحصال کرتے ہیں۔ ناول نگار غضنفر نے ناول ''' کینچلی '' میں مینا کی زندگی میں شوہر کی بیماری کی صورت میں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش اور دوران ملازمت درپیش مسائل کے ذریعہ عورتوں پر کئے جانے والے جنسی استحصال کے مسئلہ کو زیر بحث لایا ہے۔

ناول ''کینچلی'' کی کہانی ایک خوشحال جوڑے دانش اور مینا کے گرد گھومتی ہے۔ دانش سرکاری دفتر میں اعلیٰ عہدہ پر فائز ہے لہٰذا مینا اور دانش عیش وعشرت میں زندگی بسر کرتے ہیں اور جب وہ سیر وتفریح کی غرض سے کشمیر جاتے ہیں تو وہاں دانش پر فالج کا حملہ ہوتا ہے اور وہ مفلوج ہوجاتا ہے اس کی بیماری کے علاج ومعالجہ میں گھر کا اثاثہ ختم ہوجاتا ہے اور اس کو نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے جب دو وقت کی روٹی کے لالے پڑ جاتے ہیں تو مینا دانش کے دفتر میں نوکری کی تلاش میں جاتی ہے چونکہ حکومت کی طرف سے سرکاری ملازمین کو یہ سہولت مہیا ہے کہ اگر دوران ملازمت کسی ملازم کی موت واقع ہوجائے یا وہ کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہوجائے تو اولاد یا بیوی کو ملازمت فراہم کی جائے۔ اسی سہولت سے مستفیض ہونے کے لئے مینا، دانش کے دفتر جاتی ہے اور دفتر میں اسے دانش کی طرف سے رکھی گئی چند شرائط کو ماننا پڑتا ہے۔ ناول نگار نے اس کہانی کے ذریعہ ہمارے معاشرے میں خواتین کے ساتھ ہورہی زیادتیوں کی طرف اشارہ کیا اور بتایا کہ اس طرح کے استحصال سے عورت کے دل ودماغ پر کس طرح کے اثرات پڑتے ہیں مینا اور دیپا کی گفتگو سے ان کی اس پریشانی کا پتہ چلتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

''مجھے کوئی کام مل سکتا ہے؟''

''کام!''

ہاں دیپا! میں کچھ کرنا چاہتی ہوں اس کے بغیر چارہ نہیں'
راشد کہہ رہے تھے کہ کام تو تمہیں دولہا بھائی کے دفتر
میں بھی مل سکتا ہے۔ کیا دولہا بھائی نے بتایا نہیں کہ سرکار کی
طرف سے اس کا پروویژن ہے کہ اگر..................''

''ہے تو مگر صرف کاغذ پر............ میں اس سلسلے میں
سپرنٹنڈنٹنگ انجینئر سے ملی بھی تھی لیکن جس شرط پر وہاں نوکری
مل رہی تھی مجھے گوارا نہ تھی''۔''صاف صاف بتاؤ نا کیا ہوا؟''

''دفتر میں تو اس نے صاف منع کر دیا کہ کوئی جگہ خالی
نہیں ہے جب میں نے بہت منت سماجت کی اور کہا کہ میں
چپراسی کی جگہ بھی کام کرنے کے لئے تیار ہوں تو بولا کہ شام
کو گھر آ جانا۔ میں چیف انجینئر صاحب سے کہہ کر تمہیں کسی
ڈویژن میں رکھوا دونگا۔ جب میں گھر پہنچی تو وہ حرامی انتہائی
بے شرمی سے بولا کہ نوکری حاصل کرنی ہے تو آج رات
میرے پاس رہ جاؤ!'' 81

ناول میں آگے یہ بھی بتایا گیا کہ قانون اور عدالتوں کے ہونے کے باوجود کوئی بھی اعلیٰ افسران سے ڈرتے نہیں ہیں اور یہی سمجھتے ہیں کہ اکیلی اور بے سہارا عورت ہندوستان میں جس ڈپارٹمنٹ میں اس کے خلاف آواز اٹھائی جائے گی اس کی سنوائی کے لئے اس سے جنسی استحصال کیا جائے گا یا پھر راضی خوشی یہ سب

کچھ کرنے پر مجبور کیا جائے گا یہی حال مینا کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ آفیسر کی بدتمیزی کے خلاف پولیس میں شکایت کرنے کی بات کرتی ہے تو وہ قہقہ لگا کر ہنستا ہے اور اسے ملازمت کے حصول کیلئے اس کے ساتھ ہو رہے جنسی استحصال کا احساس دلاتا ہے۔ ناول سے ایک مثال دیکھئے جب دیپا' مینا سے آفسر کی بدتمیزی کا جواب دینے کی بات کرتی ہے تو اس کے جواب میں مینا کہتی ہے:

''اس نے یہ کہا! تم نے اس سور کا منہ کیوں نہیں نوچ لیا'' منہ تو کیا نوچتی ہاں دھمکی ضرور دی کہ اس کی شکایت اوپر والوں کو کروں گی لیکن میری دھمکی کا اس پر یہ اثر ہوا کہ اس کے منہ سے قہقہہ پھوٹ پڑا۔۔۔۔ بولا کہ جہاں بھی جاؤ گی یہی مطالبہ ہوگا۔ شکایت سننے کے لئے بھی یہی شرط رکھی جائے گی''۔82

صادقہ نواب دورِ حاضر کی ہمہ جہت فنکار ہیں انھوں نے ناول کے علاوہ شاعری' افسانہ ڈورامہ' تنقید ترجمہ اور ادب اطفال کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ وہ اردو ادب کے علاوہ ہندی ادب میں میں بھی شاعری' افسانے اور ناول لکھ کر اپنی فنکاری کا لوہا منوایا ہے۔'' کہانی سناؤ متا شا'' ان کا پہلا ناول ہے اس ناول میں انھوں نے اس ناول میں مرکزی کردار'' متاشا'' کے ذریعہ ہندوستان کے سماجی اتار چڑھاؤ مذہبی روایات' معاشی رسا کشی کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اس ناول میں عورت کی مظلومی، سماجی ناانصافی، اور جنسی استحصال کا بیان موثر پیرائے میں کیا گیا ہے۔

متاشا اپنے باپ کی سازشوں کا شکار ہوتی ہے۔ متاشا کی ماں اور دادی کو اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے تو وہ علی گڑھ چاچا کے گھر جاتے ہیں۔ جہاں پر وہ اپنی بدحالی کی وجہ سے ایک چھوٹے سے کرائے کے گھر میں

رہنے پر مجبور ہوتی ہے وہاں اس کے کا کا (چاچا) متاشا کو ایک اسکول میں ٹیچر کی نوکری دلواتے ہیں لیکن اس احسان کے بدلہ وہ متاشا کا جنسی استحصال کر کے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ متاشا خود اپنے کا کا کے اس فعل کا بیان کرتی ہوئی کہتی ہے:

''اگلے دن کا کا نے ہمیں بتایا کہ انہوں نے ہمارے لئے دو کمروں کا مکان کرائے پر لیے رکھا ہے۔ وہاں ایک مہنے کا راشن بھروا دیا ہے انہوں نے مجھے ڈاکٹر ذاکر حسین اسکول میں پہلی کلاس کی ٹیچر کی نوکری دلا دی' میں نے اپنے اسکول کے پرنسپل سے بات کی ہے۔ اگلے مہینے تمہاری تنخواہ دوسو روپئے بڑھا دی جائے گی۔ تم جانتی ہو میں اسکول کے ٹرسٹیوں میں سے ایک ہوں ! کہتے کہتے کا کا قریب آئے'' تم بہت اچھی ہو' تمہارے پڑھانے کا طریقے سے اور اچانک کا کا نے میرے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر میرے ہونٹوں کو زور سے چوم لیا۔ ایک لمحے کو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ تب ہی انہوں نے میرے ہونٹوں کو کاٹ لیا۔ میں جیسے ہوش میں آ گئی۔ میں زور سے چیختے ہوئے باہر نکل گئی''۔83؎

بے سہارا اور مجبور ولاچار عورتوں اور لڑکیوں کے لیے نہ صرف سماج کے بے حس مرد بلکہ اپنے ہی رشتہ کس طرح استحصال کرتے ہیں اس ناول میں بڑی عمدگی سے بتایا گیا ہے۔ اردو ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں ملازمت پیشہ خواتین کے اس مسئلہ کو جگہ جگہ بیان کیا ہے تا کہ اس طرح کے مسائل کا سماج سے خاتمہ ہو سکے

۔ یہ مسئلہ آج ہمارے معاشرے کا ایک اہم مسئلہ بن چکا ہے۔ جس کی وجہ سے خواتین اکثر نوکری کرنے سے گھبراتی ہیں کیوں کہ سماج میں ان کی عزت کی حفاظت بھی مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔

## ظاہری حسن اور خدوخال کی نمائش کا مسئلہ:

عورتوں کی ملازمت کے سلسلے میں جسمانی خدوخال کو اکثر اہمیت دیا جاتا ہے اس مسئلہ پر صادقہ نواب نے اپنے ناول ''کہانی سناؤ متاشا'' میں کیا ہے۔ اس ناول میں ایر ہوسٹیس کے انٹرویو کے دوران کس طرح خواتین کی جسمانی خوبصورتی اور اس کے میک اپ اور ماڈرن ڈریس کی ترجیحات پر توجہ دی جاتی ہے اس کا بیان متاشا کی زبانی کر کے صادقہ نواب نے اس کا بڑا عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔ مثلاً لکھتی ہیں:

''ریسپشن میں ڈھیر ساری لڑکیاں ہیں ماڈرن لباس'
میک اپ اور ہیر اسٹائل میں بیٹھی ہوئی تھیں ۔ میرے پاس
ویسے کپڑے کہاں تھے۔ ایک سیدھا سادا سا لباس پریس کر
کے پہن لیا تھا۔ آنکھوں میں ہلکا کاجل اور بہت ہلکا لب
اسٹک میرا کل میک اپ تھا۔ مجھے کیا سیلیکٹ کریں گے!
میرا اپنے اوپر اعتماد کم ہونے لگا''۔ 84

انٹرویو میں قابلیت سے زیادہ عورت کی لمبائی اور ظاہری خدوخال کو ترجیح دینے کے غلط رواج کو ناول نگار نے اسطرح بیان کیا ہے۔:

''ایک لڑکی اندر گئی اور دومنٹ میں فوراً لوٹ آئی
کسی نے پوچھا۔
کیا ہوا؟۔۔۔ تو جواب دیا کہ
میں ساڑھے چار فٹ کی ہوں نا' دیکھتے ہی

ریجیکٹ کر دیا

انٹرویو بھی نہیں لیا

کیا تم نے بائیوڈاٹا میں ہائیٹ مینشن نہیں کی تھی ؟ کسی

نے پوچھا ''ہاں شاید'' 85۔

## ملازمت کے حصول کے لیے سیاسی لیڈروں کی سفارش کا مسئلہ

نوکری حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ عہدیداروں اور سیاست دانوں سے تعلق ہونا ضروری ہوگیا ہے چونکہ نوکری حاصل کرنے کے لئے متعلقہ میدان میں مہارت رکھنے سے زیادہ اعلیٰ عہدیداروں کی خوشامد اور سیاست دانوں کی سفارش ضروری ہوتی جارہی ہے۔عصر حاضر کے اس اہم مسئلہکو خواتین کی ملازمت کے حصول کے سلسلے میں صادقہ نواب نے اپنے ناول ''کہانی سناؤ متاشا'' میں متاشا اور اس کی سہیلی کی آپسی گفتگو کے ذریعے یوں بیان کیا ہے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''کیا تمہیں لگتا ہے کہ یہ جاب تمہیں مل جائے گی''

''اگر قسمت اچھی رہی تو''

''یہاں پہنچے ہوئے پالیٹیشن ( سیاست دانوں ) کی لڑ

کیاں آئی ہوئی ہیں'' میں چپ رہی۔''86۔

اس طرح اردو ناول نگاروں نے خواتین کی ملازمت کے سلسلہ میں ان کی خوبصورتی اور ظاہری خدوخال کے مسئلہ کو بھی موضوع بنا کر ان کے مسائل کی بڑی عمدگی سے عکاسی کی ہے۔

## عدم مساوات کا مسئلہ

عصر حاضر میں معاشی رسا کشی کی وجہ مرد وعورت دونوں کے لیے ملازمت کا حصول ضروری ہوگیا

ہے جس کا ذکر دور جدید کے ناول نگار غضنفر نے ناول کینچلی میں سوال و جواب کے پیرائے میں عورت کی ملازمت کی صورتیں اوران کا حل اس طرح لکھا ہے:

''میں پوچھتی ہوں کہ شوہر آشرم خیرات خانے میں کیوں جائے؟ اگراس کے گھر اور کوئی نہیں ہے تو کیا بیوی اس کی کفالت نہیں کرسکتی؟ کیا عورت اس قابل نہیں ہوتی کہ کما سکے۔ اپنے بیمار شوہر کی ذمہ داری اٹھا سکے؟ یا کیا عورت ملازمت نہیں کرسکتی؟ یا کیا اس کے اندر کام کرنے کو صلاحیت نہیں ہوتی؟ آپ کے سماج کا یہ قانون بھی عجیب ہے کہ عورت کی کفالت یا نان نفقہ کی ذمہ داری صرف مرد کو سونپی جاتی ہے مرد اس ذمہ داری کو اٹھاتا بھی ہے۔ مگر جب کبھی وہ بیکار ہو جاتا ہے تو اس صورت میں اس کی ذمہ داری عورت پر عائد نہیں ہوتی جب کہ عورت بھی یہ ذمہ داری اٹھا سکتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہاں بھی عورت کی صلاحیت اور اس کی طاقت کو نظر انداز کیا گیا ہے ممکن ہے جب یہ قانون بنا ہو اس وقت کی عورت ذہنی جسمانی دونوں اعتبار سے کمزور نظر آئی ہو مگر آج جب کہ اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ کسی بھی اعتبار سے مرد سے کمتر نہیں ہے تو پھر زندگی کے سفر کی گاڑی میں اسے برابر کا شریک کیوں نہیں کیا جاتا؟ کفالت کی ذمہ داری اس پر بھی کیوں نہیں عائد کی جاتی؟ فرض کیجیے شادی کے وقت لڑکی لڑکے سے زیادہ مال دار ہو

بڑی ملازمت کرتی ہواورلڑکے کے پاس مال واسباب نہ ہوں یا
وہ بے کار ہوتو کیااس صورت میں کفالت کی ذمہ داری لڑکے کو
سونپنا کسی بھی طرح مناسب لگتا ہے؟''۔ 87

''کابوس''،شفق کا اہم ناول ہے جس میں انہوں نے ملک میں ہورہے فسادات اور دہشت گرد حملوں کے وقوع پذیر ہونے کے سلسلے میں عام لوگوں کو شک کے دائرے میں لے کر محکمۂ پولس کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔اس ناول کے اہم کردار نعیم ، خالد اور سلمٰی ہیں، ان کے والدین کا ثانوی رول ہے نعیم خالد اور سلمٰی ایک ہی دفتر میں کمپیوٹر آپریٹر کی ملازمت پر معمور ہیں کہانی میں نعیم اور خالد کو پولس پکڑ کر حوالات میں بند کرتی ہے ،دہشت گرد ہونے کے الزام میں سزا بھی دیتی ہے لیکن ثبوت نہ ملنے کی صورت میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔شفق نے ناول میں اصل موضوع کے علاوہ نعیم اس ناول میں سلمی اور خالد کا ایک دوسرے سے محبت کرنے اور شادی کرنے اور والدین سے رشتے کے لیے راضی کرنے کے مسئلہ کو بھی پیش کیا ہے کیوں کہ سلمٰی ایک ملازمت پیشہ لڑکی ہے۔ملازمت کرنا وہ چاہتی ہے لیکن خالد کے والدین تعلیم یافتہ اور کھلے ذہن کے ہونے کے باوجود سلمٰی کی شادی کے بعد ملازمت کرنے کی بات کے لیے پریشان رہتے ہیں اور وہ اس سلسلے میں خالد سے سوالات کرتے ہیں۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''سلمٰی دفتر میں کیا کام کرتی ہے، پاپا نے پوچھا۔
کمپیوٹر آپریٹر سمجھئے۔
تنخواہ تم سے زیادہ ہے یا کم؟
میں نہیں جانتا، ویسے وہ پہلے سے کام کررہی ہے۔
شادی کے بعد بھی نوکری کرے گی۔
کہہ نہیں سکتا اس موضوع پر بات نہیں ہوئی۔ ویسے وہ

ضرورت کے لئے ملازمت نہیں کرتی گھر کے سناٹے سے

اکتا کر ملازمت میں آئی ہے۔

تم شادی کے بعد نوکری کرانا پسند کرو گے۔

خالد الجھن میں پڑ گیا اس نے اتنی دور تک نہیں سوچا تھا جیسا

آپ حکم دیں سلمٰی مان جائے گی، ضد نہیں کرے گی"۔ 88

اس ناول میں شفق نے دراصل اس مسئلہ کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عورتیں تعلیم، ہنر اور اعلیٰ صلاحیت رکھنے کے باوجود بھی ملازمت کرنے کے لئے سسرالی رشتہ داروں اور شوہر کی اجازت کی محتاج ہوتی ہیں۔ کیوں کہ وہ اس معاملے میں آزاد نہیں ہوتیں۔ ان کے ساتھ نوکری کرنے کو لے کر دوسری کی اجازت ضروری تسلیم کی جاتی۔ اس طرح خواتین اعلی صلاحتیوں کے باوجود اپنی خواہشات کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے ذہنی الجھن کا شکار ہو جاتی ہیں۔ خواہ وہ نوکری کرے یا نہ کرے انھیں اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی قربانی دینی ضرور پڑتی ہے۔

دراصل عورتوں کا ملازمت کرنا ہمارے سماج میں آج بھی ناپسند کیا جاتا ہے حالانکہ ان کی آمدنی سے اکثر خاندانوں کے معیار زندگی میں سدھار آتا ہے لیکن عورتوں کی ملازمت میں جو مشکلات ہیں اس سے قطع نظر عام طور پر عورت کا ملازمت کرنے سے انھیں الجھن کا شکار ہی ہونا ہی پڑتا ہے۔ صغرا مہدی نے اپنی کتاب "ہندوستان میں عورت کی حیثیت" میں بھی ایک نیشنل رپورٹ کے ذریعے اسی مسئلہ کو پیش کیا ہے وہ لکھتی ہیں:

"۔۔۔معاشرے میں عورتوں کا اپنے پیروں پر کھڑا ہونا

سماج کی نظروں میں پسندیدہ بھی ہے اور ناپسندیدہ بھی۔

ایک وقت میں ان کی آمدنی کی قدر جاتی ہے کہ اس سے

مالی بوجھ کم ہوتا ہے اور معیار زندگی بلند ہو جاتا ہے، لیکن باہر
کام کرنے کے سلسلہ میں جس آزادی اور دوڑ دھوپ کی
ضرورت ہوتی ہے، بہت سے لوگ اسے نہ پسند کرتے اور اب
تک باہر کام کرنے والی عورتوں کو بدنام کیا جاتا ہے۔'' 89

عورتیں اگر ملازمت کرتی ہیں تو گھر کی ذمہ داریوں میں مرد کا ہاتھ بٹاتی ہی ہیں لیکن اس پر بے جا الزامات اور عدم مساوات کا سلوک اسے جذباتی اور ذہنی اعتبار سے کمزور کر دیتا ہے۔ ہمارے ناول نگاروں نے اس مسئلہ پر نہ صرف غور کیا بلکہ اپنے ناولوں میں اسے پیش کر کے اس کے حل کی کوششیں بھی کیں ہیں۔ غرض اردو کے تمام ناول نگاروں نے عورتوں کے مسائل پر بہت کچھ لکھا ہے۔ خصوصاً ملازمت پیشہ خواتین پر اردو کے تقریباً تمام بڑے ادیبوں نے لکھ کر ان کے بے بسی، مجبوری، لاچاری اور پریشانیوں کی عکاسی کے ذریعے ان مسائلکے حل کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے یہی نہیں بلکہ اپنے نسوانی کرداروں کے ذریعے ملازمت پیشہ عورتوں کے دلی جذبات واحساسات اور ذہنی الجھنوں اور نفسیاتی کیفیات کی بھی بھرپور عکاسی کی ہے آج کے عہد کی عورت بھی ان مسائل سے دوچار ہے اردو ناول نگاروں نے ان مسائل کو اپنے ناولوں میں جگہ دے کر ہمارے سماج و معاشرے کی خامیوں اور کمیوں کی حقیقی و سچی تصویریں پیش کی ہے۔ جس سے نہ صرف اردو ادب میں ان کی خدمات کا علم ہوتا ہے بلکہ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے ناولوں کے ذیعے سماج کی خامیوں اور ان غلط روایات و رسومات جو برسوں سے چلی آرہی ہیں ان کی اصلاح کی سعی کی ہیں۔ بلاشبہ اردو ناول نگاروں نے ملازمت پیشہ خواتین کے حقوق اور تشخص کے لیے جس طرح سے لکھا اور ان کے مسائل کی پیش کشی کے ذریعے ہمارے معاشرے اور حامیوں کی اصلاح کی کوششیں کیں۔ انھیں نہ صرف ملازمت پیشہ خواتین بلکہ اردو ادب کا حساس قاری کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

# حوالے


1۔ وارث سرہندی علمی اردو لغت (جامع) محمود ریاض پریس علمی کتاب خانہ لاہور 1983ء، ص:1419

2۔ Essential English Dictionary"collins publishers the universityof Birmingham Landon page No. 928

3۔ محمد ہاشم قدوائی، جدید ہندوستان کے سیاسی اور سماجی افکار، ۔ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1906ء، ص:30

4۔ محمد ہاشم قدوائی، جدید ہندوستان کے سیاسی اور سماجی افکار، نئی دہلی، 1906ء، ص 17

5۔ ڈاکٹر شمیم نکہت ، پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار، نصرت پبلشرز، لکھنو، 1975ء، ص 66

6۔ صغرا مہدی، ہندوستان میں عورت کی حیثیت، ترقی اردو بیورو، دہلی، 1901ء، ص 3

7۔ آمنہ تحسین ڈاکٹر، مطالعات نسواں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2008ء، ص:106

8۔ بحوالہ: غلام محی الدین انصاری سالک ڈاکٹر، ''ہندو پاک کی خواتین ناول نگار'' شاہد پبلیکیشنز، نئی دہلی، 2008ء، ص 41-42

9۔ ثریا حسین خط بنام مولوی ممتاز علی مشمولہ، سرسید اور ان کا عہد، ص:357-356 بحوالہ، مطالعات نسواں، 2008ء ص 192

10۔ بحوالہ، مطالعات نسواں، ص 140

11۔ وقار عظیم، داستان سے ناول تک، ص:76

12۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ، چمن بکڈ پو، دہلی، 1960ء، ص 276

13۔ ڈپٹی نذیر احمد، مرأۃ العروس، کتابی دنیا دہلی، 2003ء، ص 10

14۔ ڈپٹی نذیر احمد، مرأۃ العروس، کتابی دنیا دہلی، 2003ء ص 5

15۔ ڈپٹی نذیر احمد مراۃ العروس، کلیات ڈپٹی نذیر احمد، کتابی دنیا، دہلی 2003ء، ص 8

16۔ ڈپٹی نذیر احمد، مرأۃ العروس، کتابی دنیا، دہلی، 2003ء ص 8

17۔ رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد، جلد اول ۔ص 297

18۔ رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد جلد اول، ص 366

19۔ نذر سجاد حیدر، ثریا، ہوائے چمن میں خیمۂ گل ۔مرتبہ قرأۃ العین حیدر، دہلی 2004ء، ص 107

20۔ نذر سجاد حیدر، ثریا، 2004ء، ص 228


☆☆☆

21۔ قرۃالعین حیدر، آگ کا دریا، اردو کتاب گھر، نئی دہلی، 1984ء، ص99

22۔ خدیجہ مستور، آنگن، علی گڑھ۔ 1983ء، ص320

23۔ کلیات پریم چند مرتبہ، مدن گوپال (بیوہ) قومی کونسل برائے فروغ، اردو زبان دہلی، ص465۔

24۔ صغرا مہدی، ہندوستان میں عورت کی حیثیت، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ص93

25۔ پریم چند، گودان، مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی، 1983ء، ص295

26۔ پریم چند، گودان، مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی 1983ء ص300-299

27۔ صغرا مہدی، ھندوستان میں عورت کی حیثیت، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، 1901، ص53

28۔ مرزا رسوا، امراؤ جان ادا، مرتبہ رام نرائن لال بینی مادھو، الہ آباد ۱۹۷۸ء

29۔ مرزا رسوا، امراؤ جان ادا، رام نرائن لال بینی مادھو الہ آباد، ۱۹۷۸ء ص ۱۰۴

30۔ مرزا رسوا، امراؤ جان ادا، رام نرائن لال بینی مادھو الہ آباد، ۱۹۷۸ء، ص۱۳۴

31۔ مرزا رسوا، امراؤ جان ادا، رام نرائن لال بینی مادھو الہ آباد، ۱۹۷۸ء ص ۹۸

32۔ پریم چند، بازارحسن، ص90۔

33۔ پریم چند، بازارحسن، (مرتبہ مدن گوپال) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ص90

34۔ پریم چند، بازارحسن، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۲۰۰۰ء ص ۷۹ـ۷۸

35۔ پریم چند، بازارحسن، (مرتبہ مدن گوپال)، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2000ء

36۔ بحوالہ شمیم نکہت ڈاکٹر، پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار، 1975ء، ص195

37۔ عصمت چغتائی، معصومہ، کتابی دنیا، دہلی، 2002ء، ص8

38۔ عصمت چغتاء، معصومہ، دہلی، 2002ء، ص27

39۔ عصمت چغتائی، معصومہ، دہلی، 2002ء، ص128

40۔ جیلانی بانو، بارش سنگ، اردو مرکز حیدر آباد، 1985ء، ص138

41۔ صغرا مہدی (مترجم)، ہندوستان میں عورت کی حیثیت، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1901ء، ص45

42۔ اقبال متین، چراغ تہہ داماں، ریاض پرنٹرس، حیدر آباد، 2005ء ص164

43۔ اقبال متین، چراغ تہہ داماں، حیدر آباد، 2005ء، ص:

44۔ صغرا مہد، ہندوستان میں عورت کی حیثیت، 1901ء، ص:54-55۔

45 قرأۃالعین حیدر، چاندنی بیگم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1999ء، ص 17

46 رفیعہ منظورالامین، یہ راستے، انجمن ترقی اردو آندھراپردیش، 1995ء، ص202

47 رفیعہ منظورالامین، یہ راستے، 1995ء، ص 12

48 رفیعہ منظورالامین، یہ راستے، انجمن ترقی اردو آندھراپردیش، 1995ء، ص12-13

49 قرأۃالعین حیدر، چاندنی بیگم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1999ء، ص108

50 رفیعہ منظورالامین، یہ راستے، 1995ء، ص80

51 قرۃالعین حیدر، چاندنی بیگم، 199ء، ص18

52 قرۃالعین حیدر، چاندی بیگم، 1999ء ص18

53 صغرامہدی، ہندوستان میں عورت کی حیثیت 1901ء، ص114-115

54 قرۃالعین حیدر، چاندی بیگم، 1999ء ص179

55 قرأۃالعین حیدر چاندنی بیگم، ص33

56 قرأۃالعین حیدر ''چاندنی بیگم''۔ص33

57 جیلانی بانو ''ایوان غزل''ایم۔آر پبلیکیشنز، نئی دہلی، 1976ء، ص97

58 جیلانی بانو، ایوان غزل، ص103

59 رفیعہ منظورالامین، عالم پناہ، حسامی بکڈ پو، حیدرآباد، 1987ء، ص82

60 رفیعہ منظورالامین، عالم پناہ، 1987ء، ص13

61 رفیعہ منظورالاحسن، یہ راستے، انجمن ترقی اردو آندھراپردیش، 1995ء، ص86

62 رفیعہ منظورالامین، عالم پناہ، 1987ء، ص5

63 رفیعہ منظورالامین، عالم پناہ، 1987ء ص13

64 رفیعہ منظورالامین، عالم پناہ، 1987ء ص:10

65 رفیعہ منظورالامین، عالم پناہ، 1987ء ص:10

66 رفیعہ منظورالامین، یہ راستے، 1995ء، ص6

67 صغرامہدی، ہندوستان میں عورت کی حیثیت، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔1901ء، ص50-51

68 صالحہ عابد حسین، الجھی ڈور، ناولستان جامعہ نگر، نئی دہلی۔1975ء، ص116

69۔ صالحہ عابد حسین، قطرے سے گہر ہونے تک، نسیم بک ڈپو لکھنو۔1985ء ص158

70۔ صالحہ عابد حسین، الجھی ڈور، ناولستان جامعہ نگر دہلی۔1975ء، ص26

71۔ صالحہ عابد حسین، الجھی ڈور، 1975ء، ص7

72۔ صالحہ عابد حسین، الجھی ڈور، 1972ء، ص8

73۔ صالحہ عابد حسین، الجھی ڈور، ص28

74۔ صالحہ عابد حسین، الجھی ڈور، 1972ء، ص8-9

75۔ صالحہ عابد حسین، الجھی ڈور، 1975ء، ص 43

76۔ صالحہ عابد حسین، الجھی ڈور، 1975ء، ص82

77۔ صغرا مہدی، راگ بھوپالی، ناولستان، نئی دہلی، 1983ء، ص62

78۔ صغرا مہدی، راگ بھوپالی، 1983ء، ص63

79۔ صغرا مہدی، راگ بھوپالی، 1983ء، ص43

80۔ صغرا مہدی، راگ بھوپالی، 1983ء، ص:117

81۔ غضنفر علی، کینچلی، چودھری پرنٹرس، لال کنواں، دہلی، 1993ء ص:34

82۔ غضنفر علی، کینچلی، 1993ء ص:35

83۔ صادقہ نواب سحر ڈاکٹر، کہانی سناؤ متاشا، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص 56-57

84۔ صادقہ نواب سحر، کہانی کوئی سناؤ متاشا، ص 76

85۔ صادقہ نواب سحر، کہانی سناؤ متاشا، ص77

86۔ صادقہ نواب سحر، کہانی کوئی سناؤ متاشا، ص78

87۔ غضنفر علی، کینچلی، 1993ء ص99

88۔ شفق، کابوس، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2003ء، ص110

89۔ صغرا مہدی، ہندوستان میں عورت کی حیثیت، ص51۔


☆☆☆

# مجموعی جائزہ

# مجموعی جائزہ

عورت کے لیے تعلیم اور ملازمت کا حصول وقت کی ہم ضرورت ہے ۔اسی لیے اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس مقالے کے پچھلے ابواب میں دنیا میں عورت کی ابتدا ہی سے سماجی و معاشرتی حیثیت کیا رہی ہے یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور مختلف دانشوروں نے عورت اور مرد کے حقوق اور ان کی اہمیت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس بارے میں تفصیلی بحث کی گئی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مختلف مذاہب میں عورت کے حقوق کیا رہے ہیں۔اس کے بارے میں تفصیلی معلومات بہم پہنچائی گئی ہے دراصل عورتوں کی حیثیت اور حقوق تقریباً تمام مذاہب میں مردوں کے مساویانہ رہی ہے ۔ باوجود اس کے عورتوں کے ساتھ ہمیشہ ہیسے نابرابری کا سلوک روا رکھا گیا ہے اور اس پر مظالم ڈھائے گئے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ پہلے باب میں ''عالمی تناظر میں عورت کا مرتبہ'' کے عنوان سے بحث کی گئی ہے عالمی طور پر عورت کا کیا مقام و مرتبہ رہا ہے اس پر مغربی مفکرین اور دانشوریوں کے خیالات کی روشنی میں نتیجہ اخذ کیا گیا ہے ۔دوسرے باب میں ''ہندوستانی مذاہب میں عورت کا مقام'' کے عنوان سے بحث کی گئی ہے۔اس باب میں مختلف مذاہب کی مقدس کتابوں کے حوالے سے عورت کی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے چوں کہ ہندوستان مختلف مذاہب اور قوم کے لوگ رہتے بستے ہیں ۔اس لئے مختلف مذاہب کے مذہبی عقائد و رسوم اور مقدس کتابوں کے حوالے

سے عورت کے مقام و مرتبہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس مقالے کا اہم باب ملازمت پیشہ خواتین کے مسائل ہے عورت سماجی و معاشی مسائل اور اس کے استحصال اور جبر و ستم کے نئے طریقے اس کے سامنے ہیں سر سید کے زمانے میں عورتوں کو تعلیم و ملازمت حاصل کرنے کے لیے سماجی و مذہبی بیڑیوں کے علاوہ دوران ملازمت کن مسائل سے دوچار ہونا پڑتا رہا ہے ان وجو ہات کا بخوبی ادراک تھا یہی وجہ تھی کہ سر سید احمد خان نے عورتوں کو معیاری اور انگریزی تعلیم سے دور رکھنے کی بات کی تھی۔مثلاً وہ عورتوں کو دوہری زمہ داریوں کی وجہ سے مستقبل میں کن مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا انہی مسائل کے پیش نظر کہتے ہیں:

> ''میری دلی آرزو ہے کہ عورت کو بھی عمدہ اور اعلیٰ درجے کی تعلیم دی
> جائے۔مگر موجودہ حالت میں کنواری عورت کو تعلیم دینا اان پر سخت ظلم
> کرنا ہے اور ان کی تمام زندگی رنج و مصیبت میں مبتلا کر دینا ہے'' 1۔

سر سید کی پیشن گوئی ایک حد تک صحیح رہی کہ عصر حاضر میں اعلیٰ تعلیم کے حصول لئے لڑکیوں کا گھر سے دور رہنا، ہاسٹلوں میں قیام اور ملازمت کے دوران ان پر پیش آنے والے حادثات میں اضافہ دن بہ دن ہوتا جارہا ہے ۔ باوجود اس کہ عورتوں کی تعلیم کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔جواہر لال نہرو نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ایک مرد کو تعلیم دینا آدھی دنیا کو تعلیم دینے کے مترادف ہے جبکہ ایک عورت کو تعلیم دینا ساری دنیا کو تعلیم دینے کے مترادف ہے۔عورت کی تعلیم اور ملازمت کی اہمیت ، ہمیشہ ہی سے رہی ہے ۔عورتوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کی مختلف زبانوں کے ادیبوں، دانشوروں و مفکروں نے پرزور حمایت کی تھی لیکن یہ تعلیم ذریعہ معاش کے لئے ہو اس پر مفکرین کی رائے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔عورتوں کے حقوق کے لئے آواز اُٹھانی والی خاتون میری وولسٹن کرافٹ نے عورت کو پنجرے کی قید سے نکل کر ذمہ دار کا کردار ادا کرنے کی وکالت کر

تی ہے لیکن اس کی مخالفت میں سارہ ایلس عورتوں کو ہدایت دیتیں ہیں کہ وہ اپنے گھر کو خوشحال امن و پاکیزہ بنانے کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دے۔

لبرلزم کے مفکر ہٹلر نے عورت کو گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر ملازمت کرنے پر زور دیا لیکن اس کے برخلاف جے۔ ایس مل عورتوں کی تعلیم حاصل کرنے پر زور ضرور دیا لیکن وہ ان کے ملازمت حاصل کرنے اور معاشی حصہ داری میں برابری کے خلاف رہا۔

اسطرح عورت کے روزگار سے جڑنے سے پہلے ہی کئی اندیشے سامنے آئے جن کا مکمل حل کسی بھی دانشور اور مفکر نے نہیں دیا۔ حالاں کہ تعلیم حاصل کرنا ہر عورت کے لئے ضروری ہے۔ لیکن تعلیم یافتہ اور ملازمت پیشہ ہونے کے باوجود اس کی مشکلات میں مزید اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس کے مصائب اور استحصال میں کبھی کمی نہیں آئی بلکہ اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے یہاں جو ناول لکھے گئے ہیں ان ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں ملازمت پیشہ خواتین کے مسائل کی طرف پوری ایمانداری سے لکھا ہے۔ مثلاً ملازمت پیشہ خواتین جن مسائل سے دوچار ہوتی ہیں ان میں خصوصاً جنسی استحصال کا مسئلہ، سفر کی صعبتوں کا مسئلہ، بچوں کی پرورش کا مسئلہ، گھریلو ذمہ داریوں کا مسئلہ، رشتوں کو نبھانے کا مسئلہ، صنفی امتیاز و نابراری کا مسئلہ، روپئے کے خرچ کا مسئلہ، سسرالی رشتہ داروں کے استحصال کا مسئلہ، شوہر کی بالا دستی اور اعلیٰ افسروں کی ناشائستہ حرکتوں کا مسئلہ وغیرہ کی طرف ہمارے ناول نگاروں نے خصوصی توجہ دلائی ہے۔

اردو ادب میں ابتداء ہی سے خواتین کے مسائل پر بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے خواتین کو ملازمت کے سلسلے میں جن مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے ان مسائل کے بارے میں اردو ادب کے ادیبوں اور شعرا نے بھی لکھا ہے مثلاً ابتداء ہی سے جبکہ ابھی لڑکیوں کی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا نذیر احمد نے لڑکیوں کی تعلیم و تربیت اور اس کی اخلاقی تربیت کی طرف توجہ دے کر اس سلسلے میں پہل کی۔ ساتھ ہی حالی نے نظم ''چپ کی داد'' اور''

مناجات بیوہ‘‘ میں عورت کی مظلومی اور پریشانیوں کے حل کی طرف ہمیں توجہ دلائی۔ اسکے بعد کئی ناول نگاروں نے عورتوں کے مسائل کو پیش کر کے اس کی یکسوئی کی کوشش بھی کی ہے۔ مثلاً نذیر احمد عورتوں کی تعلیم ان کی اخلاقی تربیت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اور اس زمانے میں جبکہ عورت کا تعلیم حاصل کرنا اور گھر سے باہر جا کر نوکری کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا وہاں نذیر احمد نے روشن خیالی کا مظاہرہ کیا اور عورتوں کو اس سلسلے میں تربیت کی اور جو عورتیں اس کی اہمیت سے واقف نہیں تھیں ان کو سمجھاتے ہوئے بتایا کہ تعلیم کی اہمیت اور ملازمت کی کیا قدر و قیمت ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ’’بعض نادان عورتیں خیال کرتی ہیں کہ کیا لکھ پڑھ کر ہم مردوں کی طرح نوکری کرنی ہے۔ لیکن اگر کسی عورت نے لکھ پڑھ لیا ہے اور اس نے نوکری نہیں کی تو اس کا لکھنا پڑھنا اکارت بھی نہیں گیا اس کو اور بہتر فائدے پہنچے جن کے مقابل میں نوکری کی کچھ بھی حقیقت نہیں‘‘ 2

اردو میں لکھنے والوں میں تقریباً سب ہی نے خواتین کے مسائل کی طرف توجہ کی ہے اور ان کے تمام مسائل کو پیش کرنے کی سعی کی ہے لیکن ملازمت پیشہ خواتین کے مسائل پر زیادہ نہیں لکھا گیا جن لوگوں نے ملازمت پیشہ خواتین کے مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ان میں خصوصاً قرۃ العین حیدر عصمت چغتائی رفعیہ منظور الامین، صالحہ عابد حسین، صغرا مہدی، غضنفر علی، شفیق، جیلانی بانو اور صادقہ نواب وغیرہ کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔

ان ناول نگاروں نے ملازمت پیشہ خواتین کے جن مسائل کی طرف توجہ دلائیہے۔ ان میں سب اہم مسئلہ جنسی استحصال کا مسئلہ ہے۔ ملازمت پیشہ خواتین چوں کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب گھر سے باہر ملازمت کے لئے نکلتی ہے تو اسے سب سے پہلے اپنی عزت و آبرو کی حفاظت اہم مسئلہ بن جاتا ہے نوکری

حاصل کرنے سے لے کر ترقی کے کئی مراحل طئے کرنے کے لئے اسے ایسے مردوں کو سامنا کرنا پڑتا ہے جو اسکی قابلیت کی بجائے اس کی جسمانی خدوخال اور ظاہری حسن پر نگاہ رکھتے ہیں اور کسی نہ کسی صورت میں اس کا استحصال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔مثلاً قرۃ العین حیدر کے ناول ''چاندنی بیگم'' میں چاندنی بیگم کے کردار اور رفعیہ منظور الامین کے ناول ''عالم پناہ'' میں ایمن کا اور ناول ''یہ راستے'' میں کاکل جیلانی بانو کے ناول ''ایوانِ غزل'' میں چانداور غزل اور صادقہ نواب کے ناول ''کہانی سناؤ متاشا'' میں مرکزی کردار متاشا کو بھی ملازمت حاصل کرنے کے سلسلے میں اس مسئلے سے دوچار ہونا پڑتا ہے کیوں کہ اچھی شکل وصورت اور جسمانی قد وخال کے باوجو بھی انھیں کئی جگہوں پر نوکری نہ مل سکی۔

ناول ''کینچلی'' میں غضنفر علی کے نسوانی کردار ''مینا'' کے ساتھ جنسی استحصال کا مسئلہ پیش آیا۔کیوں کہ آفیس کے اعلیٰ افسر کی مانگ یہی ہوتی ہے کہ نوکری حاصل کرنا ہے تو اس کے ساتھ ایک رات گزارنی ہوگی۔ صغرامہدی کے ناول راگ بھوپالی میں بھی جنسی استحصال کے مسئلہ کو نسوانی کردار رابعہ کے ذریعہ بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا گیا کہ کس طرح مردانہ سماج،عورت کو ایک باعزت فرد کی بجائے ایک حقیر چیز سمجھتا ہے اور اسے جب چاہے جیسے چاہے اپنے مطلب کے لئے استعمال کرسکتا ہے یہی وہ صورتحال ہوتی ہے جس سے یہ نسوانی کردار دوچار ہوتی ہیں۔

جنسی استحصال کے علاوہ اردو ناول نگاروں نے صنفی نابراری کے مسائل کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔خصوصاً ناول ''چاندنی بیگم'' میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مرد حضرات عورت کو ناقص العقل سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے اس کی قابلیت اور لیاقت کی بجائے اس کی صنفی حیثیت کو دیکھ کر ہی اس کی قابیلیت پر شک کیا جاتا ہے۔یہی وجہہ ہے کہ ریڈ روز کوٹھی کے مقدمہ میں ایک عورت وکیل کے انتخاب سے انکار کردیا جاتا ہے۔ناول ''چاند بیگم'' کے علاوہ ناول ''عالم پناہ'' میں بھی ایمن کو صنفی امتیاز کا شکار ہونا پڑا۔اسے صرف

عورت ہونے کی وجہ سے دوسری جگہ جا کر نوکری کرنے کے لئے بھیجنے پر اس کے ماں باپ کو موردالزام ٹھہرایا جاتا ہے جس سے اسے شدید تکلیف ہوتی ہے ''عالم پناہ'' کے علاوہ صالحہ عابد حسین کے ناول الجھی ڈور میں بھی مرکزی کردار آسیہ کو مردوں کے درمیان کام کرنے کی وجہ سے آزاد خیال اور بدچلنی کے الزامات کا سامنا کرنا پڑا۔

گھریلو ذمہ داریوں کو پورے خلوص سے نبھانا بھی ملازمت پیشہ خواتین کا اہم مسئلہ رہا ہے۔نوکری کے ساتھ گھر کے تمام امور کی انجام دہی میں اگر عورت ناکام ہوتی تو پھر اس کے سامنے کئی مسائل آجاتے ہیں شوہر اور سسرالی رشتہ داروں کے مظالم اور ان کے نازیبا سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ایسے ہی مسائل سے ناول ''الجھی ڈور'' کی آسیہ اور ''یہ راستے'' کی ڈورا کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔

ملازمت پیشہ خواتین کے لئے شوہر سے دوری بھی اہم مسئلہ بن جاتی ہے جن خواتین کو ملازمت کے سلسلے میں اپنے شوہروں سے دور رہنا پڑتا ہے ایسی خواتین کے شوہر دوسری عورتوں کے ساتھ محبت کرنے لگتے میں اور بیوی کو نظرانداز کر دیتے ہیں جس سے ان کی ازدواجی زندگی متاثر ہوتی ہے۔مردوں کی ناانصافی اور بیوی کے ساتھ بے وفائی کا مسئلہ بھی ملازمت پیشہ عورت کے لیے بڑا مسئلہ بن جاتا ہے۔اسی مسئلہ کو صغرا مہدی نے اپنے ناول ''راگ بھوپالی'' میں عادل اور رابعہ کے کرداروں کے ذریعہ بڑی عمدگی سے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

عورت ملازمت کے ذریعہ جو تنخواہ پاتی ہے اس کے خرچ کا بھی اسے مکمل حق نہیں دیا جاتا۔ناول ''الجھی ڈور'' کی آسیہ کے ذریعہ اس مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔آسیہ اپنی کمائی سے اپنی معصوم مریض بیٹی کے لئے دوائی اور مقوی غذا خریدنے کا حق نہیں رکھتی۔اسی طرح ناول ''یہ راستے'' کی نسوانی کردار شاہدہ کینسر کے مرض کیعلاج کے لئے اپنی تنخواہ خرچ نہیں کرسکتی اور ناول ''راگ بھوپالی'' کی کردار رابعہ اپنے شوہر کی خدمت اور کے ساتھ ساتھ ماں باپ کی بھی خدمت کرنا چاہتی ہے لیکن وہ ایسا نہیں کرسکتی صرف اس لیے کہ وہ عورت

ہے جسے اپنے ماں باپ پر خرچ کرنے کا کوئی حق نہیں۔

ملازمت پیشہ خواتین کے لئے مائیکہ اور سسرال میں توازن قائم رکھنا کافی مشکل مرحلہ ہوتا ہے ملازمت کی بھاگ دوڑ کے علاوہ گھر کی ذمہ داریاں، میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات اور جسمانی صحت پر مضر اثرات مرتب کرتے ہیں انہیں مسائل سے دوچار ناول ''یہ راستے'' کی شاہدہ ہے جو موت کے منھ میں چلی جاتی ہے اور ناول ''الجھی ڈور'' کردار ٹی۔ بی جیسے مہلک مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے اور ناول ''راگ بھوپالی کی رابعہ کا اپنے شوہر عادلسے علحدگی کا سبب بنتی ہے۔

ملازمت پیشہ خواتین کے لیے مردوں خصوصاً شوہر کی بالا دستی کا مسئلہ اہم ہوتا ہے وہ نوکری تو کر سکتی ہیں مگر مرد کے مساوری حقوق اسے حاصل نہیں ہوتے۔ مرد خصوصاً شوہر کے سامنے اس کی حیثیت محض نوکرانی کی ہوتی ہے اس کے آنے جانے اور گھریلو ذمہ داریوں کے نبھانے کے سلسلے میں شوہر کی جازت لینی پڑتی ہے اور جو عورتیں اپنے طور پر کوکچھ کام کرتی ہیں تو ان کے شوہر احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں جس سے ان کی ازدواجی زندگی متاثر ہوتی ہے اور بچوں کی تربیت اور پرورش کے سلسلے میں ان پر بے جاالزامات لگائے جات ہیں۔ ناول ''الجھی ڈور'' کی آسیہ راگ بھوپالی کی رابعہ اور ''کہانی سناؤ متاشا'' میں متاشا اور غضنفر کی ناول ''کینچلی'' کی دیپا بھی انھیں مسائل سے دوچار ہوتی ہیں جہاں شوہر ان کے جذبات اور احساسات کی قدر نہیں کرتے اور صرف نوکری کرنے کی سزا کے طور پر ان کے ساتھ نابرابری کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور ان کی دلجوئی اور ہم خیالی کی بجائے احساس کمتری کا شکار ہو کر ان پر طرح طرح کے الزامات لگاتے ہیں۔

ملازمت پیشہ خواتین کے مسائل عصر حاضر کا ایک اہم مسئلہ رہا ہے لہذا اردو کے تقریباً تمام بڑے ناول نگاروں نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ عورت محض چیز نہیں ہے اس کی اپنی حیثیت ہے اس کے اپنے جذبات واحساسات ہے اس کی اپنی خواہاشات اور آرزئیں ہیں اس کی اپنے خیالات ہے اس کی اپنی زندگی

ہے جسے وہ اپنے طور پر جینا چاہتی ہے سماج میں سانس لینا چاہتی ہے وہ اپنے حدود جانتی ہے لیکن باوجود اس کے اس کے ساتھ جس طرح کا سماج کا رویہ رہا ہے جس طرح کا استحصال ہوتا رہا ہے اور جس طرح کے مسائل سے وہ دوچار ہوتی رہی ہے اس پر اردو ناول نگاروں نے لکھ کر غور وفکر کی دعوت دی ہے کہ تعلیم یافتہ اور ذہین اشخاص بھی آج جبکہ ہمارا معاشرہ دنیا کی دیگر ممالک کے مقابلہ میں ترقی یافتہ ہو چکا ہے لیکن عورت کی حیثیت میں خاطر خواہ تبدیلی آج بھی نہیں آئی۔ سماج کی سوچ آج بھی کمی رہی ہے کہ عورت چاہے جتنا چاہے علم حاصل کرے لیکن اگر وہ ملازمت کرے گی تو ہمارا معاشرہ اسے آج بھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھے گا۔ اس کی عزت نہیں کرا سے وہ مقام نہیں دے گا، جس کی وہ حق دار ہے۔ غرض اردو ناول نگاروں نے عورت کے ساتھ ہو رہی اس ناانصافی کے خلاف احتجاج کیا ہے اور اپنے ناولوں کے مرکزی کرداروں کے روپ میں انھیں پیش کر کے ان مسائل کے حل کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔

غرض اردو ادب میں جو ناول لکھے گئے ہیں۔ اس میں سماجی ومعاشرتی مسائل کے پہلو بہ پہلو خواتین کے مسائل پر خصوصی طور پر لکھا گیا ہے۔ خواتین کے بے شمار مسائل میں عصر حاضر کا سب سے اہم مسئلہ ان کی ملازمت کا رہا ہے۔ جس پر اردو ناولوں بہت کم سہی لیکن جن ناول نگاروں نے جتنا لکھا ہے انھوں نے پوری سچائی اور ایمانداری سے کام لیا ہے۔ ان ناول نگاروں نے اپنے مرکزی کرداروں کے ذریعہ نہ صرف سماج کی حقیقی اور جیتی جاگتی تصویریں بڑے فنکارانہ اور موثر انداز میں پیش کر دی ہیں بلکہ خواتین کے مسائل کی حل کی طرف توجہ دلا کر ان کی یکسوئی کا بھی بھرپور حق ادا کیا ہے۔

☆☆☆

# حوالے


1۔ بحوالہ آمنہ تحسین، مطالعات نسواں، ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس دہلی 2008ء ص 191-192

2۔ ڈپٹی نذیر احمد، مراۃ العروس، کتابی دنیا، دہلی ۲۰۰۳، ص ۸

# کتاب

| سلسلہ نشان | مصنف کا نام | کتاب کا نام | پبلیشر | سنہ اشاعت |
|---|---|---|---|---|
| ۱ | آچاریہ تکیہ (مترجم شان الحق) | ارتھ شاستر | قومی کونسل برائے فیروغ اردو زبان دہلی | ۱۹۹۹ء |
| ۲ | ابوالکلام آزاد | مسلمان عورت | | |
| ۳ | آمنہ تحسین | مطالعات نسواں | ایجوکیشنل پشنگ ہاوس | ۲۰۰۸ء |
| ۴ | آمنہ تحسین | تانیثی فکر کی جہات | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس | ۲۰۱۲ء |
| ۵ | البہی الخولی (مترجم جاید احسن، مجاہد فلاحی) | اسلام میں عورت کے حقوق وفرائض | ینوکریسنٹ پبلشنگ کمپنی، دہلی | ۲۰۰۹ء |
| ۶ | ابوسلیم محمد عبدالحی | حیات طیبہ | مکتبہ الحسنات، دہلی | ۲۰۰۹ء |
| ۷ | بانو قدسیہ | راجہ گدھ | شان ہند پبلی کیشنز، دہلی | ۱۹۸۸ء |
| ۸ | پریم چند | گئودان | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی | ۱۹۸۳ء |
| ۹ | پریم چند | کلیات پریم چند (مرتبہ مدن لال گوپال) | قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان | ۲۰۰۰ء |
| ۱۰ | پیغام آفاقی | مکان | نام فکشن اکیڈمی، دہلی | ۱۹۸۹ء |
| ۱۱ | پنڈت سندر ال | گیتا اور قرآن | خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ | ۱۹۹۹ء |
| ۱۲ | ثریا بتول | اسلام میں عورت کا مقام ومرتبہ | اسلامک بک فاونڈیشن، دہلی | ۲۰۰۰ء |
| ۱۳ | جمیل جالبی | ادب، کلچر اور مسائل پر تنقیدی مضامین (مرتبہ خاور جمیل) | | |
| ۱۴ | جیلانی بانو | ایوان غزل | ایم۔آر پبلی کیشنز ، دہلی | ۲۰۰۳ء |
| ۱۵ | جیلانی بانو | بارش سنگ | اردو مرکز حیدرآباد | ۱۹۷۶ء |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ۱۶ | حکیم محمد طارق محمود چغتائی | عورت اسلام اور جدید سائنس | مکتبہ الحسنات، دہلی | ۲۰۱۰ء |
| ۱۷ | خدیجہ مستور | آنگن | ایجوکیشن بک ہاوس، دہلی | ۱۹۸۳ء |
| ۱۸ | خدیجہ مستور | زمین | ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ | ۱۹۸۳ء |
| ۱۹ | ڈپٹی نذیر احمد | کلیات ڈپٹی نذیر احمد (مرتبہ سلیم اختر) | کتابی دنیا، دہلی | ۲۰۰۳ء |
| ۲۰ | ڈی۔ڈی کوسمبی | قدیم ہندوستان کی ثقافت وتہذیب تاریخی پس منظر میں | مترجم بالمکند رعرش ملسانی | |
| ۲۱ | رتن ناتھ سرشار | فسانہ آزاد (جلد اول) (دوم) | ترقی اردو بورڈ، دہلی | ۱۹۰۱ء |
| ۲۲ | رماشنکر ترپاٹھی (مترجم سید سخی حسن نقوی) | قدیم ہندوستان کی تاریخ | ترقی اردو بیورو حکومت ہند | ۱۹۷۱ء |
| ۲۳ | راجندر سنگھ بیدی | ایک چادر میلی سی | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی | ۱۹۷۱ء |
| ۲۴ | رائے بہادر۔جے سی گھوش | اصول دھرم شاستر | دار الطبع جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن | ۱۹۲۳ء |
| ۲۵ | رفیعہ منظور الامین | عالم پناہ | حسامی بک ڈپو، حیدر آباد | ۱۹۸۷ء |
| ۲۵ | رفیعہ منظور الامین | یہ راستے | انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش | ۱۹۹۵ء |
| ۲۷ | رفیق ذکریا | ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج | ترقی اردو بیورو، دہلی | ۱۹۸۵ء |
| ۲۸ | زاہد حنا | عورت زندگی کا زنداں | تخلیق کار پبلیشرز، دہلی | ۲۰۰۶ء |
| ۲۹ | سید ابوالا علی مودودی | پردہ | مرکز مکتبہ اسلامی دہلی | ۱۹۸۶ء |
| ۳۰ | سید جاوید اختر | اردو کی ناول نگار خواتین ترقی پسند تحریک سے دور حاضر تک | نسیم کتاب گھر، دہلی | ۲۰۰۲ء |
| ۳۱ | سید جلا الدین عمری | عورت اور اسلام | مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی | ۱۹۷۹ء |
| ۳۲ | سید قطب | سلام میں عدل اجتماعی | مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی | ۱۹۸۱ء |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ۳۳ | سید عبداللہ | سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ | چمن بک ڈپو، دہلی | ۱۹۶۰ء |
| ۳۴ | سید عابد حسین | قومی تہذیب کا مسئلہ | انجمن ترقی اردو، علی گڑھ | ۱۹۵۵ء |
| ۳۵ | سید محمد عقیل | جدید ناول کا فن | نیا سفر پبلیکیشنز، الہ آباد | ۱۹۹۷ء |
| ۳۶ | شبنم آرا | تانیثیت کے مباحث اور اردو ناول | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی | ۲۰۰۸ء |
| ۳۷ | شبنم کوثر قریشی | عورت کا وران دعوت | بلال پبلی کیشنز، دہلی | ۱۹۹۹ء |
| ۳۸ | شمیم نکہت | پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار | نصرت پبلشرز، لکھنو | ۱۹۷۵ء |
| ۳۹ | شفق | کابوس | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی | ۲۰۰۳ء |
| ۴۰ | شمیم محسن | عورت قرآن کی نظر میں | مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی | ۱۹۹۶ء |
| ۴۱ | صالحہ عابد حسین | عذرا | موڈرن پبلشنگ ہاوس، دہلی | ۱۹۸۷ء |
| ۴۲ | صالحہ عابد حسین | آتش خاموش | سنگم کتاب گھر، دہلی | ۱۹۸۵ء |
| ۴۳ | صالحہ عابد حسین | قطرے سے گہر ہونے تک | نسیم بک ڈپو، لکھنو | ۱۹۵۸ء |
| ۴۴ | صالحہ عابد حسین | الجھی ڈور | ناولستان، دہلی | ۱۹۷۵ء |
| ۴۵ | صغرا مہدی | ہندوستان میں عورت کی حیثیت | ترقی اردو بیورو، دہلی | ۱۹۰۱ء |
| ۴۶ | صغرا مہدی | راگ بھوپالی | ناولستان، دہلی | ۱۹۸۳ |
| ۴۷ | صغرا مہدی | دھند | ناولستان، دہلی | ۱۹۷۸ء |
| ۴۸ | صغرا مہدی | پروائی | ناولستان، دہلی | ۱۹۷۸ء |
| ۴۹ | صغرا مہدی | جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو | ناولستان، دہلی | |
| ۵۰ | عبدالحلیم ابوشقہ | عورت عہد رسالت میں | قاضی بلشرز، دہلی | ۱۹۹۹ء |
| ۵۱ | عصمت چغتائی | کلیات عصمت چغتائی (ناول) | کتابی دنیا، دہلی | ۲۰۰۲ء |
| ۵۲ | غضنفر علی | کینچلی | چودھری پرنٹرس، دہلی | ۱۹۹۳ء |
| ۵۳ | غلام محی الدین انصاری | ہندو پاک کی خواتین ناول نگار | شاہد پبلی کیشنز، دہلی | ۲۰۰۸ء |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ۵۴ | قرۃالعین حیدر | آخری شب کے ہمسفر | ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ | ۱۹۹۸ء |
| ۵۵ | قرۃالعین حیدر | آگ کا دریا | اردو کتاب گھر، دہلی | ۱۹۸۴ء |
| ۵۶ | قرۃالعین حیدر | چاندنی بیگم | ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی | ۱۹۹۹ء |
| ۵۷ | قرۃالعین حیدر | سفینۂ غم | نسیم بک ڈپو، لکھنو | ۱۹۵۵ء |
| ۵۸ | قرۃالعین حیدر | گردش رنگ چمن | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی | ۱۹۸۸ء |
| ۵۹ | قرۃالعین حیدر | کارجہاں دراز ہے | | |
| ۶۰ | قرۃالعین حیدر | ہوائے چمن میں ــــ۔ (کلیات نذر سجاد حیدر) | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی | ۲۰۰۴ء |
| ۶۱ | قرۃالعین حیدر | میرے بھی صنم خانے | ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی | ۲۰۰۴ء |
| ۶۲ | کرشن چندر | شکست | رجت بک ہاوس، دہلی | ۲۰۰۶ء |
| ۶۳ | کرشن چندر | ایک عورت ہزار دیوانے | | |
| ۶۴ | کے۔کے کھلّر | اردو ناول کا نگارخانہ | سیمانت پرکاشن، دہلی | ۱۹۸۳ء |
| ۶۵ | کشمیری لا ذاکر | اب مجھے سونے دو | ایجوکیشن پبلشنگ ہاوس، دہلی | ۲۰۰۵ء |
| ۶۶ | کشمیری لال ذاکر | سمندر اب خاموش ہے | ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی | ۲۰۰۵ء |
| ۶۷ | کنور محمد اشرف | ہندوستانی معاشرہ عہد وسطی میں | نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی | ۱۹۷۴ء |
| ۶۸ | نصیر الدین ہاشمی | دکن میں اردو | قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی | ۱۹۸۵ء |
| ۶۹ | محمد شہزاد سمش | عورت اور سماج | تخلیق کار پبلشرز، دہلی | ۲۰۰۶ء |
| ۷۰ | محمد حامد خاں | اردو کے اٹھارہ ناول | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی | ۲۰۰۸ء |
| ۷۱ | مرزا ھادی رسوا | امراؤ جان ادا | رام نارائن لال بنی، الہ آباد | ۱۹۷۸ء |
| ۷۲ | محمد شاہد غفر | فضائل اعمال | مدینہ بک ڈپو، دہلی | ۱۹۷۵ء |
| ۷۳ | واجدہ تبسم | نتھ کا زخم | مشع بک ڈپو، دہلی | ۱۹۸۶ء |
| ۷۴ | واجدہ تبسم | کیسے کاٹو رین اندھیری | مکتبہ شعروادب، لاہور | |
| ۷۵ | واجدہ تبسم | نتھ کی عزت | شمع بک ڈپو، دہلی | ۱۹۸۳ء |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ۷۶ | واجدہ تبسم | پھول کھلنے دو | اورسیز بک سنٹر، ممبئی | ۱۹۷۷ء |
| ۷۷ | وقار عظیم | داستان سے افسانے تک | ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ | ۱۹۸۰ء |
| ۷۸ | ہاشم قدوائی | یورپ کے عظیم سیاسی مفکرین | ترقی اردو بورڈ، دہلی | ۱۹۷۷ء |

# رسائل

| اشاعت کا ماہ اور سال | رسائل کا نام | سلسلہ نشان |
| --- | --- | --- |
| اگست ۲۰۱۱ء | ماہنامہ آج کل | ۱ |
| ستمبر ۱۹۹۷ء | ماہنامہ زندگی | ۲ |
| نومبر ۲۰۰۶ء | ہفتہ روزہ راشٹریہ سہارا (قومی یکجہتی نمبر) | ۳ |
| ۴/ستمبر ۲۰۱۰ء | عالمی سہارا (ہفتہ روزہ) | ۴ |
| اپریل/۲۰۱۱ء | ھدی (حقوق العباد نمبر) | ۵ |
| اگست/۲۰۱۱ء | ھدی (عظیم والدین نمبر) | ۶ |
| ۱۹ /ڈسمبر ۲۰۱۱ء | نئی دنیا (ہفتہ روزہ) ہندوستان میں اسلامی تاریخ کے ایک ہزار سال | ۷ |
| اپریل/۲۰۱۲ء | ماہنامہ محدث (بنارس) | ۸ |

# اخبارات

| | | |
| --- | --- | --- |
| حیدرآباد | اعتماد | ۱ |
| حیدرآباد | رہنمائے دکن | ۲ |
| حیدرآباد | سیاست | ۳ |

# لغات

| | | سلسلہ نشان |
| --- | --- | --- |
| اعتقاد پبلشنگ ہاوس، دہلی، ۲۰۰۶ء | جامع فیروز اللغات (فیروز الدین مرتبہ) | ۱ |
| فیروز اللغات بدخسانی، ایم ار پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۰ء | فارسی اردو | ۲ |
| قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۱۹۹۸ء | فرہنگ آصفیہ (مولوی سید احمد دہلوی) | ۳ |

۴ Essential English Dictionary

Collins publishers the

University of Birmingham

London

۵ علمی اردو لغت ، وارث سرہندی لاہور ۱۹۸۳ء

۶ نوروالغات (جلد چہارم) تالیف مولوی نورالحسن نیر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۱۹۹۸ء


☆☆☆